محمد نفیس خاں ندوی

کلیسا

(یورپ کی مذہبی و اخلاقی تاریخ)



عکس
AKSPUBLICATIONS

CamScanner

کلیسا

(یورپ کی مذہبی واخلاقی تاریخ)

مصنف

محمد نفیس خاں ندوی

عکس

AKSPUBLICATIONS

CamScanner

فہرست

حرف آغاز 13

عیسائیت کے مصادر

عہد قدیم (Old Testament) 17

تاریخی حیثیت 18

اپوکریفا 21

عہد جدید (New Testament) 22

اناجیل اربعہ پر اتفاق 23

نوٹ 24

اناجیل اربعہ پر ایک نظر 24

انجیل متی (Matthew) 25

انجیل مرقس (Mark) 26

انجیل لوقا (Luke) 27

انجیل یوحنا (John) 28

حاصل کلام 30

رسولوں کے اعمال 30

ملاحظات 32

صحیفۂ آسمانی کی شرائط 33

قرآن مجید-عیسائیت کا مصدر اصلی 34

CamScanner

عیسائیت کا پس منظر

بنی اسرائیل کا ماضی 37

بت پرستانہ مزاج 38

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت 39

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد 42

عہد قضاۃ 42

عہد عروج 43

عہد زوال 43

مکابی حکومت کا قیام 46

بنی اسرائیل کا آزمائشی دور 48

مذہبی زوال 49

مسیح موعود 50

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد 51

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتی زندگی 51

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مخالفت 53

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مصلوبیت اور دوبارہ زندگی 55

وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ 55

رسولوں کا عہد 60

عیسائیت کی تدوین واشاعت

عیسائیت کی تعریف 63

حضرت عیسیٰ کی عیسائیت 64

حضرت عیسیٰ کے مخاطب 64

حضرت عیسیٰ کے بعد 65

CamScanner

سینٹ پال کی عیسائیت 66
ملاحظہ 67
پولس بحیثیت رسول 68
پولس کی مخالفت 70
پولس کے عقائد ونظریات 72
نوٹ 73
الوہیت مسیح 73
عقیدۂ کفارہ 74
عمل سے خلاصی 75
بپتسمہ 76
عشائے ربانی 76
صلیب کی تقدیس 78
عقیدۂ حلول وتجسم 79
عقیدۂ تثلیث 80
باپ 81
بیٹا 81
روح القدس 81
عقیدۂ تثلیث کا پس منظر 82
ختنہ کی منسوخی 83
پولس کی کامیابی 84
حامی ومخالف فرقے 86
حاصل بحث 87

CamScanner

کلیسا کیا ہے؟ 89
کلیسائے یروشلم 91
کلیسائے روم 91
بقا کی جدوجہد 92
ملاحظہ 94
شہنشاہ قسطنطین کی مسیحیت 95
کلیسا کا استحکام 97
شریعت ساز کونسلیں 97
نیقیہ کی کونسل 98
کلیسا کا اقبال 100
کلیسا کے عہدے و مناصب 102
پوپ/پاپائے اعظم: 103
پوپ کا انتخاب 102
مشہور پاپائے اعظم 104
بدنام پاپائے اعظم 104
کارڈنیل بشپ 105
آرچ بشپ 105
بشپ 105
پادری 105
چھوٹا پادری 106
کلیسا کا اصلاحی کردار 106
کلیسا کا اخلاقی انحطاط 107

CamScanner

کلیسا کی حکمرانی

رومی جمہوریہ (Roman Republic) 109

کارتھیج 110

روم کی توسیع 111

رومی سلطنت (Roman Empire) 112

مشرق و مغرب کی تقسیم 112

قسطنطین اعظم 113

سلطنت روم کی تقسیم 114

مغربی سلطنت روم 115

مشرقی سلطنت روم 118

کلیسا کا تاریک دور 122

ریاستِ کلیسا کا قیام 123

مقدس رومی سلطنت کا قیام (Holy Roman Empire) 127

نوٹ 129

کلیسا کی بادشاہت 129

مسیحیت کا دورِ ظلمات

قرونِ مظلمہ 131

توجہ طلب 132

عہدِ وسطیٰ۔قرونِ مظلمہ 133

مغربی معاشرہ (Western Society) 135

مغربی معاشرہ کا شجرۂ نسب 135

مسیحیت۔تلوار کے زور پر 137

مسیحیت میں بت پرستی کی آمیزش 139

CamScanner

کلیسا کی مذہبی اجارہ داری 143
اعتراف گناہ 143
معافی نامے 144
کلیسا کا نفاق عظیم (Great Schism) 147
علیحدگی کے اسباب 147
نظریاتی اختلاف 148
سیاسی اختلاف 149
کلیسائیت و شہنشاہیت کی کشمکش 150
کلیسا کا سیاسی نظریہ 150
کلیسا کا سیاسی غلبہ 152
کشمکش کا آغاز 153
کلیسا کا دعوائے شہنشاہیت 155

کلیسا کی اخلاقی صورتحال

پاپائیت کا آغاز 159
جعل سازی 160
اعلان رفعت 161
دھوکہ بازی 161
رشوت ستانی 162
عیش پسندی 163
دنیا طلبی 164
معافی نامے اور تبرکات 167
نوٹ 168
کنبہ پروری 169

CamScanner

اینٹی پوپ (Anti-Pope) 171
ظلم و شقاوت 171
حاصل کلام 174

عورت۔کلیسا کی نظر میں

عورت کی حیثیت 178
جنسی بے راہ روی 181
داشتاؤں کا رواج 184
قحبہ خانے 188

رہبانیت اور مسیحی معاشرہ

رہبانیت کیا ہے؟ 193
رہبانیت کا سلسلہ 194
خانماں خرابی 195
ایذائے جسم و جاں 199
رہبانیت کا تاریک پہلو 202

کلیسا اور اسلام

اسلام میں جنگ کا تصور 205
اسلامی فتوحات 206
فتوحات کا سلسلہ 206
سلطنت عثمانیہ کا قیام 207
اسلامی فتوحات کے دور رس اثرات 208
کلیسا کی اسلام دشمنی 210
کلیسائی پروپیگنڈہ 212
زوال اندلس 214

CamScanner

تحریک شہیداں 214
نوٹ 216
صلیبی جنگیں (Crusades) 217
جنگ کے اغراض ومقاصد 219
راہب پیٹر کا پروپیگنڈہ 220
سقوط بیت المقدس 221
صلیبی افواج کی حیوانیت 222
عمادالدین زنگیؒ 224
نورالدین زنگیؒ 225
بیت المقدس کی بازیابی 225
قسطنطنیہ کی پامالی 228
سینٹ لوئس کی وصیت 229
استشراق اور مستشرقین 230
استشراق 231
استشراق کی ابتدا 232
کلیسا کی سرپرستی 234
کونسل آف ویانا 235
اسباب ومحرکات 237
مذہبی محرکات 237
استعماری محرکات 237
علمی محرکات 238
اقتصادی محرکات 238
کلیسا کا نظریۂ دریافت 239
سقوط غرناطہ 241

CamScanner

تعذیبِ مسلم 242
جلاوطنی کا شاہی فرمان 243

کلیسا کے سنگین مظالم

محکمۂ احتساب (Inquisition) 245
تشدد کے طریقے 251
یہودیوں پر مظالم 254
غلاموں کی مظلومیت 259
کلیسا کی علم دشمنی 263
توہمات کی دنیا 264
مظلوم دانشور 268
کوپرنیکس (Copernicus) 269
برونو (Bruno) 270
گلیلیو (Galileo) 272
کتب خانوں کی تباہی 274
کتب خانہ اسکندریہ 277
ردِ عمل 281

یورپ کی نشاۃ ثانیہ

یورپ پر اسلام کے اثرات 283
تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) 285
جان وکلف 286
پاپائی نفاق کا خاتمہ 287
مارٹن لوتھر 288
پروٹسٹ فرقہ کا آغاز 290

CamScanner

معکوس تحریک اصلاح 292
مذہبی جنگ 292
کلیسائے انگلستان کا قیام 293
تحریک اصلاح کے نتائج 294
تحریک اصلاح کے نقائص 295
تحریک اصلاح کے منفی اثرات 296
عقلیت کا دور (Age of Rationalism) 297
عقلیت پسندی کا ردعمل 299
دین وسیاست کی تفریق 300
نظریہ قومیت 300
یورپ کا مادی دور 303
حرف آخر 307
کتابیات 309

CamScanner

حرف آغاز

کسی بھی قوم یا ملک کی تعمیری محنت اور اس کی جانفشانی کا ثمرہ اس کی تہذیب ہے، ہر قوم کو اپنی تہذیب سے اس کی خامیوں کے باجود فطری وابستگی ہوتی ہے، اور جب تک اس کی تہذیب اسے تسکین عطا کرتی ہے اور اس کے مقابل کوئی ایسی انصاف پسند تہذیب نہیں ہوتی جو اس کی خامیوں کو دور کرتے ہوئے اس کے فطری تقاضوں کی تکمیل کر سکے اس وقت تک وہ دوسری تہذیبوں سے بے نیاز رہتی ہے، اور اپنی تہذیب کی حفاظت اپنی قومی میراث و تاریخی سرمایہ کے طور پر کرتی ہے، چنانچہ جب کوئی بیرونی تہذیب اس پر دباؤ ڈالنے یا مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ قوم اپنی تہذیب کی مدافعت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے، یہ مدافعت عام طور پر جنگی شکل اختیار کر لیتی ہے، اور جب جنگی مدافعت کی قوت اور وسائل حرب کی قلت ہو جاتی ہے تو غالب تہذیب کے خلاف سرد جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

آج عالمگیر سطح پر اسلام کے خلاف جو سرد و گرم جنگ جاری ہے اور جس طرح سے اسلامی چہرہ کو مسخ کر کے اسے خوف و دہشت کا مذہب بتایا جا رہا ہے وہ درحقیقت حق و باطل یا صحیح و غلط کی جنگ نہیں ہے، بلکہ اس عالمی کشاکش اور ٹکراؤ کی بنیاد اسلامی و مغربی تہذیب کا تصادم اور غلبہ کی جنگ ہے؛ یورپ کو اپنی تاریخ کے طویل اندھیارے بعد جب ترقی کی روشنی نصیب ہوئی تو اس کا براہ راست مقابلہ اسلامی تہذیب سے ہوا، دنیا کے ہر شعبہ میں اسلامی تہذیب جلوہ فگن تھی، لوگوں کے اخلاق، ان کی خانگی زندگی، ان کی معاشرت و تعلقات باہمی غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تہذیب کے اثرات صاف اور نمایاں تھے، یہ وہ تہذیب تھی جس کی ساخت و پرداخت وحی آسمانی کی رہنمائی میں ہوئی تھی، اور جس کی بنیاد اور جس کا جوہر صرف ''روحانیت'' تھی۔

دوسری جانب مغربی تہذیب تھی جس کی بنیاد ''مادیت'' پر تھی، اور جس نے اپنے دور عروج میں ایسے معاشرہ کی تشکیل کی تھی جو اس جسم کی طرح تھا جس میں غیر طبعی فربہی نمایاں تھی جو ظاہری نگاہ میں پرشکوہ و شاندار تھا لیکن حقیقت میں بیسیوں امراض و تکالیف میں مبتلا، اس کا قلب ضعیف اور دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور اس کا اندرون پوری طرح سے پاش پاش تھا۔

مغربی تہذیب کئی صدیوں کی تاریکی سے بیدار ہوئی تھی، اگرچہ اپنی بیداری کا سرمہ اس نے اسلامی تہذیب سے ہی حاصل کیا تھا لیکن اس کے مادیت پرست مزاج نے احسان شناسی کے بجائے اس میں اکڑ پیدا کردی اور وہ خم ٹھوک کر اسلامی تہذیب کے مدمقابل آ کھڑی ہوئی، اور پھر ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا، سازشیں رچی گئیں، بغاوتیں برپا کی گئیں، جنگیں لڑی گئیں، اور مسلمانوں کے آلات حرب و جنگ کو انھیں کے خلاف استعمال کیا گیا جس کا لازمی نتیجہ فتح و شکست کی صورت میں سامنے آیا، نظریاتی طور پر اسلامی تہذیب ہمیشہ غالب رہی لیکن عملی میدان میں اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا اور مسلمانوں کا قومی عروج انفرادی عزیمت و شخصی جدوجہد میں محدود ہوکر رہ گیا۔

اہل اسلام و اہل مغرب کے عروج و زوال کا تجزیہ بتلاتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کی تہذیب میں اسلامیت اثر انداز تھی حکومتیں ان کے قدموں میں سرنگوں تھیں اور اہل مغرب نے جب اپنی نام نہاد مسیحیت کا طوق گلے سے اتار پھینکا وہ تخت و تاج کے مالک بن گئے۔

مغرب نے اپنے غلبہ کے بعد سب سے پہلے اس کے استحکام کی فکر کی، اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اس کا حریف یعنی اسلام نہ صرف کمزور و پست ہو جائے بلکہ وہ اپنی حقیقت ہی فراموش کر کے دنیا کی دیگر اقوام و مذاہب کی طرح اوراق پارینہ بن جائے جیسے قدیم یورپ میں پولس کی مسیحیت کے غلبہ کے بعد ہوا تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے اہل مغرب نے دو طریقے اختیار کیے؛ اول تو اپنی تاریخ کی سیاہی مسلمانوں کے چہروں پر ملنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کا رشتہ ان کے سنہرے ماضی سے کٹ جائے اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے خلاف نظریاتی جنگ کو جاری رکھا، جس کے نتیجہ میں مسلم قوم نہ صرف احساس کمتری کا شکار ہوئی، بلکہ عالمی سطح پر اس کی شبیہ داغدار ہوئی اور اسلام کا تعارف ایک ایسے دہشت پسند مذہب کے طور پر ہونے لگا جس کی تبلیغ و اشاعت تلوار کے زور پر ہوئی تھی، لیکن مغرب کی ساری کوششوں و سازشوں کے باوجود مسلمانوں کا وجود من حیث القوم زندہ رہا، اور وقفہ وقفہ سے عالم انسانیت کے افق پر اسلام کی حقیقی تصویر نمایاں ہوتی رہی۔

مسلم دانشوروں نے مغربی پروپیگنڈہ کا زبردست مقابلہ کیا اور اسلامی تعلیمات و اسلامی تاریخ کے حوالہ سے تشکیک و تجہیل کے حملوں کو نہ صرف ناکام کیا بلکہ مغرب کو اس کے ماضی کا آئینہ بھی دکھلایا، اس سلسلہ میں عالم اسلام کے علاوہ برصغیر ہند و پاک کے علماء و مفکرین نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیے، شخصیات اور اداروں کی فہرست طویل ہے نیز اصحاب علم و دانش ان تفصیلات سے بخوبی واقف ہیں۔

گزشتہ چند دہائی سے مغرب کی اسلام دشمنی میں نہ صرف شدت پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کا دائرہ کار بھی وسیع

ہو گیا ہے، نائن الیون کے ڈرامہ کے بعد پوری دنیا میں اسلام مخالفت کی فضا بنائی گئی اور انتہا پسندی، دہشت گردی، قدامت پرستی جیسے مختلف عناوین کے ذریعہ اسلامی کو بدنام کرنے کی سعی پیہم کی گئی۔ مغرب کے ان پروپیگنڈوں نے مسلم ذہنوں کو بھی اس قدر مسحور کر دیا کہ وہ اسلام کے تئیں احساس کمتری اور کسی حد تک اسلام کی صداقت کو لے کر شک وشبہ میں مبتلا ہو گئے حتی کہ بعض حلقوں سے اسلام کی تجدید (Modernize) کی آوازیں بھی اٹھنے لگی ہیں، حالانکہ اسلام اپنی عالمگیر صداقت، عصر حاضر کی قیادت اور نوع بشر کی دائمی فلاح و بہبود کی خاصیت کے ساتھ آج بھی تازہ دم ہے اور اس کی لافانی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ میں مشعل راہ ہے لیکن تہذیب مغرب کی چمک دمک اور اس کی طمع سازیوں نے نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر رکھا ہے کہ بہت سے مسلم اذہان اسلام کی لافانی صداقتوں کو بھی مغرب کے تشکیکی عینک سے دیکھنے لگے ہیں۔

موجودہ صورتحال اس بات کی متقاضی ہے کہ نہ صرف اسلام کی حقانیت اور اس کی عالمگیریت کو دوبارہ پیش کیا جائے بلکہ کو مغربی افکار ونظریات کا نئے سرے سے مطالعہ بھی کیا جائے، اس کی انسانیت دشمن تاریخ کو طشت ازبام کیا جائے، اور اس کی ظاہری چمک دمک کے پیچھے اس کے خونیں چہرہ کو بے نقاب کیا جائے تا کہ انسانیت کو اس ہلاکت وتباہی سے روکا جا سکے جس پر وہ تیزی سے گامزن ہے اور مغربی ترقی کے نام پر مادہ اور مادیت کے کی جن بیڑیوں میں وہ جکڑی ہوئی ہے اس سے نجات دلائی جا سکے۔

مغربی طوفان کا مقابلہ اس وقت کی اہم دینی وملی خدمت ہے، خاص کر ہند و پاک میں بہت سے علمی وتحقیقی اداروں اور مسلم دانشوروں نے اسے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن پاکستان میں ''عکس پبلیکیشن'' اس طور پر ممتاز و نمایاں ہے کہ اس نے تاجرانہ نفع ونقصان کی پروا کیے بغیر اسے اپنا اشاعتی مشن بنایا ہے، اس ادارہ نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں شائع کیں ہیں لیکن مغربی افکار ونظریات کا علمی وتحقیقی محاسبہ اس کی ترجیحات میں اولیت کا حامل ہے، راقم سطور کے لیے یہ باعث مسرت ہے کہ اس کا علمی رشتہ ''عکس پبلیکیشن'' کے ساتھ اس طور پر قائم ہو رہا ہے کہ اس نے راقم کی یہ حقیر کاوش (کلیسا-یورپ کی مذہبی واخلاقی تاریخ) کو اپنے اشاعتی مشن کا حصہ بنایا۔

یورپ کی مادیت پرست تہذیب، کلیسا کی مذہبی اجارہ داری، انسانوں کی غلامی، علم دشمنی اور حضرت عیسیٰ کی نیابت کے حوالہ سے جاہ ومنصب کی جنگ اور اسلام دشمنی کے بنیادی عناصر کو موضوع بنا کر یہ کتاب تیار کی گئی ہے، جس میں خود مغربی مفکرین واہل قلم کے حوالوں کے اہتمام کی کوشش کی گئی ہے تا کہ موضوع کا پورا حق ادا ہو سکے۔ امید ہے کہ یہ علمی وتحقیقی کاوش بہترین طباعت کے ساتھ علماء ودانشوروں کے ہاتھوں تک پہنچے گی، اور مغرب کی حقیقت کو سمجھنے میں یہ ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

کتاب کی قبولیت ومقبولیت اور اس کا افادہ سب اللہ رب العزت کے ہی ہاتھ میں ہے، ہم سب اسی کے محتاج ہیں، دعا ہے کہ اللہ رب العزت اخلاص کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے اور اس سعادت وکار خیر کے اجر میں راقم کے والدین، اہل خانہ، جملہ اساتذہ کرام، تمام معاونین کو بھی شریک فرمائے، اور خاص کر استاذ محترم مربی و مشفق مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کے حق میں صدقۂ جاریہ فرمائے جن کی مسلسل فکر وتوجہ نے راقم کو اس سعادت سے ہمکنار کیا۔ آمین!

محمد نفیس خاں ندوی

دار عرفات

تکیہ کلاں، رائے بریلی، یوپی (انڈیا)

CamScanner

عیسائیت کے مصادر

(توریت، اناجیل، رسولوں کے اعمال)

عیسائیت اپنی تاریخ اور اپنے مذہبی احکام کے سلسلہ میں دو بنیادی مصادر پر اعتماد کرتی ہے: ''عہد قدیم'' اور ''عہد جدید'' اور ان دونوں عہدوں کے مجموعہ کو ''بائبل''(۱) کہتے ہیں اور بائبل کو ''کتاب مقدس'' اور ''کلام مقدس'' بھی کہا جاتا ہے۔

(۱) عہد قدیم: وہ کتابیں جن کی نسبت عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ ان پیغمبروں کے واسطہ سے ان تک پہنچی ہیں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے گذر چکے ہیں۔ ان کتابوں کے مجموعہ کو ''عہد قدیم'' (عہد عتیق) یعنی '' Old Testament'' کہتے ہیں۔

عہد قدیم میں سینتالیس (47) کتابیں شامل ہیں، یہ کتابیں دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک قسم وہ ہے جس کی صحت پر تمام عیسائیوں کا اتفاق ہے، اور یہ کل انتالیس (39) کتابیں ہیں، اور باقی آٹھ (8) کتابیں وہ ہیں جن کی صحت میں اختلاف ہے۔

(۲) عہد جدید: وہ کتابیں جن کی نسبت عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئیں اور ان کے بعد الہام کے ذریعہ لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ رسولوں سے منسوب دیگر کتابیں بھی اس میں شامل ہیں، اس مجموعہ کو ''عہد جدید'' یعنی ''New Testament'' کہتے ہیں۔

عہد جدید میں کل ستائیس (27) کتابیں شامل ہیں، عیسائیوں کے نزدیک ان جملہ کتابوں میں سے بیس (20) کتابوں کی صحت پر اتفاق ہے اور باقی سات (7) کتابیں مختلف فیہ ہیں۔(۲)

عہد قدیم (Old Testament)

''عہد قدیم'' میں شامل کتابوں کی تعداد ہمیشہ یکساں نہیں رہی ہے، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے، مروجہ عہد قدیم میں شامل کتابوں کی تعداد انتالیس (39) ہے جنھیں عام طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

---

(۱) بائبل یونانی لفظ بیبلیا (biblia = کتابیں) سے مشتق ہے۔ (۲) بائبل سے قرآن تک/۳۰۵

۱- توریت یا توارہ (Torah) جس کو "قانون" بھی کہتے ہیں، ان میں پانچ ابتدائی کتابیں (اسفار) شامل ہیں، جن کی نسبت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف ہے، اور اس کا موضوع تخلیق دنیا سے لے کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تک کے حالات ہیں (۱)

۲- صحف انبیاء یا نبیم (Nebibim) اس کو دو درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے درجہ میں انبیائے سابقین ہیں یعنی یوشع، قضاۃ، سموئل اور سلاطین کی کتب، دوسرے درجہ میں انبیائے متاخرین ہیں یعنی یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل، و دیگر انبیاء کی کتب۔

۳- نوشتہ یا کتبیم (Kethubim) اس میں باقی کتب شامل ہیں جن میں زبور داؤد، امثال سلیمان و ایوب اور نوحہ یرمیاہ وغیرہ شامل ہیں۔

تاریخی حیثیت

موجودہ ترتیب کے ساتھ "عہد قدیم" کو مرتب کرنے کا زمانہ خود یہود بھی آج تک متفقہ طور پر طے نہیں کر سکے، جس کا بنیادی سبب وہ ہولناک حوادث ہیں جو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے بعد پے در پے واقع ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد یہودیوں کی دو الگ اور متحارب حکومتیں قائم ہوئیں: ایک عبد سلیمانی کی حکومت جس کا پایہ تخت "یروشلم" تھا اور "ریاست یہودیہ" کہلاتی تھی اور دوسری نئی حکومت "اسرائیل" جس کا مرکز "سامرہ" (Samaria) تھا، اور "سامری حکومت" کہلاتی تھی۔

"After death of Solomon, the ten northern tribes, resenting their subjugation to Davidic Kings in Jerusalem, unilaterally seceded from the united monarchy, thus forcing the creation of two rival kingdoms: the kingdom of Israel, in the north, and the kingdom of Juda, in the south."(2)

(حضرت سلیمان کی وفات کے بعد دس شمالی قبیلے یروشلم میں داؤدی بادشاہت سے ناراض ہو گئے، اور ایک گروہ نے متحدہ ریاست سے علیحدگی اختیار کر لی، اس طرح دو متحارب حکومتیں وجود میں آ گئیں: شمال میں اسرائیلی ریاست اور جنوب میں یہودی ریاست)

722 ق م میں اسیرین (Assyrian) نے حکومت اسرائیل پر حملہ کر کے اسے تاراج کر دیا اور اسرائیلی قبائل کو قید کر کے اپنے ساتھ نینوا (Nineveh) لے گئے، ان میں سے کچھ مرکب گئے اور کچھ دوسری قوموں کا حصہ بن

---

(۱) توریت کو "کتب موسیٰ" (Mosaic Books) اور خمیس موسیٰ (Pentateuch) بھی کہتے ہیں، اور اب توریت کا لفظ مجازاً عہد قدیم کی ساری کتابوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

(2) The Bible Unearthed By Israel Finkelstein, P.9

کر ہمیشہ کے لیے تاریخ عالم کی گمنام وادیوں میں کھو گئے حتی کہ اب ان کا سراغ ملنا بھی مشکل ہے۔

586ق م میں تاجدار بابل بخت نصر (Nebuchadnezzar II) نے یہودا حکومت پر چڑھائی کر کے اسے تہس نہس کر دیا، ان کی مرکزی عبادت گاہ یعنی مقدس ہیکل کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا، جس میں ان کی یکسر مقدس کتابیں بھی راکھ ہو گئیں، اور جو یہودی زندہ بچے انھیں غلام بنا کر بابل لے گیا، تقریباً پچاس سال کی اسیری کے بعد شاہ ایران سائرس (Cyrus) نے انھیں رہائی دلائی جس کے بعد کچھ یہودی دوسرے ملکوں خصوصاً بابل اور مصر میں پھیل گئے اور کچھ واپس فلسطین میں آ بسے، تباہی و اسیری کی اس پوری مدت میں یہودیوں کی ساری مقدس کتابیں ضائع ہو گئیں۔

یہودی روایت کے مطابق فلسطین میں آباد ہونے کے تقریباً سو سال بعد یہودی عالم و ربی عزرا (458 ق م) نے عبرانی زبان میں توریت کو از سر نو جمع کیا اور واقعات کو تاریخی حیثیت سے قلم بند کیا اور پھر 444ق م میں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ (۱)

یہودی علماء کا دعویٰ ہے کہ عزرا (حضرت عزیرؑ) نے توریت کی ترتیب و تدوین کا کام کیا ہے، لیکن کچھ یہودی محققین اس "تاریخی واقعہ" کو ایک "بے بنیاد افسانہ" (Pure legend) سے بھی تعبیر کرتے ہیں (۲)

بالفرض عزرا سے منسوب نسخہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ نسخہ بھی ضائع ہو چکا، کیونکہ کچھ ہی عرصہ بعد سکندر یونانی کے جانشینوں میں سے ایک ظالم حکمراں انطیوکس (Anitochus) نے یروشلم پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد یہودی عبادت گاہ کو زمیں بوس کر دیا، مقدس صحیفوں کو جلا کر نابود کر دیا، توریت کی تلاوت یا اپنے پاس رکھنے کی سزا موت مقرر کی، اور یہودی شعائر پر مکمل پابندی عائد کر دی۔

رفتہ رفتہ انطیوکس کی حکومت کمزور ہوئی اور یہودیوں کو سر اٹھانے کا موقع ملا، اور بغاوت کی دبی ہوئی چنگاری نے شعلۂ جوالہ بن کر انطیوکس حکومت کو راکھ کر دیا، اور یہودیوں نے "مکابی حکومت" (Maccabean Empire) کا آغاز کیا۔

مکابی حکومت قائم ہونے کے بعد یہودیوں کو اپنی مقدس کتابوں کے جمع کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور انھوں نے توریت کو پھر سے مرتب کرنے کا کام کیا، اس دوران انھوں نے صحف انبیاء کا بھی اضافہ کر دیا جو آگے چل کر "عہد قدیم" کا حصہ بن گئیں۔

مکابی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس کی چولیں ہل گئیں، جس کا فائدہ رومن فاتح پومپی (Pompey the Great) نے اٹھایا اور 63 ق م میں فلسطین پر حملہ کر کے اسے رومی حکومت

---

(۱) دیکھئے: سلاطین ۲۴:۱۰-۱۷، تواریخ ۲۶:۱۳-۲۰، یرمیاہ ۳۹:۹-۱، قاموس الکتاب: ۶۴۳

(2) American People's Encyclopedia, Vol.3, P.420.

میں شامل کرلیا، یہودی ایک بار پھر تباہ و برباد ہوئے اوران کی مذہبی حیثیت بالکل ختم ہوکر رہ گئی اور پوری قوم رومی حکومت کے زیر نگیں آ گئی۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش کے تقریباً ستر سال بعد یہودیوں نے رومی حکومت کے خلاف بغاوت کی جس میں رومی جرنل ٹائٹس (Titus) نے یہودیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ہیکل کو برباد کردیا، یروشلم کو کھنڈروں میں تبدیل کردیا، لاکھوں یہودی قتل ہوئے، گلیاں اور بازار مقتولین اور تباہ شدہ املاک سے بھر گئے، یہودی افراد ملک بدر کردیے گئے اور یروشلم کے کھنڈرات میں بھی آنے کی اجازت موقوف کردی گئی، سال میں صرف ایک دن جس روز ٹائٹس نے بیت المقدس کو مسمار کیا تھا انھیں اجازت ملتی تھی کہ قدس کی اس سرزمین کو اپنے خون کے آنسوؤں سے تر کرسکیں۔

"The Temple was destroyed by a Roman army in the year 70 C.E. approximately halfway through a fierce seven-year struggle between Jewish rebels and the Empire."(1)

(یہودی بغاوت اور رومی حکومت کے درمیان تقریباً ستر سال کی کشمکش کے درمیانی عرصہ میں ۷۰ء کو رومی فوج کے ذریعہ ہیکل کو تباہ کردیا گیا)

135ء میں رومی شہنشاہ اعظم ہیڈرین (Hadrian) نے باقی ماندہ یہودیوں کی دوبارہ سرکوبی کے لیے فوجی کمانڈر جولیس سیورس (Julius Severus) کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی جس نے یہودیوں کا بالکل صفایا کردیا، جو جان بچا سکے وہ صحراؤں اور جنگلوں میں روپوش ہوگئے، یروشلم کو مسمار کرکے "ایلیاء" نامی ایک نیا شہر بسادیا گیا، اور ہیکل سلمانی کی جگہ پر رومی دیوتا "جوپیٹر" (Jupiter) کا معبد تعمیر کردیا گیا جو شہنشاہ قسطنطین (Constantine) کے عہد تک باقی رہا۔

مذکورہ بالا تباہی وا سیری کے واقعات کی روشنی میں کسی بھی صورت یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ توریت و دیگر صحف انبیاء (عہد قدیم) اپنی اصل حالت پر برقرار ہیں، خود یہودی محققین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

"There is no reliable record of the making of the O.T. canon."(2)

(پرانے عہد نامہ کے مستند نسخوں کی تدوین کا کوئی قابل اعتماد ریکارڈ موجود نہیں ہے)

مذکورہ عمومی تباہی کے علاوہ عہد قدیم کی ترتیب وتدوین کی زبانیں بھی بدلتی رہیں، اور ترجمہ در ترجمہ کے علاوہ یہودی علماء کی تحریفات نے ان کتابوں پر سے اعتبار بالکل ختم کردیا، یہی وجہ ہے کہ آج ان کتابوں کے متعدد

---

(1)Cambridge History of Judaism By Finkelstein, V.4, P.194

(2)American People's Encyclopedia, Vol.3, P.420.

CamScanner

ایڈیشن رائج ہیں اور ان میں باہمی تضادات کی کثرت ہے، مثال کے طور پر کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ ابراہیم نے اس مقام کا نام جہاں اس نے اپنے بیٹے اسحٰق کی قربانی کرنا چاہی تھی ''یہواہ یری'' رکھا، لیکن کتاب خروج میں خدا کہتا ہے کہ میں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کو خدا کے طور پر دکھائی دیا لیکن میں اپنے نام ''یہواہ'' سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔ (۱) اسی طرح کتاب پیدائش میں ابراہیم و سارہ کا واقعہ جس طرح مذکور ہے اسی طرح کا واقعہ اسی کتاب میں حضرت اسحٰق اور ان کی بیوی کی جانب بھی منسوب ہے۔ (۲) کتاب پیدائش کے باب اول میں ہے کہ پہلے جانور پیدا ہوئے پھر انسان جبکہ اسی کے دوسرے باب میں ہے کہ پہلے انسان پیدا ہوئے پھر جانور۔

الغرض کہ ایسے بکثرت اختلافات موجود ہیں جن کی بنا پر خود بعض مغربی محققین نے ان کتابوں کی اصلیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ایوکریفا

مذکورہ حوادث کے سبب اگرچہ حقیقی توریت اور صحف انبیاء ضائع ہو گئے لیکن ان کی تعلیمات کا سلسلہ روایت بالمعنی کے طور پر جاری رہا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں یہودی کسی مکان پر جمع ہوتے اور ان کے علماء غم والم کے ساتھ یاد رفتگاں کا تذکرہ کرتے، توریت کی آیات سے مجلس وعظ کو گرم کر کے شکستہ دلوں کو تسلی دیتے، یہ رسم بابل سے واپس آکر بیت المقدس کے دوبارہ تعمیر ہونے کے بعد بھی جاری رہی، اور جا بجا (جہاں کم سے کم دس یہودی ہوں) ایسے مکانات تعمیر کیے گئے جہاں اس قسم کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، انہیں مکانات کو ''کنیسہ'' کہتے تھے۔ ہر کنیسہ میں توریت کے ترجموں کی نقلیں بنا کر صندوقوں میں رکھی جاتی تھیں۔ (۳)

شاہ انطاکیہ انتونیس کے زمانہ میں جب توریت پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تو یہودی علماء نے توریت کی جگہ ''صحف انبیاء'' کو اختیار کر لیا اور پھر کنیسہ میں انہیں کی تلاوت و تعلیم ہونے لگی، اس دوران جہاں ایک طرف یہودی اپنی آزادی کے لیے جد وجہد کر رہے تھے وہیں دوسری طرف وہ باہمی کشاکش، گروہ بندی اور مجادلہ و مناظرہ میں بھی مشغول تھے۔ یہودیوں میں ''صدوقی'' اور ''فریسی'' نامی دو بڑے گروہ پیدا ہو چکے تھے، انھوں نے اپنے مطلب کی خاطر کتابیں تصنیف کیں اور ان کو انبیائے سابقین کی جانب منسوب کر دیا، کنیسہ کی خاص مجلسوں میں انہیں کی تلاوت و تعلیم ہونے لگی۔ ایک اندازہ کے مطابق تصنیف کا یہ سلسلہ دو سو قبل مسیح سے سو برس بعد مسیح تک زور شور سے جاری رہا، یہ کتابیں زیادہ تر مستقبل کے حالات اور مسیح موعود کی پیشین گوئیوں سے بھری رہتیں، ہر فریق

---

(۱) پیدائش ۲۲:۱۴، خروج ۶:۳ (۲) پیدائش: ۲۶،۲۰ (۳) قاموس الکتاب: ۶۲۵

اپنے مطلب کے مطابق عبارتیں گڑھ لیتا اور ان کتابوں میں شامل کر دیتا، جلد ہی یہ کتابیں مشہور ہو گئیں، مگر اس کے ساتھ ہی ان کے آپسی اختلافات بھی سخت ہوتے گئے، ہر فرقہ اپنی کتاب کو معتبر اور دوسرے کی کتاب کو جعلی قرار دیا، انہیں جعلی کتابوں کو اصطلاح میں ''اپوکریفا'' (Apocrypha) کہتے ہیں:

"Apocrypha: Books not admitted into the canon of scripture, being either spurious, or at least not acknowledged as divine."(1)

(اپوکریفا سے مراد وہ کتابیں ہیں جو مذہبی صحیفوں میں شامل نہیں کی گئیں، یا تو جعلی ہونے کی وجہ سے یا کم از کم آسمانی تسلیم نہ کیے جانے کی وجہ سے)

اس طرح آپسی انتشار اور رد وقبول کی نفسانیت نے عیسائیت کی حقیقت پر دبیز پردے ڈال دیے۔ پہلے یہودی اور پھر عیسائی دونوں اس کا شکار ہوئے، اور اب جو کچھ ہے وہ وہم اور ضد کے سوا کچھ نہیں!(۱)

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾ (البقرۃ:۷۹)

''بس ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنے ہاتھوں کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ معمولی دام حاصل کر لیں، پس ان کے لیے تباہی ہے اس سے بھی جو انھوں نے اپنے ہاتھوں لکھ لیا اور ان کے لیے خرابی ہے اس سے بھی جو وہ کماتے ہیں۔''

عہد جدید (New Testament)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد کئی دہائیوں تک عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دوبارہ آسمان سے جلد تشریف آوری کے منتظر رہے، اس لیے اس مدت میں نہ عیسائیت پر تصنیف وتالیف کا کوئی رواج تھا اور نہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کی زمینی زندگی کو ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس کی، لیکن جب حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی سے مایوسی بڑھتی گئی، اور ان کی یادیں مدھم پڑنا شروع ہو گئیں تو انھوں نے اپنے طور پر فرمودات عیسیٰ کے کچھ نمونے تیار کیے جنھیں ''اقوال'' یا ''کلام'' کہا جاتا ہے، اور پھر بعد کو انہی زبانی روایات اور مجموعات کلام کو سامنے رکھ کر انجیل نگاروں نے اپنے اپنے مذاق ومقصد کے مطابق انجیلیں مرتب کیں، جن میں عام ناقدین کے نزدیک مرقس کی انجیل اولین تھی۔

دوسری صدی میں عیسائیت کی یہودیت کے ساتھ مذہبی کشمکش اور پھر دیگر اقوام سے تہذیبی وثقافتی تصادم

---

(1) Buck's Theological Dictionary *(Apocrypha)*

(۱) تفصیل دیکھیں: تاریخ صحف سماوی از سید نواب علی، ایم اے، صفحہ ۱۳-۴

جاری رہا، جس کے نتیجہ میں مختلف فرقوں نے جنم لیا، ان فرقوں نے اپنی حقانیت اور حضرت عیسیٰ سے اپنی نسبت کو ثابت کرنے کے مقصد سے انجیلیں (۱) مرتب کرنی شروع کیں، جس کا سلسلہ چلتا رہا، اس طرح انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے رکارڈ کے مطابق کل چونتیس (34) انجیلیں مرتب ہوئیں۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور آپ کے حواریوں کی مادری زبان ''ارامی'' تھی (۲) اس زبان میں صرف ایک انجیل مرتب ہوئی تھی جس کا نام ''انجیل یہود'' تھا، یہ انجیل ناصری اور ابانیوی فرقہ میں 150ء تک رائج تھی، ان فرقوں کی تباہی کے ساتھ یہ انجیل بھی گم ہوگئی۔ (۳) اس انجیل کے سوا باقی ساری انجیلیں یونانی زبان میں مرتب ہوئیں، اس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ وہ کلام الٰہی جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ان کی مادری زبان میں نازل ہوا تھا وہ اپنی اصل حالت پر باقی نہ رہ سکا، بلکہ آپ کی وفات کے تقریباً سو سال بعد روایت بالمعنی یا ترجمہ کے طور پر قلم بند کیا گیا، اور مختلف فرقوں نے اپنے اپنے طور پر یہ خدمات انجام دیں، اسی لیے ابتدائے وقت سے ہی اناجیل میں زبردست اختلاف رونما ہوا۔

اناجیل کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان خطوط کی بھی تھی جو حواریوں کی جانب منسوب کیے جاتے تھے، اور ہر فرقہ سند کے طور پر اپنے اپنے خطوط پیش کیا کرتا تھا، ان خطوط کی تعداد ایک سو تیرہ (113) تک شمار ہوئی تھی جن کے مضامین میں اناجیل ہی کی طرح باہم سخت اختلافات موجود ہیں۔

اناجیل اربعہ پر اتفاق

306ء میں شاہ قسطنطین (Constantine) روم کا بادشاہ مقرر ہوا، اس نے عیسائی مذہب قبول کرلیا جس سے عیسائیت کو استحکام ملا، شاہ نے عیسائی علماء کو بڑے بڑے اعزاز دے کر انھیں مذہبی تحقیقات کے لیے وقف کردیا، اور اسی وجہ سے اس کے عہد سلطنت میں بڑی بڑی کونسلیں منعقد ہوئیں جن میں عیسائی نظام عقائد کو باضابطہ مدون کیا گیا، اس سلسلہ میں نیقاوی کونسل بنیادی اہمیت کی حامل ہے جو 325ء میں نیقیہ (Nicea) کے مقام پر منعقد ہوئی تھی۔ نیقیہ کی کونسل نے صرف چار اناجیل (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) کو تسلیم کیا، باقی ساری انجیلوں کو اپوکریفا (Apocrypha) یعنی جعلی وغیر معتبر قرار دے دیا۔ (۴) اس کل منتخب مجموعہ کا نام ''عہد جدید'' رکھا گیا جسے پوپ گلاسیوس (Gelasius) (۴۹۲ء-۴۹۶ء) نے باضابطہ طور پر سند قبول عطا کی۔ (۵)

---

(۱) انجیل (Gosple) خوش خبری، یعنی مسیح کی آمد اور ان کے ذریعہ نجات کی خوشخبری۔
(۲) قاموس الکتاب: ۴۱ (۳) تاریخ صحف سماوی صفحہ: ۶۱
(۴) الموسوعة الميسرة في الاديان والمذاهب ..... د/مانع الجهني: ۵۶۹/۲
(۵) تاریخ صحف سماوی صفحہ: ۶۱، ۶۲

یقیہ کے بعد کونسلوں کا سلسلہ چلتا رہا جن کے ذریعہ عیسائیت کے احکام مرتب ہوتے رہے، انہیں کے ذریعہ حواریوں و دیگر کے خطوط کو بھی سند کا درجہ دے کر انھیں اناجیل اربعہ کے ساتھ شامل کر لیا گیا جن میں "رسولوں کے اعمال" کے نام سے حواریوں کے حالات اور مسیحی کلیسا کی ابتدائی تاریخ، مختلف کلیساؤں اور افراد کے نام پولس کے تیرہ خطوط، نیز یعقوب (Jacob) پطرس (Peter) یوحنا (John) اور یہوداہ (Jude) کے نام سے آٹھ خطوط اور "یوحنا عارف کا مکاشفہ" شامل ہیں، اور پھر یہ منتخب مجموعہ "عہد جدید" (New Testament) کے نام سے مقبول ہو گیا۔ (1)

نوٹ

اناجیل اربعہ میں ابتدا کی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) کو "اناجیل متوافقہ" (Synopic Gospels) کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ تینوں انجیلیں اپنے موضوعات و اسلوب بیان میں ہم آہنگ و یکساں ہیں:

"Three of the gospels -Matthew, Mark and Luke- are similar, whereas the other Gospel, John, is vastly different. Matthew, Mark and Luke follow basically the same order in their presentation of Jesus, they tell many of the same stories; they contain similar sayings of Jesus, at times word for word."(2)

جبکہ چوتھی انجیل (یوحنا) اپنے انداز بیان، نسق واقعات، اور مخصوص عقائد پر اصرار کی وجہ سے اتنی مختلف ہے کہ بعض محققین نے اسے اناجیل میں شمار کرنے سے انکار کر دیا اور یہاں تک کہا کہ اگر تین اناجیل درست ہیں تو چوتھی درست نہیں، اور اگر چوتھی درست ہے تو باقی تینوں مشکوک ہیں۔

اناجیل اربعہ پر ایک نظر

عیسائیوں نے مذہبی طور پر جن چار انجیلوں کو منتخب کیا اُس کی وجہ انتخاب ان کتابوں کی تاریخی حیثیت یا مسیحی تعلیمات کی نمائندگی نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنے مفادات کی تکمیل، اپنے اختیار کردہ نظریات کی تقویت اور عوام کو اپیل کرنے والے موضوعات کو سامنے رکھ کر ان کتابوں کا انتخاب کیا اور پھر انھیں ملہم (Inspired) قرار دے دیا۔ اسی لیے ہربرٹ ملر نے کہا ہے:

"The new testament was the product of the early churches, not their basis."(3)

---

(1) ماخوذ از: قاموس الکتاب/مسیحیت۔علمی و تاریخی حقائق کی روشنی میں/بائبل سے قرآن تک

(2) An Introduction to The Gospels By Mitchell Reddish, P.26

(3) Uses of the past, By Herbert Muller, P.149

(نیا عہد نامہ اولین مسیحی کلیسا وں کی بنیاد نہیں بلکہ ان کی پیداوار تھا)

ذیل میں ان چاروں انجیلوں کے احوال بیان کیے جاتے ہیں جن سے ان کا مقام و مرتبہ اور کلام خداوندی ہونے کے دعوے میں ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے:

انجیل متی (Matthew)

اس انجیل کی نسبت متی حواری کی جانب کی جاتی ہے جو حضرت عیسیٰ کے بارہ شاگردوں میں سے ایک تھے، تاہم محققین کو ان کے حواری ہونے میں شبہ ہے:

"We know very little about Matthew beyond the fact that he was one of the twelve."(1)

(ہمارے پاس متی کی اس حقیقت کے سلسلہ میں بہت ہی کم معلومات ہیں کہ وہ بارہ (حواریوں) میں سے ایک تھا)

حضرت مسیح سے ملاقات سے قبل متی رومی حکومت کی طرف سے فلسطین میں ٹیکس وصولتے تھے، یہودی اس پیشہ کو بری نظر سے دیکھتے تھے اور محصل کو ظالم یا کم از کم سخت مزاج گردانتے تھے، اس وقت ٹیکس وصولنے والوں کو ''عشارین'' کہا جاتا تھا اس مناسبت سے آپ کو ''متی عشاری'' بھی کہتے ہیں۔

مسیحی اہل قلم کا تقریباً متفقہ بیان ہے کہ انجیل متی کی زبان عبرانی یا سریانی تھی، بعد میں اس کا ترجمہ ہوا لیکن مترجم کا کوئی رکارڈ محفوظ نہیں، اسی طرح وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ اس انجیل کا سب سے پرانا نسخہ یونانی زبان میں تھا جو ضائع ہو گیا:

"Greek Matthaios is an approximate transliteration of the Aramic or Hebrew."(2)

(یونانی انجیل متی ایک اندازہ کے مطابق ارامی یا عبرانی کا ترجمہ ہے)

انجیل متی کی تدوین کی تاریخ میں عیسائیوں کے درمیان خاصا اختلاف ہے، اسی طرح یہ اختلاف اس کے مترجم کے سلسلہ میں بھی ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ متی کی انجیل سب سے قدیم ہے اور اس کو خود متی حواری نے لکھا ہے لیکن محققین نے اس کے کافی ثبوت دیے ہیں کہ یہ انجیل دراصل مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے جس کی تدوین متی سے قبل کی ہے:

---

(1)The International Standard Bible Encyclopedia by Geoffrey W. Bromiley V.4, P.280

(2)The International Standard Bible Encyclopedia, V.4, P.280

"Although most historical Jesus scholars agree that Mark is the earliest Synoptic Gospel."(1)

(تاہم حضرت عیسیٰ کے زیادہ تر محققین کا اعتراف ہے کہ ترتیب میں مرقس کی انجیل سب سے قدیم ہے)

چنانچہ بائبل کے مشہور لغت "قاموس الکتاب" میں ہے:

"جدت پسند علماء اس روایت کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں کہ اس انجیل کا مصنف متی رسول تھا کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے رسول نے ایک ایسے رسالہ (مرقس کی انجیل) کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے جس کا مصنف رسول نہیں تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ متی نے مرقس کی انجیل کو تقریباً تمام کی تمام اپنی انجیل میں شامل کیا ہے۔"(۲)

عیسائیوں کے نزدیک انجیل متی کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے جبکہ اس کے حالات کچھ اس طرح ہیں:

☆ اس کا ماخذ اصلی ایک ایسی انجیل ہے جس کا موہوم مصنف (مرقس) ہے جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں شامل بھی نہیں تھا، اور خود اس نے اپنی انجیل دوسروں کی فرمائش پر لکھی تھی، نہ کہ کسی دینی اور مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر۔

☆ اس کی اصلی زبان اور تاریخ تدوین کی عدم واقفیت پر تقریباً تمام مسیحیوں کا اتفاق ہے۔

☆ اصل نسخہ کی گم شدگی اور نابود ہونا بھی مسلم ہے۔

☆ اس کے مترجم کا نام اور اس کے حالات بھی مجہول ہیں۔

انجیل مرقس (Mark)

تاریخی روایات کے مطابق مرقس کی انجیل سب سے پہلے لکھی گئی تھی، عیسائیوں کا کہنا ہے کہ اس کے کاتب یوحنا ہیں جن کا لقب مرقس تھا، ان کا سلسلۂ نسب فلسطین کے ایک یہودی خاندان سے ملتا ہے، یہ شروع ہی سے حضرت عیسیٰ کے پیرو تھے، البتہ ان کا شمار حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں نہیں ہوتا، حضرت عیسیٰ کے بعد انھوں نے مختلف ملکوں کو اپنی دعوت وتبلیغ کا مرکز بنایا، بالآخر 62ء میں رومی بت پرستوں نے انھیں قتل کر دیا:

"مرقس حضرت عیسیٰ کے حواری پطرس کا شاگرد اور ان کا ترجمان تھا، مسیحی مؤرخین کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنی یہ انجیل روم والوں کے طلب پر لکھی تھی، جبکہ مرشد الطالبین میں ہے کہ مرقس نے یہ انجیل پطرس کی سرگرمیوں کے لیے لکھی تھی، لیکن ارینیوس کا کہنا ہے کہ مرقس نے اپنی انجیل پطرس کی وفات کے بعد لکھی، جبکہ ابن بطریق کا کہنا ہے کہ حواریوں کے سردار پطرس نے روم شہر میں مرقس کی روایت سے یہ انجیل لکھی اور پھر انہی سے منسوب کر دی جس پر یہ اشکال ہونا لازمی ہے کہ حواریوں کے سردار نے ایک غیر حواری سے کیونکر روایت کی؟ اور پھر اس کی نسبت مرقس کی طرف

---

(1) Encyclopaedia of the Historical Jesus, by Craig Evan, P.250

(۲) قاموس الکتاب: ۸۷۸

کیوں کر دی؟!"(۱)

قاموس الکتاب میں لکھا ہے:

"یہ انجیل اپنے مصنف کے بارے میں کچھ نہیں بتلاتی، روایت کے مطابق اس کا مصنف مرقس ہے جو کہ پطرس رسول کا ہم خدمت یا مترجم تھا،.....اس انجیل کے سن تحریر کے بارے میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے، سن تحریر کے خیالات 40 تا 75ء یعنی 35 سالوں پر محیط ہیں.....اکثر علماء قدیم شہادتوں کی پیروی کرتے ہوئے اس انجیل کا مقام تحریر اٹلی بیان کرتے ہیں.....دیگر تجویز کردہ مقامات میں اسکندریہ، قیصریہ اور شامی انطاکیہ شامل ہیں۔ غالباً یہ انجیل غیر قوموں اور خاص طور پر رومیوں کے لیے لکھی گئی تھی۔"(۲)

مسیحی تاریخ کے مذکورہ بیانات کی روشنی میں دو باتیں بطور خاص سامنے آتی ہیں جو غور طلب کہی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ انجیل مرقس کا لکھنے والا کون ہے؟ مرقس یا پطرس! دوسری بات یہ ہے کہ اس انجیل کی تدوین کب اور کہاں ہوئی؟ یہ سوالات اس لیے بھی اہم ہیں کہ کاتب کی شخصیت کی لاعلمی اور گمنامی اور سن تدوین کی عدم واقفیت کی وجہ سے کتاب کا استناد ختم ہو جاتا ہے، اور غیر جانبدارانہ علمی نظریہ میں وہ کتاب مقدس اور الہامی تو کیا عام مستند کتاب بھی نہیں رہ جاتی، اور علم و تحقیق کا کوئی طالب علم اسے اپنے لیے مفید نہیں سمجھتا۔

انجیل لوقا (Luke)

عیسائیوں کا کہنا ہے کہ انجیل ثالث کا مصنف لوقا ہے، جو یونانی زبان میں لکھی گئی ہے، لیکن لوقا کی شخصیت اتنے دھندلکے میں ہے کہ اس کا تعین دشوار ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ انطاکیہ کا رہنے والا یہودی تھا اور پیشہ سے طبیب تھا، جبکہ ڈاکٹر پوسٹ کا خیال ہے کہ وہ انطاکیہ کا نہیں بلکہ رومانیہ کا رہنے والا تھا اور اس کا نشو و نما اٹلی میں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ لوقا طبیب نہیں مصور تھا۔ (۳)

لوقا کا سینٹ پال (St. Paul) سے گہرا تعلق تھا، سفر و حضر کی سرگرمیوں میں وہ اسی کے ساتھ رہتا تھا، خود پولس کے خطوط میں اس کی طرف اشارے ملتے ہیں، اسی بنیاد پر یہ بھی کہا جاتا ہے حقیقت میں یہ لوقا کی نہیں بلکہ خود سینٹ پال کی تصنیف ہے۔ اس کا تذکرہ "قاموس الکتاب" میں اس طرح ہے:

"لوقا اور پولس رسول کے تعلقات اس قدر قریبی تھے کہ ابتدائی مسیحی مصنفین میں سے چند ایک نے غلطی سے لوقا کی انجیل کو پولس کی انجیل بیان کیا مثلاً طرطلیان اور بالخصوص ایرینیئس نے۔"(۴)

انجیل لوقا سے متعلق ریشنلسٹ انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ ہیں:

---

(۱) مسیحیت۔ علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں: ۵۰-۵۲ باختصار (۲) قاموس الکتاب: ۸۹۹

(۳) مسیحیت۔ علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں: ۵۳ (۴) قاموس الکتاب: ۸۶۶

"On the poorest grounds the majority of Biblical writers claim that this was written by Greek physician named Luke, who accompanied Paul on his journies."(1)

(نہایت ہی کمزور بنیادوں پر انجیل کے اکثر قلم کار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ (انجیل لوقا) ایک یونانی فلسفی کی تصنیف ہے جو سینٹ پال کے سفروں میں اس کا مصاحب ہوتا تھا)

لوقا کی انجیل کا سن تدوین بھی علمائے تاریخ کے لیے ایک معرکۃ الآراء موضوع ہے، چونکہ یہ جن لوگوں کے لیے لکھی گئی تھی ان کا تعین نہ ہو سکا اس لیے اس کے سن تدوین میں اختلافات موجود ہیں:

''ڈاکٹر پوسٹ کا خیال ہے کہ یہ انجیل یروشلم کی تباہی سے پہلے لکھی گئی ہے، اور وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس کا زمانہ تحریر 58-60ء ہے جب پولس گرفتار ہوا تھا۔ استاذ لارون کہتے ہیں کہ لوقا 'پطرس و پولس کے بعد لکھی گئی ہے۔ مسٹر ہورن کہتا ہے کہ تیسری انجیل 53ء یا 63 یا 64ء میں لکھی گئی ہے۔ لیکن وہ حسب عادت ان سنین کی کوئی وجہ ترجیح اور دلیل نہیں بیان کرتا۔''(۲)

مذکور باتوں کے بعد یہ سوال پھر اٹھتا ہے کہ تیسری انجیل کا مصنف کون ہے، پولس یا لوقا؟ پھر لوقا کون تھا؟ اسے رومانیہ کا مانا جائے یا انطاکیہ کا؟ اسے طبیب مانا جائے یا مصور؟ اور پھر اس انجیل کی تدوین کب ہوئی ہے؟ ان سوالوں پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور ایک محقق کے لیے ان سوالات کے جوابات جاننا ضروری ہے۔

عیسائی محققین کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ متی اور لوقا کی انجیلیں اپنے مواد اور مندرجات میں انجیل مرقس کی ہی تقلید ہیں:

"The gospels of Matthew and Luke tend to follow Mark's gospel material closely."(3)

انجیل یوحنا (John)

یہ انجیل باقی تین انجیلوں سے اپنے مضامین اور اپنی طرز ادا کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہے، صرف اسی انجیل میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا عقیدہ پیش کیا گیا ہے، نیز اس میں فلسفۂ الٰہیات کی وہ آمیزش ہے جو اسکندریہ کے یہود میں پیدا ہو گئی تھی:

''ایک وقت تھا جب یوحنا کی انجیل کو یونانی کتاب سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اس میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو یونانی مائل یہودیت، اسراری مذہب اور یہاں تک کہ یونانی فلسفہ سے مماثلت رکھتی ہیں۔''(۴)

---

(1) A Rationalist Encyclopaedia by Joseph McCabe, P.366

(۲) مسیحیت۔ علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں: ۵۵

(3) The Lamad New Testament By Andrew R.Hardy,P.11

(۴) قاموس الکتاب: ۱۱۶۶

اسی لیے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ اس انجیل کا مصنف اسکندریہ مدرسہ کا کوئی طالب علم تھا جو حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا تھا جسے پولس نے پیش کیا تھا۔

''کیتھولک ہیرلڈ (مطبوعہ 1844ء) میں یوں لکھا ہے: ''اسٹالن نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ بلا شک وشبہ پوری انجیل یوحنا اسکندریہ کے مدرسہ کی ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔''(۱)

اس انجیل کی نسبت اگرچہ یوحنا حواری کی طرف کی جاتی ہے لیکن اس دعوی کے ثبوت میں کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ روایت یہ بھی ہے کہ یوحنا حواری کو 60ء و 70ء کے مابین شہید کر دیا گیا تھا، اور اس انجیل کا مصنف ایک دوسرا یوحنا ہے جو ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا۔

مسیحی آبائے قدیم میں سے ایک اہم شخص پولی کارپ (Polycarp) تھا جسے یوحنا حواری کا شاگرد بتایا جاتا ہے اس نے بھی یوحنا کے اس انجیل کا ذکر نہیں کیا۔ (۲)

جدید محققین نے بھی اسے یوحنا کی تصنیف ماننے سے انکار کر دیا ہے:

"Liberal critics from the 19th century onward have denied the Johannie authorship."(3)

(انیسویں صدی اور اس کے بعد کے آزاد و غیر جانبدار نقادوں نے اس کے یوحنا کی تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے)

''محقق برطشینڈر کہتا ہے: ''یہ ساری انجیل، اسی طرح یوحنا کے تمام رسائل اس کی تصنیف قطعی نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے ان کو دوسری صدی عیسوی میں لکھا ہے۔''(۴)

بعض عیسائی مؤرخین کسی یوحنا بزرگ (John the Elder) کو اس کا مصنف بتاتے ہیں جسے بعض عیسائی حضرت عیسیٰ کا شاگرد اور بعض حضرت عیسیٰ کے شاگرد کا شاگرد بتاتے ہیں، لیکن اس کی بھی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

جس طرح اس چوتھی انجیل کے مصنف کے سلسلہ میں مسیحی مؤرخ کا کوئی اتفاق نہیں اسی طرح اس کے تصنیفی سن کے سلسلہ میں بھی کوئی اتفاق نہیں ہے، اور یہ مصنف کے مجہول ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔

''ڈاکٹر پوسٹ کا خیال ہے کہ وہ 95ء، 96ء، 98ء کے دوران لکھی گئی ہے۔

مسٹر ہورن کا کہنا ہے کہ وہ 68ء، 69یا70ء یا89ء یا98ء میں لکھی گئی ہے۔

---

(۱) بائبل سے قرآن تک: ۳۶۱

(2) Catholic Encyclopaedia vol.7, P.1085

(3) Collier's Encyclopaedia, Vol.11, P.25

(۴) بائبل سے قرآن تک: ۳۶۱

جرجس زوین کا کہنا ہے کہ وہ 96ء میں لکھی گئی ہے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ یروشلم کی تباہی سے پہلے 65ء میں معرض وجود میں آئی، اور بعض لوگوں کا قیاس ہے یوحنا نے اپنی جلاوطنی سے واپسی پر اسے 98ء میں لکھا تھا۔"(۱)

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ باقی انجیلوں کی طرح یہ انجیل بھی اپنے مصنف کے سلسلہ میں خاموش ہے، اور تاریخ کے متلاشی کے سامنے یہ سوالات بدستور قائم ہیں کہ اس چوتھی انجیل کا مصنف یوحنا کون ہے اور اس نے یہ انجیل کب لکھی اور کس مقصد سے لکھی؟ اور یوحنا کی یہ انجیل پہلی تین انجیلوں سے مختلف کیوں ہے؟

حاصل کلام

عیسائیت کے عقائد ونظریات کا مدار اور ماخذ اناجیل اربعہ ہیں اس لیے ان اناجیل سے متعلق چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

۱- یہ انجیلیں وہ آسمانی انجیل نہیں ہے جس کا نزول حضرت عیسیٰ پر ہوا تھا نیز یہ حضرت عیسیٰ کی املا کردہ بھی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے انھیں دیکھا بھی نہیں۔

۲- ان انجیلوں کے لکھنے والے مجہول وغیر معروف ہیں، اور ان کی تصنیفی نسبت بھی مبہم ہے، کسی کے حالات نایاب ہیں تو کسی کی خدمات، اس لیے ان کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔

۳- ان انجیلوں کی تصنیف مختلف سیاسی وغیر سیاسی حالات کے تحت ہوئی ہے، اور ان کے مصنفین کے حالات بھی لاعلمی کی نذر ہو چکے ہیں، اس لیے ان اناجیل کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔

۴- اصل انجیلوں کی گمشدگی پر خود عیسائیوں کا اتفاق ہے، اسی لیے ان کے تراجم غیر مصدقہ اور ناقابل اعتبار ٹھہرتے ہیں۔

۵- ان اناجیل میں نقل وروایات اور تواتر وتسلسل کی کوئی ادنی صورت بھی نہیں پائی جاتی جس کی بنیاد پر انھیں آسمانی کتاب یا نبی کی تعلیمات قرار دیا جاسکے۔

رسولوں کے اعمال

مسیحیت میں اناجیل اربعہ کے بعد "رسولوں کے اعمال" کو سند کا درجہ حاصل ہے، دراصل یہ عیسائی دنیا کے مشہور اشخاص کے نام لکھے گئے وہ ہدایت نامے ہیں جن کا موضوع مسیحی مذہب کی تشکیل، رسوم وشعائر کی تعیین،

---

(۱) مسیحیت۔علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں: ۵۸

دینی آداب کی توضیح اور انجیل کی تفسیر ہے، اسی لیے انھیں "تعلیمی اسفار" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

ان ہدایت ناموں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (الف) رسولوں کے اعمال (ب) اکیس خطوط جو رسولوں اور ان کے ساتھیوں نے لکھے (ج) یوحنا کا مکاشفہ۔

ذیل میں تفصیلات ملاحظہ ہوں:

۱- رسولوں کے اعمال (Acts of Apostles): اس کا موضوع حضرت عیسیٰ کے بعد حواریین کی کارگذاریاں اور پولس کے تبلیغی اسفار کے احوال ہیں، اس کی نسبت انجیل ثالث کے مصنف لوقا کی طرف کی جاتی ہے، یہ اگرچہ حضرت عیسیٰ صعود آسمانی کے فوراً بعد کے واقعات پیش کرتی ہے لیکن اسے دوسری صدی کے بعد ہی لوقا کی تصنیف قرار دیا گیا اور اول اول مسیحی کلیسائیں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ اور یہ بھی مسلم ہے کہ لوقا خود ایک مجہول شخص کا نام ہے جیسا کہ "انجیل لوقا" کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

۲-۱۴: وہ خطوط جو پولس نے مختلف شہر کے لوگوں کے نام لکھے ہیں۔

پولس کے خطوط پر ماہر نقادوں کے اعتراضات اتنے وزنی ہیں کہ ان کا دفعیہ بہت مشکل ہے، خصوصاً اس کے آخری کے تین خطوط میں مستعمل الفاظ واصطلاحات دیگر خطوط سے بہت مختلف اور دوسری صدی میں مستعمل الفاظ واصطلاحات سے قریب ہیں، مثال کے طور پر پریسبیٹر (Presbyter) اور ڈیکن (Deacon) جیسے کلیسائی عہدے جو ان میں مذکور ہیں وہ پولس کے دور کے بعد میں وجود میں آئے۔ (۱)

پولس کے خطوط نویسی کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو:

"Paul wrote his letter in bad Greek, some- times hurriedly, often vehemently: in his haste he was apt to be casual or inprecise, in his passion, to be immoderate or obscure, and he never had a thought that he was writing a New Testament."(2)

(پولس نے اپنے خطوط ناقص یونانی زبان میں لکھے۔ وہ کبھی جلدی میں لکھتا اور اکثر تندی کو اپناتا۔ جلد بازی کی وجہ سے (اس کی تحریر) بے قاعدہ اور غیر واضح ہو جاتی ہے، اور جذبات کی وجہ سے غیر معتدل اور مبہم، اور یہ تو اسے بالکل خیال بھی نہ تھا کہ وہ نیا عہد نامہ تحریر کر رہا ہے)

اب رہی بات پولس کے خطوط کی تو انسائیکلوآف برٹانیکا کا کہنا ہے:

---

(1) A Critical Introduction to the New Testament, By R.H. Fuller, PP.133-134
(2) Uses of the past, P.89

"More than half on them are ascribed to paul, although critics have questioned this ascription in some cases."(1)

(ان (خطوط) میں سے آدھے سے زیادہ پولس سے منسوب کیے جاتے ہیں، اگرچہ نقادوں نے بعض صورتوں میں اس انتساب پر اعتراض کیا ہے)

دوسری جگہ اس اعتراض کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے:

"Actually, however, only ten, including Ephasians can be ascribed to him, and there are many scholars who question the authenticity of Ephesians."(2)

(فی الحقیقت دس (خطوط) بشمول افسیون (کے نام خط) کو اس (پولس) سے منسوب کیا جاسکتا ہے، تاہم بہت سے نقادوں نے افسیون کے مستند ہونے پر بھی اعتراض کیا ہے)

۱۵-۱۶: یعقوب کے خطوط۔ ۱۷-۱۸: پطرس کے خطوط

۱۹-۲۱: یوحنا کے خطوط۔ ۲۲: یہودا کا خط

۲۳: یوحنا عارف کا مکاشفہ (Revelation)

پولس کے خطوط کے علاوہ باقی خطوط اور یوحنا کے مکاشفہ کو ''موخر الاستناد'' (deuterocanonical) کہا جاتا ہے، کیونکہ انھیں مکمل استناد کا درجہ بہت بعد میں جا کر حاصل ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ:

"The Church (hesitated) over their attribution on the authors whose names they now bear."(3)

(کلیسا کے ان کے مصنفین -جن کے اوپر نام لکھے ہیں- سے ان کے انتساب پر تأمل اور شک تھا)

اور یہ شک عیسائیت کے ابتدائی زمانہ اور صدر اول سے ہی موجود تھا، مثلاً اوریجن (Origin) (م254ء) نے عبرانیوں کے نام خط کے بارے میں لکھا تھا:

"God only knows who wrote this book."(4)

(خدا ہی جانتا ہے کہ اسے کس نے لکھا ہے)

ملاحظات

ان رسائل کے سلسلہ میں چند اہم باتیں غور طلب ہیں، اور متلاشی حق کے لیے ان باتوں کا جاننا از بس ضروری ہے، اور جب معاملہ دین کی اساس کا ہو تو کسی بھی صورت ان پہلوؤں کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں:

---

(1) Encyclopedia of Britannica (1973) Vol.3, P.574
(2) Encyclopedia of Britannica (1973) Vol.3, P.476
(3) Life of Jesus By Dainel-Rops, P.29
(4) History of the Bible by Bratton, P.122

CamScanner

☆ ان رسالوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ ان کی مسلسل سند اور روایت موجود نہیں ہے۔

☆ حضرت عیسیٰ کے گیارہ حواریوں میں سے چند ہی کے رسالے موجود ہیں جس کا مطلب بقیہ نے رسالے نہیں لکھے جبکہ غیر حواریوں نے رسالے لکھے ہیں، تو ایسے لکھنے والوں کا کیا مقام تسلیم کیا جائے؟

☆ ان رسائل کے لکھنے والوں نے یہ "کلام مقدس" کہاں سے حاصل کیا؟ کیا انھیں الہام ہوا یا خود انھوں نے اپنے طور پر تحریر کیا ہے؟

اگر ہم یہ کہیں کہ یہ رسائل الہامی نہیں ہیں تو ان کی دینی اہمیت باقی ہی نہیں رہتی، ایسے میں انھیں بنیاد بنا کر مذہب کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ایسی صورت میں وہ خدائی مذہب کے بجائے انسانی مذہب ہو جائے گا، یا کم از کم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ خدائی کلام کے ناکافی ہونے کی وجہ سے انسانی کلام کو بھی اختیار کر لیا گیا جو یقیناً بہت بڑا نقص ہے۔

اگر ہم ان رسائل کو الہامی مان لیں تو پہلا اشکال یہ ہے کہ کن بنیادوں پر انھیں الہامی تسلیم کیا جائے جبکہ خود ان کے لکھنے والوں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

اور اگر یہ الہامی کلام ہیں تو ان کے اندر باہم تضادات کیوں ہیں؟ کیا خدائی کلام میں تضاد ممکن ہے؟

دوسرا اہم اشکال یہ کہ ان رسائل کے لکھنے والے حواری و غیر حواری دونوں ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ حواری و غیر حواری دونوں کو الہام ہوتا ہو؟ اور کیا حواری و غیر حواری دونوں کے الہام کا مقام و مرتبہ یکساں ہے؟ اور کیا کسی غیر حواری کے الہام کو دین کی بنیادوں میں شامل کیا جاسکتا ہے؟

مختصر یہ کہ عہد قدیم اور عہد جدید دونوں کی اکثر کتابیں گمنام اور ایک سے زائد مصنفین کی تصنیف ہیں، جن کا ملہم ہونا تو دور کی بات، ان میں سے اکثر مصنفین سے خود پوری طرح عیسائی بھی واقف نہیں ہیں، اور بہت سی کتابیں جن افراد کی جانب منسوب کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت ان کی تصنیف ہی نہیں ہیں۔

صحیفۂ آسمانی کی شرائط

بائبل کی کوئی بھی کتاب تاریخی کسوٹی پر کھری نہیں اترتی پھر بھی راسخ العقیدہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ کتاب مقدس کلام الٰہی (Word of God) ہے اور اسے ملہم (Inspired) مقدسین نے مرتب کیا ہے، چنانچہ پوپ لیوسزدہم (Leo XIII) نے اپنے ایک فرمان میں کہا:

"All the books and the whole of each book which the Church receives as sacred and canonical were written at the direction of the Holy Spirit."(1)

(1) A companion to the Bible, P.7

(وہ تمام کتابیں اوران میں سے ہر کتاب کا حصہ جنھیں کلیسا نے مقدس اور مستند قرار دے کر قبول کیا ہے، روح القدس کے لکھوانے سے لکھے گئے ہیں)

انیسویں صدی کا ایک معروف پروٹسٹنٹ مصنف لکھتا ہے:

"Every book of it, every chapter of it, every verse of it, every word of it, every letter of it, is the direct utterance of the Most High."(1)

(اس (بائبل) کی ہر کتاب، ہر باب، ہر آیت، ہر لفظ اور ہر حرف براہ راست خدائے برتر کا فرمودہ ہے)

بلاشبہ کسی قدیم تصنیف کو کسی قدیم مصنف کی جانب منسوب کرنا کچھ مشکل کام نہیں تاہم اس کے لیے بھی اندرونی و بیرونی شہادتوں کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن جب کسی کتاب کو ''وحی الٰہی'' یا ''کلام خداوندی'' قرار دینا ہو تو اس سے قبل ان امور کا فیصلہ کرنا ضروری ہے:

۱- کیا اس کتاب نے خود کے الہامی ہونے کا دعوی کیا ہے؟

۲- جو شخص اس الہامی کتاب کی تصنیف کا باعث بنا وہ کہاں تک قابل اعتماد تھا؟

۳- کیا کتاب کی تصنیف اور اس کے الہامی ہونے کا کوئی تاریخی رکارڈ موجود ہے؟

۴- کتاب کے وحی الٰہی اور مستند ہونے کا درجہ کس نے اور کن بنیادوں پر دیا؟

۵- کیا کتاب کے اولین نسخہ اور بعد کے نسخوں میں مطابقت ہے یا وہ آپسی اختلافات سے پر ہیں؟

۶- کیا کتاب کے موجودہ نسخے تحریف و تبدیلی سے پاک ہیں؟

۷- کیا اس کے مندرجات میں ایسی باتیں تو نہیں جو عقل و دانش اور انسانی اخلاق سے گری ہوئی ہوں، اور ایک سلیم الفطرت بے اختیار اسے ''کلام خداوندی'' ماننے سے انکار کر دے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کے اطمینان بخش جوابات نہ بائبل کے پاس ہیں اور نہ بائبل کے ماننے والوں کے پاس، پھر بھی اگر انھیں اس بات کا دعوی ہے کہ موجودہ بائبل ''کلام الٰہی'' اور ''منزل من اللہ'' ہے تو ایسے دعویٰ کو محض خوش عقیدگی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا!

قرآن مجید-عیسائیت کا مصدر اصلی

حضرت عیسیٰ کی لائی ہوئی مسیحیت اور اس کی تحقیق اور ان کے دعوتی مشن اور ان کی زندگی کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کا واحد ماخذ صرف قرآن مجید ہی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید ہی وہ مستند واحد علمی و تاریخی ذریعہ ہے جو حضرت آدم سے لے کر آخری نبی حضرت محمد ﷺ تک کی آسمانی رسالتوں کی تصدیق و توضیح کرتا ہے، اس کے

(1) Inspiration And Interpretation, p.89 By J.W. Burgan

علاوہ آج دنیا میں کوئی ایسی آسمانی یا انسانی کتاب نہیں ہے جس کا علمی مقام اتنے عرصہ تک قائم رہا ہو اور اس کے حروف و رسم الخط اور اختلاف قرأت تک محفوظ ہوں۔

صرف قرآن مجید ہی دنیا کی واحد کتاب ہے جس کے اندر ''کلام خداوندی'' ہونے کی ساری شرطیں بدرجۂ اتم موجود ہیں، اور اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، وہ خود کہتا ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ (البقرۃ:۲)

(یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کا کوئی گذر نہیں)

وہ پوری دنیا کے انسانوں کو یکساں مخاطب کرتا ہے اور اپنے ''منزل من اللہ'' ہونے کا اعلان کرتا ہے:

﴿تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الواقعۃ:۸۰)

(رب العالمین کی طرف سے (اس کو) تھوڑا تھوڑا اتارا جا رہا ہے)

اور اس بات کی ضمانت بھی لیتا ہے کہ اس کے اندر غلط باتوں کی آمیزش کسی بھی صورت ممکن نہیں:

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۲)

(اس میں جھوٹ کا گزر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے، اس ذات کی طرف سے اتاری گئی ہے جو حکمت رکھنے والی قابل ستائش ہے)

اور اگر اس کے باوجود کسی کو اس کے ''صحیفۂ آسمانی'' ہونے میں کوئی شبہ ہے تو ایسے لوگوں کو خود قرآن چیلنج کرتا ہے کہ اگر تمہاری بات میں سچائی ہے تو اس کے جیسی ایک سورت ہی بنا کر دکھاؤ:

﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (البقرۃ:۲۳)

(اور اگر تم اس کے بارے میں ذرا بھی شبہ میں ہو جس کو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک سورہ ہی بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو)

قرآن مجید کی حقانیت کی تصدیق عہد قدیم کی وہ کتابیں کرتی ہیں جن کے گواہ خود بنی اسرائیل کے علماء ہیں:

﴿وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ أَوَلَمْ يَكُن لَّهُمْ آيَةً أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (الشعراء:۱۹۶-۱۹۷)

(یہ کتاب تو اگلوں کے صحیفوں میں موجود ہے، کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کتاب کو بنی اسرائیل کے علماء خوب جانتے ہیں)

ایک طرف مسیحی علماء بائبل کے الہامی ہونے میں سخت معترض ہیں تو دوسری طرف مسیحی حلقہ میں قرآن مجید کی علمی حیثیت مسلم ہے اور ان کا پڑھا لکھا طبقہ قرآن کی تاریخیت اور استناد کا احترام کرتے ہوئے اس کے تسلسل و تواتر کا بھی معترف ہے۔ چنانچہ فرانسیسی مستشرق استاذ ''دیموبین'' (Gauderfroy Demombynes) کے

یہ الفاظ ہیں:

''منصف مزاج آدمی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ موجودہ قرآن، وہی قرآن ہے جسے محمد (ﷺ) تلاوت کرتے تھے۔''(۱)

اسی لیے ان تمام حقائق اور قرآنی خصوصیات کے پیش نظر عیسائیت کا ماخذ اصلی کے لیے قرآن مجید کو ہی مستند سمجھنا ہوگا، اور یہی ایک علمی و تحقیقی اور عادلانہ طریقہ ہے، کیونکہ قرآن کے سوا ہمارے پاس ایسا کوئی ماخذ نہیں جو حقیقت شناس علماء اور جویانِ حق کو تسلی دے سکے، اور جو مضبوط و ٹھوس علمی بنیادوں پر قائم ہو:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾

(اور آخر اللہ سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو سکتی ہے؟!)

---

(۱) مسیحیت۔علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں ۲۶

عیسائیت کا پس منظر

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نہ صرف ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے بلکہ ان کی دعوت وتبلیغ کا حقیقی مخاطب بھی یہی خاندان تھا، اور پھر انہیں یہودیوں نے ان کی زبردست مخالفت بھی کی اور اپنی دانست میں انھیں تختۂ دار تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک یہودیت اور عیسائیت برسرپیکار رہی ہے۔ اس لیے عیسائیت کو سمجھنے کے لیے یہودی تاریخ اور یہودی روایات کے پس منظر کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے:

بنی اسرائیل کا ماضی

حضرت یعقوب (علیہ السلام) کا لقب اسرائیل تھا، اسرائیل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہے "اللہ کا بندہ"(۱) ان کی دو بیوی اور دو باندی سے بارہ صاحبزادے تھے، انہیں کی نسل کو "بنی اسرائیل" کہا جاتا ہے، ان میں ایک بھائی کا نام "یہوداہ" تھا، ان کی نسبت سے بنی اسرائیل کو "یہودی" بھی کہتے ہیں۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) اپنی اولاد کے ساتھ کنعان (فلسطین) میں آباد تھے، حضرت یوسف (علیہ السلام) ان کے سب سے چہیتے بیٹے تھے، وہ اپنے بھائیوں کے حسد کا شکار ہوئے، چنانچہ انھیں قتل کرنے کی سازش رچی گئی، لیکن یہودا کے کہنے پر انھیں ایک تاریک کنویں میں ڈال دیا گیا، خدا کی مرضی، ایک قافلہ پانی کی تلاش میں کنویں تک پہنچا

---

(۱) اسرئیل دو لفظوں (یسرا + ایل) سے مرکب ہے۔ اس کے معنی میں خاصا اختلاف ہے، خود یہود و نصاریٰ کے نزدیک بھی کوئی معنی متعین نہیں ہے، اس لیے اس کے الگ الگ مفہوم مراد لیے گئے ہیں۔ یسرا کے معنی ہیں غلبہ اور ایل کے معنی ہے خدا، چنانچہ یسرائیل (اسرائیل) کا لفظی معنی ہوا "خدا کا غلبہ"، اور عربی زبان میں مغلوبیت کی اعلیٰ درجہ کی کیفیت کو "عبد" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ غلبہ کا لازمی مفہوم عبد مراد لیا گیا ہو، اور اس طرح اسرائیل کا معنی ہوگا "عبداللہ" یعنی خدا کا بندہ۔ بائبل میں لکھا ہے: ۱۹۰۹ ق م کے قریب یعقوب کی فلسطین میں واپسی پر خدا اُس کے ساتھ کشتی لڑ کر اُسے اُس سطح پر لے آیا جہاں وہ مکمل تابع فرمانی کے لیے تیار تھا، یوں جب یعقوب نے خدا کا مقصد پورا کرنے کے لیے اپنی زندگی اس کے سپرد کر دی تو اسے فتح حاصل ہوئی اور خدا نے اس کا نام بدل کر "اسرائیل" رکھا جس کا مطلب ہے: "اس نے خدا کے ساتھ زور آزمائی کی (اور غالب رہا)" (دیکھئے: قاموس الکتاب: ۴۸-۴۹)

"ISRAEL: A wrestler with God." (A Concise Dictionary of the Holy Bible)

یہ مفہوم اور یہ سیاق یقیناً خدائے ذوالجلال کی عظمت وکبریائی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے عظیم مقام ومنصب کے خلاف ایک عظیم گستاخی اور سنگین جرم ہے۔

اور یوسف کو دیکھ کر اپنے ساتھ مصر لیتا گیا، مصر کے بازار میں یوسف کی بولی لگائی گئی اور عزیز مصر نے انھیں خرید لیا۔ جب حضرت یوسف (علیہ السلام) جوان ہوئے تو عزیز مصر کی بیوی ان پر فریفتہ ہوگئی اور انھیں رام کرنے کی کوشش کی، لیکن حضرت یوسف نے صاف انکار کر دیا جس کی پاداش میں وہ جیل بھیج دیے گئے، جیل میں آپ دعوت توحید کے ساتھ خوابوں کی تعبیریں بتلاتے، آپ کی تعبیر کے مطابق ایک قیدی رہا ہوکر بادشاہ کا مصاحب بنا، کچھ دنوں بعد بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر کسی سے نہ بن سکی، اتفاق کی بات کہ اس مصاحب کو حضرت یوسف کی یاد آئی، اور اس طرح آپ بادشاہ کے سامنے حاضر کیے گئے، آپؑ نے اپنا پورا معاملہ بیان کیا، اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر بھی عرض کی کہ پورے علاقہ میں زبردست قحط پڑنے والا ہے، آپؑ نے اس کا حل بھی بیان کیا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ مجھے اس کا ذمہ دار بنا دیا جائے کہ میں اس کا اہل بھی ہوں اور حالات کو پوری طرح قابو میں رکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہوں، عزیز مصر نے اس مشورہ کو قبول کیا اور اس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) مصر میں حاکم بنا دیے گئے۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانہ میں بنی اسرائیل قحط سے پریشان ہوکر کنعان سے مصر پہنچے اور پھر یہیں آباد ہوگئے، بنی اسرائیل جب مصر میں داخل ہوئے تو ان کا قافلہ ستر افراد پر مشتمل تھا، یہ ایک ایماندار قبیلہ تھا، حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں انھوں نے بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، خوب پھلے پھولے اور خوشحال رہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بت پرستانہ ماحول سے متاثر ہونے لگے، ان کے مزاج بدل گئے، خاندانی امتیاز، نبوی شان اور خدائی نعمتوں کی ناشکری فطرت میں داخل ہوگئی، اور مختلف اخلاقی وسماجی نیز مذہبی واعتقادی برائیوں میں وہ ملوث ہوتے چلے گئے۔

بت پرستانہ مزاج

بنی اسرائیل کا ایک عمومی مرض بت پرستی تھا، جس کی پاداش میں انھیں بارہا سنگین سزائیں دی گئیں اور انھیں سخت قسم کی رسوائی اٹھانی پڑی، فرعون کا تسلط اور پھر بعد میں دیگر حکمرانوں کا ظلم وجور سب اسی بت پرستی کے گھناونے نتائج تھے۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت سے قبل اور پھر فرعون سے نجات کے بعد بنی اسرائیل کی ایک بڑی تعداد جس بت پرستی میں مبتلا ہوئی تھی اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) **خاندانی دیوتاؤں کی پرستش:** بنی اسرائیل میں مورتیوں کی شکل میں ہر خاندان کا الگ الگ دیوتا ہوتا تھا، ان دیوتاؤں کی مورتیاں چھوٹی جسامت میں ہوتی تھیں جو "ترافیم" کہلاتی تھیں۔ ان مورتیوں سے فال بھی لیا جاتا تھا اور یہ عقیدہ بھی تھا کہ ان کے ذریعہ چشم بددور ہوتی ہے۔ (۱)

---

(۱) قاموس الکتاب: ۴۴۳

(۲) پتھروں کی پرستش: پتھروں سے بتوں کو تراشنا اور پھر ان کی پوجا کرنا عام بات تھی، بعض قربان گاہوں میں کوئی خاص پتھر کھڑا کر دیا جاتا، پھر اس پر تیل انڈیلا جاتا اور اس کے سامنے قربانی پیش کی جاتی اس جگہ کو وہ "بیت ایل" کا نام دیتے تھے۔ (۱)

(۳) قومی دیوتاؤں کی پرستش: ہر قوم کا اپنا مخصوص دیوتا ہوا کرتا تھا، جس کے وہ بت بناتے اور اس کی بندگی کرتے اور سنگین موقعوں پر اسی کی طرف رجوع بھی کرتے تھے۔ یہودی دوسری اقوام کے دیوتاؤں اور ان کی پوجا کے طریقوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بت پرستی کی اس غلاظت کو انھوں نے اپنے اندر سمو لیا۔ اس سلسلہ میں "بعل" و "مولک" کے نام سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

بعل کو کنعانی آندھی، بارش اور بادآوری کا دیوتا سمجھتے تھے، اس کی پوجا کے خاص طریقے رائج تھے جن میں زناکاری کو مذہبی حیثیت حاصل تھی، بعل کی پوجا کی رسومات نے یہودیوں پر گہرا اثر ڈالا اور انھوں نے "یہوداہ" کے لیے وہی تصورات اختیار کر لیے جو بعل کے ساتھ خاص تھے۔ (۲)

مولک غیر قوموں کا ایک دیوتا تھا، جس کی پرستش خاص طور پر عمونی کرتے تھے، اس کی بندگی میں وہ بے دردی سے بچوں کی قربانی دیتے تھے، بعض جگہ اس کے بت کو خوب گرم کیا جاتا اور بچوں کو ذبح کر کے اس کے بازوؤں پر رکھ دیا جاتا، اس دیوتا کی عقیدت میں بنی اسرائیل نے اس حد تک غلو برتا کہ اپنے بچوں کی قربانیاں بھی اسی نام پر دینے لگے، "حزقی ایل" نبی کے وقت کے یہودی مولک کی پرستش کے بعد ہی خدا کے گھر میں داخل ہوتے تھے۔ (۳)

ان کے علاوہ ستاروں اور اجرام فلکی کی پرستش، ستارہ شناسی، غیب بینی، ہیکل کے صحن میں آسمانی مخلوق کی پرستش کے لیے مذبحوں کا قیام وغیرہ کی جڑیں بھی مضبوط ہو چکی تھیں۔ 642 ق م میں جب "یوسیاہ" بادشاہ بنا تو اس نے ہر طرح کے بت و بت پرستی اور ہر طرح کے مذبحے کو ختم کیا۔ (۴)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت

جیسے جیسے وقت گذرتا گیا بنی اسرائیل کا رشتہ اپنے معبود سے کمزور ہوتا گیا، اور پھر قوم کی اکثریت شرک و بت پرستی کی غلاظت میں ڈوبتی چلی گئی، جس کی پاداش میں اللہ رب العزت نے فرعون جیسے ظالم و جابر حکمراں کو ان پر مسلط کر دیا جس نے انھیں غلام بنا لیا اور ان سے ایسی بے گار لینے لگا جو ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتیں، نتیجتاً ان کی زندگیاں جانوروں سے بھی بدتر ہو گئیں، اور وہ زندگی کی حقیقی لذتوں سے بھی محروم کر دیے گئے۔ فرعون کے ظلم و ستم

---

(۱) ایضاً: ۱۶۳ (۲) قاموس الکتاب: ۱۵۱ (۳) ایضاً: ۹۸۱ (۴) ایضاً: ۱۱۷۶

اور بنی اسرائیل کی لاچارگی کو دیکھتے ہوئے ایک ہادی برحق کی سخت ضرورت تھی جو بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلا کر خدائے واحد کی چوکھٹ پر جبین نیاز خم کرنے کا عملی درس دے، اور انھیں دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس کی وسعتوں سے ہمکنار کرے، اور جس کے ذریعہ وہ آخرت کی سعادت مندیوں سے روشناس ہو کر اپنے حقیقی پروردگار کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ چنانچہ مشیت ایزدی کے مطابق عالم اسباب میں حضرت موسیٰ کی بعثت کا سامان مہیا ہوا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بنی اسرائیل کو شرک و بت پرستی کی غلاظت سے پاک کیا، انھیں فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلائی، اور مصر سے باہر نکال لائے، پھر خدا کے انعامات کا سلسلہ جاری رہا، کھانے کے لیے من وسلوی نازل ہوتا، پینے کے لیے پہاڑ سے شفاف چشمے جاری ہوئے، اور نئے سرے سے آباد ہونے کے لیے فلسطین کی سرزمین کا وعدہ بھی کیا گیا۔ لیکن بنی اسرائیل کی سرشت میں عناد و نافرمانی، بے راہ روی اور بت پرستی کی آمیزش تھی، ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر وہ شرک کی غلاظت کی طرف لپکے اور پوری دیدہ دلیری سے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کر بیٹھے کہ ان کے لیے بھی کوئی بت تراش دیا جائے جس کے سامنے وہ اپنا ماتھا ٹیک سکیں اور اس کی بندگی کر سکیں۔ قرآن کریم اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكُفُونَ عَلَى أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيهِ وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ قَالَ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِيكُمْ إِلَٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (الاعراف: ۱۳۸-۱۳۹)

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار اتار دیا تو وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کو پوجنے میں مگن تھے، وہ بولے اے موسیٰ جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں ویسے ہی ہمارے لیے بھی بت بنا دیجیے، انھوں نے کہا تم بڑے جاہل لوگ ہو۔ ارے یہ تو جس میں لگے ہیں اس پر تو جھاڑو پھر جانے والی ہے اور جو کر رہے ہیں وہ سب خاک میں مل جانے والا ہے۔ فرمایا کہ کیا اللہ کو چھوڑ کر میں تمہارے لیے دوسرا خدا تلاش کروں جبکہ اسی نے تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی)

یقیناً بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ تعجب خیز ہونے کے ساتھ مضحکہ خیز بھی تھا، حضرت موسیٰ نے ان کو سخت ملامت کی، غصہ کا اظہار کیا، لیکن ان کے باغیانہ مزاج میں تبدیلی نہ آئی، اور جب حضرت موسیٰ رب کریم سے شرف ہم کلامی کے لیے کوہ سینا تشریف لے گئے تو سامری کے کہنے پر انھوں نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور اسے اپنا معبود تسلیم کر کے اس کی عبادت کرنے لگے۔ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے ان کو ہر چند منع کیا اور اس بت پرستی سے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ موسیٰ کے واپس آنے تک ہم اس سے مس نہ ہوں گے:

﴿وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِن قَبْلُ يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنتُم بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَٰنُ فَاتَّبِعُونِي

وَأَطِيعُوا أَمْرِي قَالُوا لَن نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّى يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَى﴾ (طٰہٰ: ۹۰-۹۱)

(اور پہلے ہارون ان سے کہہ چکے تھے کہ اے میری قوم تم تو اس کی وجہ سے فتنہ میں پڑ گئے اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے تو میرے پیچھے چلو اور میری بات مانو۔ وہ بولے ہم تو اس وقت تک اسی میں لگے رہیں گے جب تک موسیٰ ہمارے پاس لوٹ نہیں آتے)

اسی دوران اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو کوہ سینا بلا کر توریت عطا کی جس کے گواہ بنی اسرائیل کے چالیس افراد بھی تھے، اور پوری قوم سے شریعت کی پاسداری کا عہد بھی لیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) جب کوہ سینا سے واپس آئے اور اپنی قوم کو شرک کی غلاظت میں ڈوبا ہوا دیکھا تو سخت ناراض ہوئے، انھیں خوب ملامت کی، غصہ میں توریت کی الواح پرے رکھ دیں اور اپنے بھائی ہارون کی داڑھی پکڑ کر اور سر کے بال کھینچ کر کہنے لگے کہ تم نے انھیں شرک سے کیوں نہ روکا، انھیں گمراہ کیسے ہونے دیا؟ حضرت ہارون (علیہ السلام) نے کہا کہ بھائی جان! میں نے انھیں روکنے کی ہر چند کوشش کی لیکن انھوں نے میری بات بالکل نہ مانی، میں نے کوئی سختی اس خوف سے نہ کی کہ کہیں ان میں تفرقہ نہ پڑ جائے۔

جب حضرت موسیٰ کا غصہ کچھ ہلکا ہوا تو وہ سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے باز پرس کی، اور اسے قوم سے الگ ہو جانے کا حکم دیا، پھر اس بچھڑے کو جلا کر خاک کر ڈالا اور اس کی راکھ پانی میں بہا دی۔

مشرک یہودیوں کے سلسلہ میں خدائی فیصلہ نافذ ہوا، انھیں سخت سزا دی گئی، جو شرک کی غلاظت سے بچ گئے اور اس سنگین جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے انھوں نے بچھڑے کے پجاریوں اور اس کے شیدائیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا، تب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے ''ارض مقدس'' کا وعدہ کیا تھا تا کہ وہاں پر وہ آزادانہ زندگی گذار سکیں چنانچہ انھیں حکم ہوا کہ ارض مقدس کو کوچ کریں اور جو قوم وہاں آباد ہے اس سے جہاد کریں، فتح و کامرانی ان کے لیے مقدر کر دی گئی ہے، لیکن اس خدائی نعمت کو قبول کرنے اور خدا کے وعدہ پر یقین کرنے کے بجائے انھوں نے خوف و بزدلی کا مظاہرہ کیا اور حضرت موسیٰ سے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ جب تک وہ قوم وہاں آباد ہے ہم وہاں ہرگز قدم نہ رکھیں گے، اور رہی بات جہاد کی تو تم اور تمہارا رب جائے اور جا کر جہاد کرے، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔

﴿قَالُوا يَا مُوسَى إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ﴾ (المائدہ: ۲۴)

(وہ بولے اے موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہو سکتے بس تم اور تمہارا رب دونوں جائیں اور لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں)

اس نافرمانی اور عناد کی پاداش میں وہ پوری نسل ہی ''ارض موعود'' یعنی فلسطین کی سرزمین سے محروم کر دی

گئی، اور یہودی روایت نیز قرآن مجید کی صراحت کے مطابق چالیس سال تک صحرائے سینا میں خانہ بدوشی اور بیاباں نوردی ان کا مقدر بن گئی:

﴿قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ (المائدہ:۲۶)

(پس یہ (جگہ) ان پر حرام کردی گئی چالیس سال وہ زمین میں مارے مارے پھریں گے بس تم اس نافرمان قوم پر ترس مت کھانا۔)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت حضرت یوشع بن نون (علیہ السلام) کے حصہ میں آئی جن کو حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ بنی اسرائیل حضرت یوشع کی قیادت میں دریائے اردن عبور کرکے فلسطین میں داخل ہوئے اور مقامی لوگوں کو شکست دے کر وہاں کے اکثر علاقہ پر قابض ہوگئے، بائبل کے مطابق بنی اسرائیل نے اس موقع پر زبردست کشت وخون کیا، مزاحمت کرنے والے کسی بھی فرد کو زندہ نہیں چھوڑا، یہ کامیابی بنی اسرائیل کے حق میں خدائی سوغات سے کم نہ تھی، لیکن انھوں نے اس کی بھی ناقدری کی اور ایک متحدہ حکومت قائم کرنے کے بجائے پورے علاقہ کو اپنے بارہ قبیلوں میں تقسیم کردیا، جس سے ان کی طاقت مختلف قبیلوں میں بٹ کر کمزور ہوگئی، اور پھر تمدن سے ناآشنا خانہ بدوشی کی زندگی نے انھیں کبھی متحد ہونے کا موقع بھی نہیں دیا اور وہ دنیا کی معمولی اغراض کی خاطر آپسی رنجشوں اور کشمکش میں گرفتار رہے۔

عہد قضاۃ

اس دوران ان قبائل میں جو شخص آپسی جھگڑوں کو خوبصورتی سے رفع کرنے کی صلاحیت رکھتا بنی اسرائیل اسے تقدس کی نگاہ سے دیکھتے، اور اگر اس میں کچھ عسکری صلاحیت بھی ہوتی تو بیرونی دشمن سے مقابلہ کے لیے اسے ہی اپنا سپہ سالار تسلیم کرلیتے، اس قسم کے لیڈروں کو بنی اسرائیل "قاضی" کہہ کر پکارتے۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ بنی اسرائیل میں بادشاہت کے قیام تک خدا کی جانب سے روح القدس کے وسیلہ سے انھیں قوت دی گئی ہے کہ وہ ان کی رہائی اور دفاع کا فریضہ انجام دیں۔

بائبل کی کتاب قضاۃ (Judges) انہیں رہنماؤں کے کارناموں کی داستان ہے۔ اس عہد کو وہ "عہد القضاۃ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

"The period of the Judges is the heroic age of Hebrew history. It abounds in wild adventure, and desperate feats of individual valour."(1)

---

(1) The History Of The Jews by Henry Hart Milman, V.1.P.238

(قاضیوں کا عہد عبرانی تاریخ کا شاندار زمانہ ہے، یہ حیرت انگیز مہموں، اور انفرادی شجاعت کے پرخطر اقدامات سے لبریز ہے)

عہدِ عروج

گیارہویں صدی قبل مسیح تک کا زمانہ ''عہد قضاۃ'' کہلاتا ہے، اس کے بعد فلسطین کی مشرک قوموں نے آپسی اتحاد قائم کر کے بنی اسرائیل کے خلاف سخت جنگی کارروائیاں شروع کیں، ان پر زبردست حملے کیے اور اکثر علاقوں پر اپنا قبضہ جمالیا، اس طرح بنی اسرائیل ایک بار پھر مغلوب ہو کر منتشر ہو گئے اور ایک شکستہ قوم کی حیثیت سے گذر بسر کرنے لگے، اس دور انتشار میں حضرت سموئیل پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تو بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ ہم اس خانہ بدوشی کی زندگی سے تنگ آچکے ہیں، اللہ تعالیٰ سے درخواست کیجیے کہ ہمارے لیے کسی ایسے بادشاہ کو مقرر کردے جس کے تابع ہو کر ہم اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرسکیں، اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ مِن بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (البقرۃ:۲۴۶)

(کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے عزت دار لوگوں کو دیکھا جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ کھڑا کیجیے کہ ہم اللہ کے راستہ میں جنگ کریں)

چنانچہ خدائی فیصلہ کے مطابق انہیں میں سے ایک شخص ان کا بادشاہ مقرر ہوا جسے قرآن میں ''طالوت'' کہا گیا اور بائبل کی روایت کے مطابق اس کا نام ''ساؤل'' تھا(۱) طالوت نے فلسطینیوں کا مقابلہ کیا، اور فتوحات حاصل کیں، ان کی فوج میں حضرت داؤد (علیہ السلام) بھی موجود تھے جنھوں نے اپنے جنگی جوہر سے مقبولیت عامہ حاصل کرلی، طالوت کے انتقال کے بعد حضرت داؤد بنی اسرائیل کے بادشاہ مقرر ہوئے، نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا۔ حضرت داؤد کے زمانہ میں فلسطین کا پورا علاقہ بنی اسرائیل کے زیر نگیں آگیا، 974ق م میں حضرت داؤد کا انتقال ہوگیا اور ان کے صاحبزادہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) بنی اسرائیل کے بادشاہ مقرر ہوئے، ان کے دور حکومت میں بین الاقوامی تجارت، صنعت وحرفت، تعمیرات اور انتظام حکومت کے لحاظ سے جو ترقیاں ہوئیں انھوں نے بنی اسرائیلی حکومت کو اقبال کے عروج تک پہنچادیا۔ انھوں نے یہودیوں کے لیے ایک عالی شان عبادت خانہ (ہیکل سلیمانی) بھی تعمیر کرایا اور سلطنت کا نام اپنے جد امجد کے نام پر ''یہوداہ'' رکھا، جس کا مرکز ''یروشلم'' تھا، بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ سب سے زریں دور تھا۔

عہدِ زوال

حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا رحعام (Rehoboam) تخت نشیں ہوا، رحعام مذہبی جذبہ اور

---

(۱) سموئیل ۱:۱۳

سیاسی سوجھ بوجھ سے بالکل عاری ہونے کی وجہ سے ایک نااہل حکمراں ثابت ہوا، اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخلص و تجربہ کار مشیروں کے بجائے ناتجربہ کار و اشتعال پسند نوجوانوں کو اپنا مشیر بنایا جن کے مشوروں نے اس کے ماتحت قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر دیا:

"Instead of adopting the wise and conciliatory language recommended by the older counsellors of Solomon, Rehoboam followed the advice of the young and violent."(1)

(سلیمانؑ کے قدیم مشیروں کی تجویز کردہ دانشمندانہ صلح پسند طریقۂ کار اختیار کرنے کے بجائے رحبعام نے جوشیلوں اور شدت پسندوں کی رائے اختیار کی)

چنانچہ رحبعام کی نااہلیت کی وجہ سے نہ صرف سلطنت کی دینی فضا ختم ہوئی بلکہ اس کا سیاسی نظام و استحکام بھی کمزور ہوتا گیا۔ اسی دوران حضرت سلیمان کے سابق خادم یربعام نے علم بغاوت بلند کر دیا اور "اسرائیل" کے نام سے ایک الگ سلطنت قائم کر لی جس کا پایہ تخت "سامرہ" (Samara) تھا۔

اس طرح حضرت داؤد اور پھر حضرت سلیمان کی قائم و مستحکم کی ہوئی عظیم الشان سلطنت شمال اور جنوب میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان دونوں ریاستوں میں اخلاقی و معاشرتی بگاڑ عام ہونے لگتا تو انبیاء کرام مبعوث ہوتے، اور ان کے اصلاح کی کوشش کرتے لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے انبیاء کا استہزا کرتے، انھیں اذیتیں پہنچاتے اور موقع ملنے پر ان کے قتل سے بھی باز نہ آتے، اس کے علاوہ یہ دونوں ریاستیں سیاسی محاذ پر بھی ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتیں۔

745 ق م میں اسوری بادشاہ تگلت پلاسر سوم (Tigleth-pileser) نے اپنی سلطنت کے حدود کو وسیع کرنا شروع کیا، قسمت سے اسیرین (Assyrian) تخت کو یکے بعد دیگرے ایسے بادشاہ نصیب ہوئے جنھوں نے اسوری سلطنت کو اپنے عہد کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا، اس سلطنت کے حدود جب پھیلنے شروع ہوئے تو اس کی پیائش میں اسرائیلی حکومت بھی شامل تھی، چنانچہ اس نے اسرائیل کو تباہ کر دیا اور وہاں کے باشندوں کو منتشر کر کے دوسری اقوام کو آباد کر دیا۔

یہودیوں کی شمالی ریاست "اسرائیل" کی اس تباہی کا تذکرہ عہد نامہ قدیم میں عموس نبی کے تذکرہ میں موجود ہے۔ عموس بنی اسرائیل کی تباہی سے کچھ عرصہ قبل دعوتی مشن لے کر اٹھے تھے، اور اپنی پیشین گوئیوں اور تنبیہات میں اسرائیل کی اخلاقی بدحالی، سماجی ناانصافی، بدعات اور مشرکانہ اعمال کا نقشہ کھینچا ہے، اور اس بگاڑ کے نتیجہ میں خدا کے

---

(1)The History Of The Jews by Henry Hart Milman, v.1,P.332

غیظ وغضب اور آنے والی تباہی وسزا کی بھی نشاندہی کی ہے، یہ وہ دور تھا جب یہودیوں کی ریاستیں ایک طویل عرصہ کی منظم حکومت اور بیرونی خطرات سے محفوظ ہو کر خوشحالی وکامرانی کے ساتھ بسر کر رہی تھیں، اور اس کے نتیجہ میں عوام وخواص دونوں ان اخلاقی واعتقادی بیماریوں میں مبتلا تھے جو دولت وحکومت کے نشہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

اسورین بادشاہوں کی زبردست فوجوں نے جو عمومی تباہی مچائی اس سے یہودیوں کی شمالی ریاست "اسرائیل" تو جڑ سے اکھڑ گئی، لیکن ان کی جنوبی ریاست "یہوداہ" پورے طور پر محفوظ رہی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی "یہوداہ" کا بادشاہ اباز نہ صرف اسیرین حکومت کا حلیف بن چکا تھا بلکہ اسرائیل کے خلاف فوجی کارروائی میں وہ شریک بھی تھا، اس عمومی تباہی کے بعد اسیری حکومت مغربی ایشیا میں سب سے بڑی طاقت بن چکی تھی، اور اس کا غلبہ "یہوداہ" کے سیاسی وتمدنی اور مذہبی زندگی پر بھی حاوی ہو کر رہا اور "یہوداہ" میں اسیرین کا طور طریق اور طرز معاشرت کے نہ صرف اثرات ظاہر ہونے لگے بلکہ یہودیوں کی مرکزی عبادت گاہ یروشلم کے معبد میں اسیرین دیوی دیوتاؤں کی عبادت بھی ہونے لگی۔

612 ق م میں بابل کے حکمرانوں نے اسیرین سلطنت کے خلاف بغاوت کردی اور اس کے دارالسلطنت نینوا (Nineveh) پر قبضہ کرلیا، پھر اسیرین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے اسیرین کے ایک ایک علاقہ پر اپنا تسلط قائم کرلیا، اس دوران یہودیوں نے کئی بار اس عظیم سلطنت کے جوئے کو اپنے گردن سے نکال پھینکنے کی کوشش کی، لیکن ہر دفعہ ان کو زبردست نقصان اٹھا کر اپنے گھٹنے ٹیکنے پڑے، اسی طرح کی ایک ناکام کوشش کے نتیجہ میں 588 ق م میں بابل کا سخت گیر بادشاہ نبوخذ نصر (Nebuchadnezzar) نے "یہوداہ" کو بالکل تاراج کرڈالا، اور یروشلم کا محاصرہ کرلیا جو تقریباً ڈھائی سال تک جاری رہا:

"The Temple suffered at the hands of Nebuchadrezzar II of Babylonia, who removed the Temple treasures in 604 BC and 597 BC and totally destroyed the building in 587/586."(1)

(بابلی نبوخذ نصر دوم (بخت نصر) کے ہاتھوں ہیکل دو چار ہوا، اس نے ۶۰۴ اور ۵۹۷ ق م میں ہیکل کے تمام خزانے کو لوٹ لیا، اور ۵۸۶ یا ۵۸۷ ق م میں ہیکل کی عمارت کو پوری طرح برباد کردیا)

اس تباہی کے نتیجہ میں یروشلم کی آبادی کو ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا، شہر کی فصیل ڈھادی گئی، تمام عمارتوں اور مرکزی معبد ہیکل سلیمانی کو زمین بوس کردیا گیا، تمام اشرافیہ، کاریگروں، اور کسی بھی لحاظ سے قابل قدر آبادی کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا، اور "یہوداہ" کو بابل کا ماتحت ایک عام صوبہ بنا کر اس پر حاکم متعین کردیا گیا۔ (۲)

---

(1) www.bu.edu/mzank/Michael_Zank/Jerusalem/temple mount.html

(۲) اس کی تفصیلات عہدنامہ قدیم کی کتاب "یرمیاہ کا نوحہ" میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

چنانچہ تواریخ ۲ باب ۳۶ آیت نمبر ۱۸-۲۴ میں لکھا ہے:

''اور خدا کے گھر کے سب ظروف کیا بڑے کیا چھوٹے اور خداوند کے گھر کے خزانے اور بادشاہ اور اور اس کے سرداروں کے خزانے یہ سب وہ بابل لے گیا۔ اور انھوں نے خدا کے گھر کو جلا دیا اور یروشلم کی فصیل ڈھا دی، اور اس کے تمام محل آگ سے جلا دیے، اور اس کے سب قیمتی ظروف کو برباد کر دیا۔ اور جو تلوار سے بچے وہ ان کو بابل لے گیا اور وہاں وہ اس کے اور اس کے بیٹوں کے غلام رہے جب تک فارس کی سلطنت شروع نہ ہوئی۔''

اس طرح یہودیوں کی یہ ریاست بھی تباہ ہوگئی اور حضرت داؤد کے خاندان کی حکومت بالکل ختم ہوگئی۔

539 ق م میں ایران میں پہلی سلطنت کے بانی سائرس (Cyrus the Great) نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو اس نے بابلی سلطنت کو بھی فتح کر لیا، جس کے بعد اس نے رحم دلی و انسانیت نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کو ان کے اپنے قدیم شہر یروشلم میں جا کر آباد ہونے کا عام اختیار بھی دے دیا، ساتھ ہی انھیں اپنے معبد کی تعمیر کی اجازت بھی دی چنانچہ 516ء میں عظیم دارا (Darius the Great) کے عہد میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر جدید مکمل ہوئی:

"Cyrus issued an edict authorizing the return of the Jews from their captivity in Mesopotamia to their ancient homeland, where they were to be permitted to rebuild their central national-religious institution, the sacred Temple in Jerusalem."(1)

(سائرس نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس میں اس نے یہودیوں کو عراق کی غلامی سے نکل کر اپنے قدیم آبائی وطن جانے کا اختیار دے دیا، جہاں انھیں یروشلم میں اپنے مرکزی ملی ادارہ یعنی مقدس ہیکل کے تعمیر کی اجازت بھی حاصل تھی)

سائرس کی حکومت میں یہودی سیاسی غلام ضرور تھے لیکن ایک بار پھر مذہبی آزادی نصیب ہوئی، البتہ بابل کی اسیری سے ان کی زندگیاں غیر معمولی طور پر متاثر ہو چکی تھیں، ان کے سیاسی و مذہبی اور سماجی و تمدنی حالات بہت حد تک بدل چکے تھے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودیت کے خدوخال تبدیل ہو کر ایک نئے سانچہ میں ڈھل چکے تھے، چنانچہ پیغمبر حضرت عزیرؑ مبعوث ہوئے اور ان کی اصلاح کی کوششیں کیں۔

مکابی حکومت کا قیام

334 ق م میں سکندر اعظم یونانی نے عالمی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، اور اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور عظیم عسکری طاقت کے سامنے ایرانی حکومت زوال کا شکار ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی یہودیوں کے سیاسی امن و سکون

---

(1) Between Rome and Jerusalem: 300 Years of Roman- Judaean Relations ByMartin Sicker,p.2

کے دور کا بھی خاتمہ ہوگیا اور پوری قوم کے گلے میں ایران کی جگہ یونان کی غلامی کا طوق ڈال دیا گیا۔

323 ق م میں سکندر اعظم کی موت ہوگئی جس کے بعد اس کی وسیع وعریض سلطنت اس کے سرداروں میں تقسیم ہوگئی، جو تاریخ میں ''ڈیاڈوچی'' (Diadochi) یا ''ملوک الطوائف'' کے نام سے مشہور ہیں، اور اسی کے ساتھ ان میں خانہ جنگی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، اس خانہ جنگی کے دوران فلسطین کی سرحدیں پہلے مصر کے بطلیموی (Ptolemaic) خاندان کے قبضہ میں رہیں، پھر 200 ق م کے بعد مغربی ایشیاء کے سلوکی خاندان (Seleucid Empire) نے اس پر قبضہ کر کے اسے یونانی تہذیب وتمدن میں شامل کرلیا۔

یہ یونانی حکمراں ایرانی شہنشاہوں کے طرز پر مذہبی وتمدنی رواداری کے قائل نہ تھے جو صرف دوسری اقوام کی سیاسی اطاعت پر قانع ہوجاتے تھے بلکہ یونانی تہذیب وتمدن پر نازاں سکندر کے ان جانشینوں کے نزدیک دوسری اقوام کی حیثیت وحشیوں اور جانوروں سے زیادہ نہ تھی، جنھیں یونانی تہذیب کے سانچہ میں ڈھال کر ''متمدن'' بنانا وہ اپنا فرض منصبی خیال کرتے تھے، خواہ اس مقصد کے لیے انھیں ظلم وتعدی سے ہی کیوں نہ کام لینا پڑے۔

چنانچہ دوسری صدی قبل مسیح میں سلوکی حکومت اگرچہ روبہ زوال تھی لیکن اس کے سخت گیر حکمراں انطاکس اپفانس چہارم (Antiochus-Epiphanes) نے اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے سخت اقدام اٹھائے، یہودی شریعت کو پامال کرنے والے انتہائی متعصبانہ قوانین نافذ کیے، یہودیوں کے مرکزی معبد کو ناپاک کر کے اس میں یونانی دیوتاؤں کے بت نصب کروائے چنانچہ مکابین/۲:۶ میں ہے:

''اس نے حکم دیا کہ ہر مہینہ یہودیوں کی تلاشی لی جائے تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے کسی بچہ کا ختنہ تو نہیں کیا یا ان کے پاس توریت کا کوئی نسخہ تو نہیں، دسمبر 168 ق م میں اس نے ہیکل میں سور کی قربانی چڑھائی اور ہیکل کو زیوس دیوتا کے نام پر وقف کیا۔''

اس صورت حال نے یہودیوں میں غم وغصہ اور بے بسی وبے بضاعتی کی کیفیت پیدا کردی، اور صدیوں سے اپنی حکومت کے قیام کی دبی ہوئی آرزو نے بغاوت کی شکل اختیار کرلی، اور جو طاقتور تحریک اٹھی اس نے یونانی حکومت کے کمزور ستونوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، اور یہودی ایک خودمختار حکومت کے قیام میں کامیاب ہوگئے، جو اس تحریک کے رہنما یہوداہ مکابی (Judah Maccabee) کے نام سے موسوم ہوئی۔

مکابی حکومت (Maccabean Empire) کے قیام سے یہودیوں کو دینی وسیاسی استحکام کو پھر ایک موقع حاصل ہوا، لیکن مکابی خاندان کا یہ دور حکومت کئی اعتبار سے مایوس کن ثابت ہوا، مکابی حکمراں نہ صرف یہودیوں کی عظمت رفتہ اور قدیم زمانہ کی کوئی خوش حالی وفراوانی کی کوئی جھلک واپس لانے میں قطعی ناکام رہے بلکہ انھوں نے خود اپنے عوام پر ظلم وغارت کی انتہا کردی، ان کے نزاعی مزاج اور نفس پرست طبیعت نے انھیں باہم دست وگریباں کردیا، بالآخر یہودیوں نے اس حکومت سے اپنی ساری امیدیں منقطع کرلیں، اور مکابی حکومت خانہ جنگی کا شکار

ہوگئی، نیز ایمان سوز و اخلاق سوز رسم و رواج نے انھیں پست سے پست کر دیا، انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا لیکن ان کی قدر دانی کے بجائے ہمیشہ کی طرح وہ ان کے جان کے دشمن بن بیٹھے، آخرش وہی نتیجہ سامنے آیا جو اعتقادی واخلاقی خرابیوں کا لازمہ ہے، اندرونی خلفشار بڑھتا گیا، خدا کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور پھر پہلی صدی قبل مسیح کے آغاز میں جب رومی حکومت نے سلجوقی سلطنت پر اپنی آخری ضرب لگائی تو اس زوال آمادہ مکابی حکومت کو ہڑپ کر لینے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

63 ق م میں رومن فاتح پومپی (Pompey) نے فلسطین پر براہ راست حملہ کر کے اسے رومی حکومت میں شامل کر لیا، اور اس طرح یہودیوں کی یہ آخری حکومت بھی فنا کے سمندر میں جھونک دی گئی۔

رومی حکومت نے یہودیوں کی مخصوص قومی و مذہبی تشخص کا خیال رکھتے ہوئے ان کے اندرونی معاملہ میں براہ راست مداخلت کے بجائے ایک یہودی ''ہیروڈ'' (Herod) کو ان کا نگہباں حاکم (Client King) بنا دیا، اس طرح یہودی بیک وقت دو حاکموں کی ماتحتی میں تھے؛ ایک رومی حاکم جو حکومت کے معاملات وانتظامات دیکھتا اور دوسرے یہودی سربراہ جو ان کے مذہبی امور کی نگرانی کرتا۔ (1)

بنی اسرائیل کا آزمائشی دور

رومی سلطنت اپنے وقت کی عظیم ترین سلطنت تھی، اس کی سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ رومی تہذیب وتمدن بھی اس وقت رائج سکہ تھا، حکومت کے نشہ اور طاقت کے غرّے میں رومی کسی دوسری قوم کی روایات اور اس کے مخصوص تمدن کو خاطر میں نہیں لاسکتے تھے، چنانچہ بہت جلد انھوں نے یہودیوں کے قومی و مذہبی تشخص کو مٹانے کی کارروائی شروع کر دی، فلسطین میں مظالم کا سلسلہ شروع ہوا اور ایسے قوانین نافذ ہوئے جو یہودیوں کی شریعت اور طرز معاشرت کے سرتاسر خلاف تھے، ان قوانین میں یہودیوں کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ رومی شہنشاہ کی پرستش کا مسئلہ تھا، جس کو سرکاری حکم سے تمام مملکت میں نافذ کیا جاتا تھا، اور جو یہودی عقیدہ سے براہ راست ٹکراتا تھا۔

یہودی تاریخ میں یہ دور غلامی سب سے زیادہ اذیتناک تھا، کیونکہ اب تک یہودی سیاسی وجسمانی اعتبار سے غلام ضرور تھے تاہم ان کی مذہبی آزادی برقرار تھی، لیکن رومی حکومت نے اس آزادی پر بھی پہرے بٹھا دیے تھے، اور ان کے جسموں کے ساتھ ان کی روحوں کو بھی غلام بنا لیا تھا، یہودی جو ہمیشہ اپنی خودمختاری کا خواب دیکھتے تھے

---

(1) From Text to Tradition: A History of Second Temple and Rabbinic Judaism by Lawrence H. Schiffman

تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: عیسائیت کیا ہے؟ بقلم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، اور ''دنیا کے بڑے مذاہب'' از عماد الحسن آزاد فاروقی

اس صورت حال سے مزید اضطراب میں مبتلا ہو کر مختلف علاقوں میں ہجرت پر مجبور ہو گئے۔

مذہبی زوال

سیاسی زوال وادبار کے ساتھ ساتھ یہودی مذہبی اعتبار سے بھی دیوالیہ ہو چکے تھے، ان کی بچی کھچی اجتماعیت بھی منتشر ہو کر تین فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھی، پہلا سدوسی فرقہ (Saducee)؛ جو قدامت پرست تھا، اور تاریخی ورثہ پر سختی سے کاربند تھا۔ دوسرا فرقہ فریسی (Pharisee) تھا؛ یہ اعتدال پسند تھا، اور تیسرا فرقہ زیلائٹ (Zilet) نام کا تھا، جو کہ شدت پسند اور انقلابی تھا، یہ صرف روم کی تباہی چاہتا تھا، اس لیے اسے مذہبی احکام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

مختلف حکمرانوں کا ظلم وستم اور ان کی فرقہ بندی درحقیقت ان کے گھنونے اعمال کا لازمی نتیجہ تھا، کسے انکار کہ یہودیوں کو اللہ رب العزت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا، اور انھیں افضل الامم قرار دے کر اپنا محبوب بنا لیا تھا، لیکن یہودیوں نے اس نعمت ومحبت کی قدر وحفاظت کے بجائے عناد وسرکشی کی راہ اختیار کی، اور اپنے محسن اعظم حضرت موسیٰ اور ان کے بعد جتنے بھی انبیاء مبعوث ہوئے ان سب کا انھوں نے ٹھٹھا کیا، انھیں اذیتیں پہنچائیں، انھیں زدوکوب کیا، اور موقع ملنے پر ان کے قتل سے بھی نہیں چوکے:

﴿كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ﴾ (المائدۃ:۷۰)

(جب جب ان کے پاس رسول ایسی چیز لے کر آتے جو ان کے نفس کے موافق نہ ہوتی تو وہ کتنوں ہی کو جھٹلا دیتے اور کتنوں ہی کا خون بہا دیتے)

ان جرائم کی پاداش میں خدائے ذوالجلال نے ان سے افضلیت ومحبوبیت کا اعزاز ہی چھین لیا، اور سیاسی اعتبار سے بے حیثیت وبے وقعت کر کے ظالم حکمرانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا نیز دیگر اقوام کی مذہبی رہنمائی کرنے اور قابل تقلید بننے کے بجائے وہ خود مذہبی قلاشیت میں گرفتار ہو گئے، خدائی نعمتیں سلب کر لی گئیں اور مذہبی پابندیاں عائد کر دی گئیں، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾

(الانعام:۱۴۶)

(اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والے (جانور) کو حرام کیا اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی سوائے اس کے جو ان دونوں کی پیٹھ یا آنتوں میں ہو یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی وجہ سے دی اور یقیناً ہم ہی سچے ہیں)

دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مقبول عام سوانح عمری Jesus in His Time" "(یسوع اپنے زمانہ میں) کے مطابق حضرت عیسیٰ کا اصل نام یشوع (Jeshuah, Joshua, Jesus) تھا، یہ لفظ عمومی طور پر مرکب یعنی (Jesus Christ or Christ Jesus) استعمال ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ کا لقب "مسیح" تھا(۱) جسے عبرانی زبان میں "ماشیاح" (Masah) آرامی میں "مشیحا" (Mesiha) اور یونانی میں "کرائسٹس" (Khristos) کہا گیا۔(۲)

مذہبی پابندی اور سیاسی زوال کے بعد یہودیوں کی حیثیت ایک شکستہ و پسماندہ قوم کی تھی جس کی قسمت میں مادی اسباب کے لحاظ سے آزاد فضا میں سانس لینے کا کوئی امکان نہ تھا، اس لیے قدرۃً ان کی نگاہیں مستقبل پر لگی ہوئی تھیں اور اس نبی کی منتظر تھیں جس کی بشارت اب تک سارے انبیاء دیتے آئے تھے، اور انھیں یقین تھا کہ اس نبی کی بعثت کے بعد ان پر سے مذہبی پابندیاں بھی ختم ہوں گی اور سیاسی اعتبار سے انھیں عروج نصیب ہوگا، ان کے دشمنوں کا صفایا ہوگا اور حکومت داؤدی کا احیاء ہوگا، اور وہ نبی اللہ کی خصوصی برکات کا حامل ہوگا، اور اسی نبی موعود کو وہ "مسیح" کہا کرتے تھے۔(۳) اسی ذہنی ماحول میں جب حضرت یحییٰ(۴) نے دعوت وارشاد کا کام شروع کیا تو یروشلم کے مذہبی رہنماؤں نے وفد بھیج کر اس بات کی تصدیق چاہی کہ آیا وہی "مسیح منتظر" ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں مسیح نہیں ہوں لیکن میں ان کی بشارت سنانے والا ہوں۔

یہودی ہمیشہ سے اپنے نجات دہندہ کی آمد کے منتظر رہے اور اسی امید میں جیتے رہے، ان کا یہ انتظار اس وقت اور سخت ہو جاتا جب قومیں ان پر ٹوٹ پڑتیں، اور ان کی آزادی چھین لی جاتی، اس انتظار میں اس وقت حد سے زیادہ شدت آگئی جب وہ فلسطین کی اس سرزمین سے بے دخل ومحروم کر دیے گئے جو وادی سینا میں چالیس سال کی صحرانوردی کے بعد نصیب ہوئی تھی۔

---

(1) Jesus in His Time by Dainel-Rops, P.83.

& Webster's New Colligiate Dictionary *(Jesus)*

(۲) مسیح کا لفظی مطلب "مسح یا مالش کیا ہوا" (Anointed One) ہے، یہودیوں میں دستور تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور خاص مذہبی رہنما کے سر پر "مقدس تیل" لگاتے تھے، یہ اس بات کی علامت ہوتی تھی کہ خدا نے اسے ان کی رہنمائی کے لیے چنا ہے:

The Title Christ means literally "anointed one"

(Jesus of History, Christ of Faith By Thomas Zanzig,p.33)

(۳) یسعیاہ باب ۷ تا ۱۲

(۴) حضرت یحییٰ کو انجیل میں یوحنا اصطباغی یعنی یوحنا بپتسمہ دینے والا (John the Baptist) کہا گیا ہے۔ انجیل متی ۳:۱

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی آمد

مکابی حکومت کے خاتمہ کے بعد سے پوری یہودی قوم انتشار واضمحلال کا شکار تھی، وہ مختلف علاقوں میں منتشر ہو چکے تھے، بابل کی جلاوطنی کے اختتام پر ان کی ایک بڑی تعداد یروشلم آ کر آباد ہو گئی تھی، لیکن ایک تعداد نے حالات سے سمجھوتہ کر بابل ہی کو اپنا وطن بنالیا، اور کچھ یہودی مصر بھی منتقل ہو گئے، یروشلم کئی بار کی تباہی کے بعد رومی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا تھا جسے رومی "یہودیہ" کہتے تھے، مذہبی اعتبار سے بھی پوری قوم مختلف بندشوں میں جکڑی ہوئی تھی، ایک طرف مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں خدائی پابندیاں تھیں تو دوسری طرف خود یہودی علماء بھی (جنھیں "ربی" بھی کہا جاتا تھا) مذہب کا بیوپار کرنے لگے تھے، توریت کی من چاہی تشریح کی جاتی، اور ذاتی مفادات واغراض کی خاطر اس کا استعمال کیا جاتا، اس کے علاوہ یہودی مذہب مختلف رسومات وخرافات کا ایک پلندا بن چکا تھا، اس کے علاوہ پورا معاشرہ یونانی ورومی فلسفہ میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ وہ ہر اس چیز کا انکار کر دیتا جس کی عقلی توجیہ ممکن نہ ہوتی۔ یہ صورتحال تھی جس میں حضرت عیسیٰ ایک معجزہ بن کر بن باپ کے پیدا ہوئے، ان کی یہ معجزاتی پیدائش خدا کی ایک نشانی کے علاوہ یہودیوں کی عقل پرستی پر ایک ضرب بھی تھی۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتی زندگی

حضرت عیسیٰ کے حالات زندگی پر مختلف کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے حالات زندگی سے متعلق قابل اعتماد مواد کبھی نہیں رہا ہے، حضرت عیسیٰ کے حالات زندگی سے واقفیت کے لیے اناجیل اربعہ (متی، یوحنا، لوقا، مرقس) کا ہی سہارا لیا جاتا ہے، جو کہ درحقیقت حضرت عیسیٰ کے مذہبی نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی سوانح ہیں، اور وہ بھی حضرت عیسیٰ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے سینتیس (۳۷) سال بعد سے لے کر ستر، اسی سال بعد تک لکھی گئی ہیں، نیز ان ناجیل کے مزعومہ مرتبین میں سے دو (متی، یوحنا) حضرت عیسیٰ کے حواری ہیں اور بقیہ دو (لوقا، مرقس) کی حیثیت حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے اصحاب کی ہے۔

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ "Jesus" میں لکھا ہے:

"Any attempt to write a "Life of Jesus" should be frankly abandoned. The material for it certainly does not exist. It has been calculated that the total number of days in His life regarding which we have any record does not exceed 50."(1)

(واضح بات یہ ہے کہ "حیات مسیح" پر لکھنے کی کوشش ترک کر دینی چاہیے، اس کے لیے مواد یقیناً موجود نہیں ہے،

---

(1) Encyclopaedia of Brittanica V.13, PP.16-17

اندازہ کے مطابق ان کی زندگی کے ان دنوں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہے جن کے متعلق ہمارے پاس ریکارڈ موجود ہے)

بہر حال انجیل لوقا کے مطابق حضرت عیسیٰ کی پیدائش ناصرہ (Nazereth) علاقہ میں ہوئی جو فلسطین کے صوبہ گلیل (Galilee) کا حصہ تھا(۱) اسی نسبت سے آپ کو ناصری اور آپ کے متبعین کو "نصاریٰ" بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن اور جوانی کے حالات کا کوئی ریکارڈ تاریخ میں موجود نہیں ہے، انجیل میں حضرت عیسیٰ کے عہد شباب سے متعلق صرف اتنا تذکرہ موجود ہے: "اور یسوع حکمت اور قد و قامت میں اور خدا کی اور انسان کی مقبولیت میں ترقی کرتا گیا۔"(۲)

حضرت عیسیٰ یہودیوں کے ایک باعزت اور شریف گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن یہ گھرانہ خاصا غریب تھا اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ نے جوانی میں بڑھئی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، اس لیے یہودی معاشرہ میں اس گھرانہ کو کوئی اونچا مقام حاصل نہ تھا۔

حضرت عیسیٰ نے اصرار کر کے اپنے رشتہ کے بھائی حضرت یحییٰ سے "بپتسمہ" لیا، پھر ان پر روح القدس کا نزول ہوا، جس کے بعد حضرت عیسیٰ چالیس دن تک جسمانی و روحانی ریاضت میں مشغول رہے، بیاباں کی تنہائی میں شیطان نے انھیں آزمایا بھی لیکن آپ ثابت قدم اور خدا کے وفادار رہے۔ (۳)

اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے گلیل کے علاقہ کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، اور لوگوں کو اپنی اصلاح اور رجوع الی اللہ کی دعوت دی، وہ یہودی عبادت خانوں میں گھوم پھر کر تعلیم و تبلیغ میں مصروف رہے، (۴) گلیل کی بستی کے علاوہ اسی علاقہ کا ایک دوسرا شہر کفرنحوم (Capernaum) بھی آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کا میدان تھا۔ (۵)

حضرت عیسیٰ نے دیگر انبیاء کی طرح سب سے پہلے توحید کی ہی دعوت دی، قرآن مجید میں صراحت سے موجود ہے کہ آپ نے فرمایا:

﴿وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ﴾ (المائدۃ:۷۲)

(اور مسیح نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! اس اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے بلاشبہ جو بھی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور نا انصافوں کا کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا)

---

(۱) لوقا:۱/۲۶-۳۸ (۲) لوقا:۲:۵۲ (۳) متی ۴:۱-۱۱، مرقس ۱:۱۲-۱۳، لوقا ۴:۱-۱۳
(۴) لوقا:۴:۳۱-۱۶ (۵) مرقس:۱:۱۲، متی:۴:۱۲-۲۳، لوقا:۴:۲۱-۴۴

اس دوران انھوں نے بیماروں کو شفا دینے، بدروحوں اور شیاطین کو جسموں سے نکالنے، کوڑھ اور فالج وغیرہ کو ٹھیک کرنے اور اندھوں کو بینائی اور گونگوں کو گویائی دینے اور مردوں کو زندہ کرنے کے معجزات بھی دکھائے، جس سے ان کی شہرت دور دور پھیل گئی اور ایک بڑی بھیڑ ان کے پیچھے ہو لی۔

اس دوران حضرت عیسیٰ نے اپنے پیروکاروں میں سے بارہ خاص شاگردوں کا انتخاب کیا، جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے اور آپ کی تعلیمات سیکھتے، انھیں "حضرت عیسیٰ کے حواری" کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، اور قرآن مجید نے انہیں کو "انصار اللہ" کا خطاب بھی دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے مواعظ کے ذریعہ مذہب کی تشریح بھی کرتے جو ظاہری رسم ورواج سے ہٹ کر حقیقی مذہبیت اور اخلاص پر مبنی ہوتی، اس طرح آپ اپنے معجزات ومواعظ کے ذریعہ جلد ہی ایک مقبول عام شخصیت بن گئے، اور یہ ہر دلعزیزی اس وقت اپنے عروج کو پہنچی جب آپ نے چند روٹیوں سے پانچ ہزار افراد کی بھوک مٹائی۔ (۱)

حضرت عیسیٰ اپنی دعوتی سرگرمیوں میں سماج کے کمزور اور نچلے طبقہ کا خصوصی خیال رکھتے، آپ کو ایسے لوگوں سے خلا ملا رکھنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی عار نہ تھا جو یہودیوں کے نزدیک سماج کا تلچھٹ تھے مثلاً ٹیکس انسپکٹر (رومی حکومت کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے یہودیوں کے نزدیک قابل نفرت) ساری (یہودیوں کے نزدیک ایک بدعتی فرقہ) یا طوائف وبازاری لوگ، اور مزدور پیشہ افراد وغیرہ۔ اس طرح آپ کی مقبولیت بڑھتی گئی اور آپ کی زیارت اور روحانی وجسمانی شفا کے طالبین کی ایک بھیڑ مستقل آپ کے ساتھ چلنے لگی۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مخالفت

حضرت عیسیٰ کا مخاطب یہود کا وہ اعلیٰ طبقہ بھی تھا جو ملحدانہ مادہ پرستی میں ڈوبا ہوا تھا اور ہر موجود چیز کی تخلیق کے اسباب وعلل اور غرض وغایت کی مادی تفسیر کا سختی سے پابند تھا، اور اپنے قول وفعل سے روح کا منکر تھا، حضرت عیسیٰ کو دیے گئے معجزات مادی فکر کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوئے، انھوں نے اپنی تعلیمات کو بلند آہنگی سے پیش کیا، یہود کو ملحدانہ مادہ پرستی کی آلودگیوں سے نکلنے اور روحانی پاکیزگی تک پہنچنے کی دعوت دی، اور انسان کے روحانی شعور کو خدا کی عظمت وجلالت سے آگاہ کرایا۔

اس کے علاوہ اس زمانہ کے یہودیوں کے دل سنگ وآہن بن چکے تھے، اس لیے حضرت عیسیٰ نے دلوں کو نرم کرنے والی تعلیم پیش کی اور اپنے مواعظ سے دلوں کی کثافتوں کو دور کرنے کی کوشش کی، اور زمانہ سے چلی آرہی یہود اور اہل سامرہ کی عداوتوں کو ختم کرنے کی دعوت دی اور ان کی مساوات کا اعلان کیا جنھیں یہود غلام، اچھوت

---

(۱) متی: ۱۴: ۱۶-۲۱، مرقس: ۶: ۳۶-۴۴

اور ذلیل سمجھتے تھے، نیز یہودی رہنماؤں کی غلط روش پر کھل کر تنقید کرتے، حضرت عیسیٰ کی یہ تعلیمات یہودی ربیوں کے خلاف ایک خطرہ کی گھنٹی تھی، اور ان کی مذہبی چودہراہٹ واقتدار کے خلاف کسی بغاوت سے کم نہ تھی۔

یہودیوں کا اعلیٰ طبقہ خود عوام الناس کی طرح ''مسیح'' کے ظہور کا منتظر تھا لیکن اس کے تصور میں آنے والا مسیح ایک کروفر والی شخصیت تھی، جس کے جلو میں فرشتوں اور انسانوں کی فوجیں ہوں گی اور جو رومیوں اور یہودیوں کے سبھی دشمنوں کو شکست فاش دے کر حضرت داؤد کی کھوئی ہوئی سلطنت کو پھر سے قائم کرے گا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے معجزات اور ان کی بڑھتی ہوئی عام مقبولیت سے وہ بھی یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ جس نجات دہندہ ''مسیح'' کا انھیں انتظار تھا وہ حضرت عیسیٰ ہی ہیں البتہ حضرت عیسیٰ جیسے شکستہ حال، مزدور پیشہ اور غریب شخص کو ''مسیح موعود'' تسلیم کرنا ان کے لیے بہت ہی مشکل تھا چنانچہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا تاکہ ان کی خدائی طاقت اور ان کے متبعین کے ذریعہ اپنے مقاصد پورے کرسکیں، لیکن حضرت عیسیٰ چونکہ صرف روحانی رہنما تھے اس لیے انھوں نے انکار کردیا، اور صراحت سے کہہ دیا کہ میں وہ ''مسیح'' نہیں ہوں جس کا تمھیں انتظار ہے، بلکہ میں اس کی بشارت دینے والا ہوں:

﴿ يَا بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَأْتِيْ مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴾ (الصف:٦)

(اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے جو تورات (اتری) تھی اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک ایسے رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے)

لیکن یہودیوں کا دباؤ بڑھتا رہا بالآخر بادشاہی سے بچنے کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے ان سے الگ ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گتسمنی (Gethsemane) نامی ایک جگہ چلے گئے، اس دوران بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا کیونکہ وہ ظالم وغیر ملکی حکمرانوں سے نجات دلانے کے بجائے ابدی نجات اور روحانی اصلاح پر زور دیتے تھے، اس طرح یہود ان سے اپنی دنیاوی توقعات پوری نہ ہونے پر تلملا اٹھے اور ان کے روحانی مواعظ سے سخت برہم ہوئے۔

چنانچہ یہودی ربیوں اور سرمایہ داروں نے حضرت عیسیٰ کی مخالفت کا اعلان کردیا، اور رومی حکومت کو بھی ان کے خلاف بھڑکانا شروع کردیا، لیکن رومی حکومت نے یہودیوں کی بات سنی ان سنی کردی کیونکہ وہ یہودیوں کے آپسی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی تھی، اور اس کے نزدیک یہود اور حضرت عیسیٰ کا اختلاف گھریلو جھگڑے کی نوعیت کا تھا، اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ کی دعوت وتبلیغ میں کسی تنظیم یا حکومت وسیاست کا رنگ بھی نہیں تھا، بلکہ آپ کی تعلیمات

کا خلاصہ وجدانی اصلاح، روح اور نفس انسانی کی نظافت وطہارت کے سوا کچھ نہ تھا، اس لیے رومی حکومت نے اس معاملہ میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

یہود کسی طرح اپنی دسیسہ کاری وریشہ دوانی سے رومی حکومت کو حضرت عیسیٰ کے خلاف ورغلانے پر کامیاب ہو گئے اور یہ یقین دلا دیا کہ عیسیٰ حکومت کے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں، لوگوں کو سرکاری ٹیکس دینے سے منع کرتے ہیں اور خود کو بادشاہ کہلواتے ہیں، (۱) اس کے بعد یہودی رہنماؤں نے یہ فرمان جاری کیا کہ "اگر کسی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے تو اطلاع دے تا کہ اسے پکڑ لیں" (۲) اس اعلان کے بعد حضرت عیسیٰ کے خاص شاگردوں میں سے ایک یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot) نے حضرت عیسیٰ کو پکڑوانے کے لیے تیس روپے لیے (۳) اور پھر ایک موقع پر جب حضرت عیسیٰ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کہیں سورہے تھے تو مذہبی رہنماؤں کے فرستادوں اور سپاہیوں کو لے کر آیا اور انھیں گرفتار کروادیا۔ (۴) گرفتاری کے بعد رومی عدالت میں حضرت عیسیٰ پر مقدمہ چلا اور یہودیوں کی زبردست پیروی کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ کو موت کی سزا سنادی گئی۔

حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت اور دوبارہ زندگی

رومی عدالت کے فیصلہ کے بعد حضرت عیسیٰ کو شہر سے باہر سولی دینے کی جگہ مقام گلگتا (Golgotha) لے جایا گیا اور بروایت اناجیل آپ کو طرح طرح کی اذیتیں اور طعنے دے کر مصلوب کر دیا گیا، اور آپ نے تیز آواز میں "او میرے خدا، میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" کہتے ہوئے جان دے دی۔ (۵)

اناجیل اور عیسائی روایات کے مطابق سولی دیے جانے کے بعد حضرت عیسیٰ ایک باغ یا چٹان میں بنی قبر میں رکھے گئے، اور پھر تین دن بعد دوبارہ زندہ ہوئے (۶) اور اپنے تمام حواریوں کو پوری دنیا میں اپنی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کرنے کا حکم دیا۔ انجیل یوحنا کے مطابق وہ اپنے شاگردوں کو ایک سے زیادہ مرتبہ دکھائی دیے اور ان سے کلام کیا۔ اس طرح اپنے جی اٹھنے کے چالیس دن بعد حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھا لیے گئے، جہاں وہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق خدا کے داہنی طرف بیٹھے ہیں اور قیامت کے قریب اپنے پورے جلال کے ساتھ دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔

وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ

یہودی عقیدہ کے مطابق صلیب یا پھانسی کی موت مرنے والا شخص "ملعون" سمجھا جاتا تھا، (۷) حضرت عیسیٰ

---

(۱) لوقا ۲:۲۳ (۲) یوحنا ۵۷:۱۱ (۳) متی ۱۶-۱۴:۲۶ (۴) متی ۵۶-۴۷:۲۶

(۵) یوحنا ۳۹:۱۸-۴۰، لوقا ۲۵:۲۳، متی ۲۶:۲۷ (۶) متی ۶۳:۲۷، ۲۷:۱۶

(۷) گلتیوں کے نام خط ۱۳:۳

کی مصلوبیت نے عیسائیوں کو بڑی مشکل میں مبتلا کر دیا، ان کا ماننا تھا کہ حضرت عیسیٰ "مسیح موعود" ہیں لیکن جس درد وتکلیف کے ساتھ ان کی موت ہوئی وہ مسیح کے شایان شان نہیں، اسی مشکل سے بچنے کے لیے پولس نے یہ فرضی عقیدہ وضع کیا کہ مسیح نے ہمیں گناہ کے طوق سے رہائی دلانے کے لیے اس "لعنتی موت" کو قبول کیا، اس کا کہنا ہے:

"مسیح نے جو ہمارے لیے لعنتی بنا، ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا لیا، کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔"(۱)

پولس نے جب یہ عقیدہ پیش کیا کہ حضرت عیسیٰ نے یہ ذلت صرف اپنے متبعین کے گناہوں کے کفارہ کے لیے برداشت کی تھی تو یہ بھی ثابت کرنا ضروری تھا کہ ان کا یہ عمل اختیاری تھا اور خلاصی کی قدرت کے باوجود انھوں نے خود صلیب پر چڑھنا گوارہ کر لیا، پس اسی کے ثبوت کے لیے ان کی حیات ثانی کا عقیدہ بھی پیش کیا گیا۔ پولس نے حضرت عیسیٰ کے دوبارہ جی اٹھنے کو نہ صرف پوری شدت سے بیان کیا بلکہ اسے "عقیدۂ کفارہ" کی بنیاد اور پورے دین کا مدار قرار دیا:

"اور اگر مسیح زندہ نہیں ہوا تو ہماری منادی کا کوئی فائدہ نہیں، اور تمہارا ایمان لانا بھی بے فائدہ ٹھہرا۔ اگر مردوں کا جی اٹھنا ممکن نہیں تو کیا خدا نے مسیح کو بھی زندہ نہیں کیا، تو ہماری یہ گواہی کہ اس نے مسیح کو زندہ کیا' جھوٹی ٹھہری۔ اور اگر مسیح زندہ نہیں ہوا تو تمہارا ایمان بے فائدہ ہے، اور تم ابھی تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہو۔..... لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مسیح مردوں میں سے زندہ ہو گیا، لہٰذا وہ مردوں میں جی اٹھنے والا پہلا شخص ہے۔"(۲)

لیکن اگر بائبل کے بیانات کا جائزہ لیا جائے تو حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا اور وفات کے بعد دوبارہ زندہ ہونا دونوں باتیں خلاف قیاس اور حقیقت سے دور ہیں، کیونکہ انجیلی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ کے مبینہ طور پر صلیب پر چڑھائے جانے کی کوئی عینی شہادت موجود نہیں ہے، حتی کہ ان کے سبھی شاگرد بھی انھیں چھوڑ بھاگے تھے، انجیل نگاروں نے سنی سنائی باتوں کو اکٹھا کر کے جو کچھ لکھا ہے اس میں جا بجا تضادات واختلافات نمایاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کی ابتداء ہی سے متعدد افراد اور فرقے (مثلاً دوسیتی (Docetists)) اس بات کے قائل رہے ہیں کہ مسیح کو صلیب نہیں دی گئی، اور اگر صلیب دی گئی تو غدار حواری یہودا اسکریوتی کو یا شمعون کرینی کو جو مسیح کی صلیب کو اٹھا کر صلیب گاہ تک لے گیا تھا۔(۳)

عیسائی مؤرخ برنیٹ ہلمین اسٹریٹر (Brunet Hillman Streeter) نے اپنی مشہور کتاب "The Four Gospels" میں پطرس حواری کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

"Immediately he (i.e the Divine Christ) was taken up."(4)

---

(۱) گلتیوں کے نام خط ۳:۱۳ (۲) کرنتھیوں کے نام پہلا خط ۱۵:۱۳-۲۰

(3) Oxford Dictionary of the Church, p.409 & Encyclo. of Religion and Ethics vol.4 p.833

(4) The Four Gospels - A study of origins, P.25 (1930)

(فوراہی وہ (یعنی مسیح مقدس) اوپر اٹھا لیے گئے)

پطرس حواری کا یہ قول اس بات کا غماز ہے کہ حواریوں اور عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کے ہی توسط سے ان کے ''رفع آسمانی'' کا علم تھا، یہی وجہ ہے کہ صلیب کے موقع پر کوئی بھی حواری یا عیسائی وہاں موجود نہیں تھا، اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ سب کے سب بزدل اور ڈرپوک تھے اور مصیبت کے وقت انھوں نے حضرت عیسیٰ کا ساتھ چھوڑ دیا تو یہ بات دو چار حواریوں کے متعلق تو تسلیم کی جاسکتی ہے لیکن سارے حواریوں اور سبھی عیسائیوں کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا ناانصافی بھی ہے اور حقیقت کا انکار بھی، کیونکہ بعد کے حالات، یہودیوں کے مظالم، عیسائیت پر ان کی ثابت قدمی اور دعوت وتبلیغ کی راہ میں ان کی قربانیاں اس مفروضہ کی سختی سے تردید کرتی ہیں۔

فاضل مصنف نے پطرس کے جملہ کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ کا خدائی وجود ہے لیکن بقول علامہ تقی عثمانی مدظلہ:

> ''آسمان پر اٹھانے کے لیے صیغۂ مجہول (Passive Voice) استعمال ہوا ہے، (یعنی اس کو اوپر اٹھالیا گیا) اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اوپر اٹھانے والا کوئی اور تھا، اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد اگر خدا (یعنی حضرت عیسیٰ) ہوتا تو کہا جاتا ''وہ اوپر چلا گیا'' کیونکہ خدا کو کوئی نہیں اٹھا سکتا۔''(۱)

جس طرح حضرت عیسیٰ کو صلیب دیا جانا ایک ''امر مشکوک'' ہے اسی طرح بائبل کا مطالعہ یہ بھی کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ایسا کوئی جرم ہی نہیں کیا تھا کہ جس کی پاداش میں انھیں صلیب جیسی سنگین سزا دی جاتی، ان کا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قیصر کو محصول ادا کرنے کے مخالف تھے اور خود کو مسیح بادشاہ کہتے تھے۔(۲)

بالفرض اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ حضرت عیسیٰ قیصر کے خلاف بیان دیا کرتے تھے تو یقیناً رومی حکام اس بغاوت کا سختی سے نوٹس لیتے اور آپ کے خلاف خود کارروائی کرتے لیکن وہ تو آپ کو چھوڑنا چاہتے تھے، اور پیلاطس نے صاف کہہ دیا تھا: ''میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔'' اور یہ بھی کہا تھا: ''جن باتوں کا الزام تم اس پر لگاتے ہو ان کی نسبت نہ میں نے کچھ قصور پایا نہ ہیرودیس نے..... اس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہوا جس سے وہ قتل کے لائق ٹھہرتا۔''(۳)

اور یہ الزام اس لیے بھی بے بنیاد ہے کہ حضرت عیسیٰ تو اپنے مواعظ اور گفتگو میں کہا کرتے تھے: ''جو قیصر کا ہے قیصر کو، اور جو خدا کا ہے خدا کو دو۔''(۴)

جہاں تک دوسرے الزام کا تعلق ہے کہ حضرت عیسیٰ خود کو مسیحی بادشاہ کہتے تھے تو خود انجیل یوحنا میں اس کی تردید یوں موجود ہے: ''یسوع نے کہا ''میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں، اگر میری بادشاہت اس دنیا کی ہوتی تب

---

(۱) عیسائیت کیا ہے؟ صفحہ ۴۲
(۲) لوقا ۲۳:۲-۴، متی ۲۷:۳۷
(۳) لوقا ۲۳:۱۴-۱۵، مرقس ۱۵:۱۴، متی ۲۷:۱۷، ۱۸
(۴) متی ۲۲:۲۱

میرے خادم یہودیوں کے خلاف لڑے ہوتے تا کہ وہ مجھے یہودیوں کے حوالہ کریں لیکن میری بادشاہت کسی اور جگہ کی ہے''(۱) نیز یہودیوں کے نزدیک یہ ایک مذہبی جرم تھا جیسا کہ انھوں نے پیلاطس سے کہا: ''شریعت کے مطابق وہ قتل کے لائق ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا بنایا۔''(۲) اگر یہودیوں کے اس الزام کو تسلیم کرلیا جائے تو یہ ایسا سنگین جرم نہ تھا کہ رومی حکومت مداخلت کرتی اور صلیب جیسی سنگین سزا سناتی، کیونکہ یہ یہودیوں کا مذہبی معاملہ تھا، اور ان کے مذہبی اصول کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خود سزا دیں اور یہ سزا بھی سنگساری کی شکل میں ہو نہ کہ صلیب کی شکل میں، جیسا کہ عہد نامۂ قدیم میں کہا گیا ہے: ''اور جو خداوند کے نام پر کفر بکے ضرور جان سے مارا جائے، ساری جماعت اسے قطعی سنگسار کرے۔'' اور ان کے لیے یہ کوئی ناممکن عمل نہ تھا کیونکہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد اسٹیفن (Stephen) نامی مسیحی مبلغ کو توریت کے اسی حکم کے مطابق سنگسار کیا(۳) اس لیے ایسی صورت میں رومی حکومت کی مداخلت امن وامان کی بحالی اور انتظامی معاملات کی نگرانی کے طور پر ہوتی بس۔

خلاصۂ بحث یہ کہ اناجیل کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کا ایسا جرم ہی ثابت نہیں ہوا کہ جس کی سزا میں رومی یا یہودی قانون انھیں صلیب پر لٹکاتا، پس وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر صلیب کی کہانی کھڑی کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اہم واقعہ کا کوئی بھی معتبر چشم دید گواہ نہیں ہے!

اب رہا سوال حضرت عیسیٰ کے دوبارہ زندہ ہونے کا تو جس شخص کو صلیب ہی نہیں دی گئی اس کی موت کیسی؟ اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا چہ معنی دارد؟!

پھر بھی اگر بحث کی خاطر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دی گئی تو جس طرح ان کی مصلوبیت کا کوئی چشم دید گواہ نہیں اسی طرح ان کے دوبارہ جی اٹھنے کا بھی کوئی عینی شاہد نہیں ہے، چند عقیدت مند عورتوں (اس سلسلہ میں بھی اناجیل کے مابین اختلاف ہے) نے زیادہ سے زیادہ جو دیکھا وہ حضرت عیسیٰ کی خالی قبر تھی، اور ہر عقل سلیم کا مالک اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی قبر کا خالی ہونے کا لازمی مفہوم ''جی اٹھنا'' نہیں ہے، بلکہ متی کی روایت کے مطابق اس احتمال کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ قبر میں رکھی لاش کو اپنے یا پرائے ''چرا'' لے گئے ہوں۔(۴) اس کے علاوہ اناجیل اربعہ نے حضرت عیسیٰ کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہ کے طور پر ایک عورت کو پیش کیا ہے جس کا نام ''مریم مگدلین'' (Mary Magdalene) تھا، اور یہ وہی عورت ہے جو حضرت عیسیٰ کے پاس اس حال میں آئی تھی کہ وہ سات بدروحوں کا شکار تھی، نیز اس کا تذکرہ بدچلن عورتوں کے ضمن میں ہوا ہے، اور ''قاموس الکتاب'' کی وضاحت کے مطابق اس بیان کے بعد اس عورت کا کوئی تاریخی رکارڈ موجود نہیں ہے۔(۵)

---

(۱) یوحنا ۱۸:۳۶ (۲) لوقا ۱۹:۷، متی ۲۶:۶۳-۶۶ (۳) اعمال ۷:۵۷-۵۹
(۴) متی ۲۸:۱۳ (۵) مرقس ۱۶:۹، لوقا ۸:۲، قاموس الکتاب: ۹۰۶

اب یہ کہاں کی دانش مندی وفرزانگی ٹھہری کہ عیسائی دنیا اپنے اہم ترین عقیدہ کی بنیاد ایک ایسی عورت کی گواہی پر رکھے جس کا کردار بھی مشکوک اور جس کے حالات زندگی بھی معدوم؟!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت اور ان کا مر کر جی اٹھنا اس لیے بھی مشکوک ہو جاتا ہے کہ اناجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ مرنے کے تین دن رات بعد جی اٹھیں گے، اور اسی دعویٰ کے پیش نظر یہودیوں نے پیلاطس سے "مسیح کی قبر" کی نگرانی بھی "تیسرے دن" تک کرنے کو کہا تھا، اب سوال یہ ہے کہ کیا مسیح قبر میں تین رات دن تک رہے؟ اناجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ کو جمعہ کے دن صلیب دی گئی (۱) یوسف نے شام کو پیلاطس سے ان کی نعش مانگی، اس لیے وہ لامحالہ سنیچر کی رات کو دفن کیے گئے، سنیچر گذرنے کے بعد اتوار کو "صبح سویرے" کچھ عورتیں قبر پر آئیں تو انھوں نے قبر کو خالی دیکھا۔ (۲) اس حساب سے حضرت عیسیٰ قبر میں زیادہ سے زیادہ دو رات اور ایک دن رہے، نہ کی تین رات دن! اس وضاحت کے بعد یا تو حضرت مسیح کی مصلوبیت غلط ثابت ہوتی ہے یا ان کی پیشین گوئی!!

خلاصۂ بحث یہ کہ انجیلی بیانات میں حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت، ان کی تدفین، ان کا دوبارہ زندہ اٹھنا اور ان کی رؤیت کا سارا معاملہ شروع ہی سے تضادات، اختلافات، قیاسات اور توہمات پر مبنی ہونے کی وجہ سے شک وارتیاب کا باعث بنا رہا ہے، اور اسی حالت وکیفیت کو قرآن مجید نے اپنے اعجازی اسلوب میں صرف ایک جملہ سے تعبیر کیا ہے: ﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (لیکن انھیں شبہ میں ڈال دیا گیا)۔

ممکن ہے کہ عیسائی بائبل کے ان تضادات واختلافات کو "معمولی" سمجھ کر نظر انداز کر دیں یا ان پہلوؤں کو قابل اعتنا ہی نہ سمجھیں، لیکن یہ اعتراضات صاف چغلی کھاتے ہیں کہ انجیل نگاروں نے حضرت عیسیٰ کے مرنے اور جینے کے سلسلہ میں عوام میں پھیلے توہمات وقیاسات اور ان کی ضعیف الاعتقادی کو عملی جامہ پہنا دیا ہے، اور کوئی بھی غیر جانبدار فرد یا عدالت ایسے واقعات پر قطعی یقین نہیں کر سکتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں ایک طرف اناجیل کی روایات ہیں جو بیسیوں تضادات واختلافات سے بھری ہوئی ہیں، اور ان تضادات کو دور کرنے میں نئی نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور خود انصاف پسند عیسائی مؤرخین بھی ان اناجیلی روایات کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور دوسری طرف وہ قرآن مجید ہے جس کی صداقت و حقانیت کا اعتراف خود یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی ہے، اور حضرت عیسیٰ کی عیسائیت کا وہی تنہا اور قابل اعتماد ماخذ ہے، وہ کھلے لفظوں میں کہتا ہے:

---

(۱) اسی کی یاد میں عیسائی ایسٹر کا مقدس جمعہ (Good Friday) مناتے ہیں۔ (۲) متی ۱۲:۳۹-۴۰، متی ۲۷:۶۴۔

﴿ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴾

(اور ان کی یہ بات کہ ہم نے اللہ کے رسول مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کیا ہے جبکہ انھوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ صلیب دی البتہ ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا اور جو لوگ بھی ان کے سلسلہ میں اختلاف میں پڑے وہ ضرور ان کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں، اٹکل مارنے کے سوا ان کے پاس اس کا کوئی علم نہیں اور یہ طے شدہ ہے کہ انھوں نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے ان کو اپنے پاس اٹھالیا اور اللہ غالب ہے حکمت رکھتا ہے)

رسولوں کا عہد

حضرت عیسیٰ نے اپنے بارہ منتخب شاگردوں کو "رسول" (Apostles) کا لقب دیا تھا،[1] جب حضرت عیسیٰ کو (عیسائیوں کے بقول) صلیب پر چڑھایا گیا تو ان رسولوں میں سے اس وقت کوئی موجود نہ تھا، بلکہ خوف و دہشت کی وجہ سے انھوں نے روپوشی اختیار کر لی تھی، یا یوں کہیں کہ حضرت عیسیٰ کے رفع آسمانی کا علم ہونے کی وجہ سے کوئی وہاں نہ رکا اور اور حضرت عیسیٰ کے فراق میں اپنے گھروں میں بیٹھے رہے، لیکن جلد ہی انھیں اپنے راست باز اور مخبر صادق استاد کی زندگی یاد آئی، ان کی تعلیمات اور پیغامات نے ان کے دلوں پر مہمیز کیا، بہر تقدیر نور ایماں ان کے دلوں میں چمکا اور وہ پھر لوگوں میں نظر آنے لگے اور اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ جس امر عظیم کی بنیاد حضرت عیسیٰ نے ڈالی تھی اسے تکمیل تک پہنچائیں، گویا یہ عیسائیت کے سب سے پہلے "کلیسا" کا قیام تھا۔

لیکن جس طرح حضرت عیسیٰ کی زندگی میں یہودی ان کے مخالف تھے اسی طرح انھوں نے حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے رسولوں اور دیگر عیسائیوں کی مخالفت جاری رکھی، اور انھیں عیسائیت کی تبلیغ سے روکنے کی بھرپور کوششیں کیں، لیکن جب عیسائی باز نہ آئے تو بیت المقدس کے احبار و کاہنوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا، اور اسٹیفن (Stephen) نامی ایک شخص کو جو عیسائیت کا نہایت مضبوط اور پرجوش مبلغ تھا گرفتار کر کے سنگسار کر دیا، یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کے صرف ساڑھے تین سال بعد پیش آیا تھا، اس کے بعد عیسائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا، کوئی انھیں پناہ دینے کی جرأت نہ کرتا، گھر گھر تلاشی لی جاتی، جو مرد و عورت اس دین کا حامی ملتا وہ گرفتار کر لیا جاتا اور سخت قسم کی اذیتیں دی جاتیں، ان کارروائیوں سے عیسائیوں کی ہمتیں پست ہونے لگیں، ان کی زندگیاں خطرات میں گھر گئیں جن سے فرار کی یہی صورت تھی کہ وہ ارض مقدس سے ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ اکثر عیسائی مبلغ دوسرے

---

(۱) لوقا ۶: ۱۳۔ رسول (Apostle) یونانی لفظ "Opostolos" کا ترجمہ ہے جس کا مفہوم ہے "نمائندہ" (Delegate) (قاموس الکتاب: ۴۳۵)

علاقوں و منتقل ہونے لگے، لیکن وہ جہاں بھی گئے اپنے دعوتی مشن کو قائم رکھا، اور پورے جوش و عقیدت کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے، اس طرح تبلیغ کا جو کام پہلے فقط بیت المقدس کی چہار دیواری کے اندر محدود تھا وہ اب دیگر اور علاقوں میں بھی جاری ہو گیا، چنانچہ ان کے اخلاص و للہیت اور ان کی انتھک کوششوں کے نتیجہ میں تقریباً بیس سال کے عرصہ میں ہی عیسائیت فلسطین سے باہر روم کے چھوٹے بڑے شہروں میں دستک دینے لگی، پھر ان علاقوں میں مختصر جماعتوں کی شکل میں عیسائیت قائم ہوتی گئی۔

یہ مقامی عیسائی جماعتیں اصطلاحی طور پر "کلیسا" کے نام سے مشہور تھیں، یہ کلیسا اپنی روز مرہ کی زندگی میں رسولوں کی ہدایات کے مطابق کام کرتے تھے، اور انہیں کی جانب سے طے کردہ ذمہ داری کی سرپرستی میں دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے، دینی وحدت میں ایک دوسرے سے مربوط ہوا کرتے تھے، اور یہی وحدت عیسائیت کی اشاعت کا اہم ذریعہ بنی، انھیں مقامی کلیساؤں میں رومی سلطنت کی راجدھانی شہر روم کا کلیسا بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ پطرس حواری بھی روم پہنچے تھے اور انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے پطرس کو امت کی سربراہی کے لیے منتخب کیا تھا اس بنیاد پر "رومی کلیسا" کو دوسرے سبھی کلیساؤں سے ممتاز اور ان کا نگران اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا، دعوت و تبلیغ اور عیسائیت کی اشاعت کے اس دور کو "رسولوں کا عہد" (Apostolic Age) کہا جاتا ہے۔

رسولی عہد کے آغاز میں توحید کا صاف ستھرا عقیدہ موجود تھا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) خدا کے صرف پیغمبر تھے، ان کی الوہیت یا ابنیت کے نظریات وجود میں نہیں آئے تھے، تمام عیسائی اسرائیل ہی کے لوگ تھے اور شریعت موسوی کے پوری طرح پابند تھے، اور ہیکل سلیمانی کو ہی اپنا قبلہ تصور کرتے تھے، لیکن خدا کی مرضی کہ یہ حقیقی عیسائیت چند ہی سالوں بعد سینٹ پال کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن گئی اور حضرت عیسیٰ کی عیسائیت تاریخ کے صفحات میں بکھر کر گم ہو گئی اور اس کی جگہ سینٹ پال کی "مسیحیت" کو اشاعت عام حاصل ہوا، آج دنیا بھر میں اسی "مسیحیت" کا دور دورہ ہے۔

عیسائیت کی تدوین واشاعت

عیسائیت کی تعریف

آج دنیا بھر میں جو عیسائیت رائج ہے عیسائی دانشور اس کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں:

"Christianity: The religion founded by Jesus of Nazareth in the first century A.D. and centering in His life, mission and message"(1)

(عیسائیت وہ مذہب ہے جس کی بنیاد پہلی صدی میں مسیح ناصری نے رکھی، اور جس کا محور ان کی زندگی، مقصد حیات اور پیغام ہے)

مذکورہ بالا مختصر تعریف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امریکن پیپلز انسائیکلوپیڈیا کے فاضل مقالہ نگار جیمز ماس ٹیلر (James Masteller) لکھتے ہیں:

"Despite its various forms, Christianity can be recongnised by several concepts almost universally accepted: a belief in God as Creator, in the Bible as God's word, and Jesus as God's son and the final revelation of God to man in his perfect humanity, sacrificial death and miraculous resurrection and in his ability by this sacrifice and exaltation to mediate forgiveness, salvation and immortality to all those come unto God by him."(2)

(اپنی مختلف شکلوں کے باوجود عیسائیت کی پہچان اس کے متعدد عقیدے ہیں، جنھیں عیسائیوں کے یہاں عالمگیر قبول عام حاصل ہے، یعنی خدا کو خالق ماننا، انجیل کو خدا کا کلام ماننا، عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اور نوع انسان کے طرف آخری مجسم پیغام ماننا، حضرت عیسیٰ کو (خدا کے بیٹے کے علاوہ) مکمل انسان ماننا، ان کی قربانی پر مبنی موت اور معجزانہ طور پر جی اٹھنے پر یقین رکھنا، اور یہ تسلیم کرنا کہ اپنی قربانی اور رفع آسمانی کی بدولت ان تمام لوگوں کو معافی، نجات اور ابدی زندگی دلوانے پر قادر ہیں جو ان کے وسیلہ سے خدا کی طرف آئیں)

---

(1)The American People's Encyclopaedia,Chicago. vol.5, P.435

(2)The American People's Encyclo., Chicago. 1960, vol.5, P.435

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی عیسائیت

﴿وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾

(المائدۃ:۴۶)

(اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا ان سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے ہوئے اور ان کو ہم نے انجیل دی جس میں ہدایت تھی اور نور تھا اس طور پر کہ وہ بھی پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والی تھی اور ہدایت اور نصیحت تھی پرہیزگاروں کے لیے)

حضرت عیسیٰ کی رسالت حضرت موسیٰ و دیگر انبیاء کی رسالتوں کی ایک کڑی تھی، جس میں لوگوں کو اللہ کی عبادت اور تقویٰ کی تلقین کی گئی تھی، اسی لیے حضرت عیسیٰ کی دعوت میں بھی خدا کی وحدانیت اور شرک سے نفرت مشترک تھی، صرف خدائے واحد کی طاعت و عبادت پر زور تھا، اس کے احکام اور شریعت کی پابندی اور اخلاق فاضلہ و عادات حسنہ کی تلقین موجود تھی۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مخاطب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت عالمگیر رسالت نہ تھی بلکہ یہ رسالت بنی اسرائیل کے لیے مخصوص تھی، ان کی دعوت و تبلیغ کا مقصد صرف بنی اسرائیل کی اصلاح تھا، قرآن مجید میں صراحت سے موجود ہے:

﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ (آل عمران: ۴۹)

(اور وہ بنی اسرائیل کے لیے پیغمبر ہوگا (جو ان سے کہے گا) کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں)

اس قرآنی اعلام کی مزید وضاحت انجیل متی میں اس طرح ہے:

''میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں۔''(۱)

اس کی مزید وضاحت اس طور پر سمجھئے کہ بائبل میں متعدد جگہ پر دو لفظ مستعمل ہوئے ہیں: ''سب اقوام'' اور ''غیر اقوام''، سب اقوام سے مراد صرف بنی اسرائیل کے قبائل تھے، اور غیر اقوام یا قوموں سے مراد غیر بنی اسرائیل (Gentiles) تھے۔

---

(۱) متی/۱۵:۲۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت فلسطین میں یہودیوں کے صرف دو قبیلے آباد تھے، باقی دس قبیلے، جو کہ بخت نصر کی تباہی کے بعد مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے تھے، ان دس قبیلوں کو ''دس گمشدہ قبائل'' (Ten Lost Tribes of Israel) کہا جاتا تھا، حضرت عیسیٰ نے انہیں کو ''بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں'' سے تعبیر کیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پطرس کو تبلیغی مشن پر بھیجتے ہوئے کہا تھا:

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔''(۱)

ایک دوسرے موقع پر آپ علیہ السلام نے فرمایا:

''پس تم جا کر ''سب قوموں'' کو شاگرد بناؤ۔''(۲)

''سب قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اس کے نام سے کی جائے گی۔''(۳)

''سب قوموں'' اور ''غیر قوموں'' کے مابین اس فرق کو لوقا نے ''مختونوں'' اور ''غیر مختونوں'' کے الفاظ میں بھی بیان کیا ہے، اسرائیل کی سب اقوام ''مختون'' تھیں، اس کے برعکس غیر اقوام ''غیر مختون'' تھیں۔

''اور رسولوں اور بھائیوں نے جو یہودیہ میں تھے سنا کہ غیر قوموں نے بھی خدا کا کلام قبول کیا ہے، جب پطرس یروشلم میں آیا تو ''مختون'' اس سے بحث کرنے لگے کہ تو ''غیر مختونوں'' کے پاس گیا اور ان کے ساتھ کھانا کھایا۔''(۴)

اس تصریح کے بعد اس لازمی نتیجہ سے مفر نہیں کہ عیسائیت دراصل حضرت موسیٰ کی مخصوص شریعت کی تکمیل کے لیے آئی تھی، جو توحید اور بلند اخلاقی تربیت پر مشتمل تھی، اور یہی وہ حقیقی عیسائیت ہے جس کی تعلیم حضرت عیسیٰ نے دی تھی جو کہ آپ کی وفات کے چند برسوں بعد ہی ختم ہوگئی، اب عیسائیت کے نام پر جو کچھ ہے ان میں کذب وافتراء ہے اور مشرکانہ عقائد، باطل افکار ونظریات کا گورکھ دھندہ ہے اور بس!

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد

حضرت عیسیٰ کی تعلیم وتبلیغ کا بنیادی مقصد بنی اسرائیل کی اصلاح تھا، اس لیے انھوں نے الگ سے نہ کوئی شریعت پیش کی اور نہ کوئی جداگانہ عبادت گاہ قائم کی، بلکہ وہ عام یہودی عبادت گاہوں ہی میں عام طریقہ سے عبادت ودعا کرتے تھے، ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کے حواری بھی اسی طریقہ پر قائم رہے اور وہ یہودیوں کی عبادت گاہوں میں ہی عبادت کیا کرتے تھے، اسی طرح ان کی یہ بالکل کوشش نہ تھی کہ وہ یہودی مذہب سے الگ ایک نئے اور مختلف مذہب کی بنیاد رکھیں، اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

"The life of early Jewish disciples, so far as can be judged from our very meager resources, was very much the same as their fellows. They continued faithful to the established synagogue and temple worship, and did not think of founding a new sect or separating from the household of Israel"(5)

---

(۱) متی/۶:۵-۱۰ (۲) متی/۲۸:۱۹ (۳) لوقا/۲۴:۴۷ (۴) اعمال ۱۱:۱-۳

(5) Encyclopedia of Britanica, V. 5, P.676

(حضرت عیسیٰ کے بعد) ابتدائی یہودی مریدین - جہاں تک ہمارے پاس موجود (معلومات کے) قلیل وسائل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے - کی زندگی بہت حد تک اپنے باقی (یہودیوں) ساتھیوں سے مشابہ تھی، وہ بدستور قائم شدہ ہیکل کے وفادار اور یہودی عبادت گاہ میں عبادت کے پابند تھے، اور انھوں نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد رکھنے یا بنی اسرائیل کے گھرانہ سے علیحدگی کے بارے میں سوچا تک نہیں)

مذکورہ انسائیکلوپیڈیا کا ایک اور تبصرہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اور تحریفات سے قبل عیسائیوں کے حالات لکھتے ہوئے مقالہ نگار لکھتا ہے:

"Within judaism a new sect appeared, followers of Jesus of Nazareth, whom they affirmed to be Messiah and themselves to be the new and true Israel of God."(1)

(یہودیت کے اندر ہی ایک نیا فرقہ ظاہر ہو گیا تھا، یہ لوگ یسوع ناصری کے پیروکار تھے جسے وہ مسیح تسلیم کرتے اور خود کو نئے اور سچے (خدا کے منتخب) اسرائیلی قرار دیتے)

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری شریعت موسوی کے ہی پابند تھے، عیسائیت اور یہودیت دو الگ الگ مذہب نہیں تھے، لیکن جب ان کے درمیان سینٹ پال کا وجود ہوا، تو اس نے عیسائیت کو پوری طرح مسخ کر کے یہودیت سے بالکل جدا کر دیا پھر اسے ایک نئے مذہب کے سانچہ میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور پھر وہی عیسائیت پوری دنیا میں رائج ہوئی۔

سینٹ پال کی عیسائیت

جس عیسائیت سے آج دنیا متعارف ہے اس کا آغاز اس مخصوص شخص کے ہاتھوں ہوا ہے جسے عیسائیت کی تاریخ سینٹ پال (Saint Paul) کے نام سے یاد کرتی ہے جو اپنی ابتدائی زندگی میں ایک کٹر یہودی اور مسیحیت کا بہت بڑا دشمن تھا۔

سینٹ پال کا اصلی نام ساؤل (Saul) تھا (یعنی خدا سے مانگا ہوا) جو کہ عبرانی لفظ ہے تاہم اس کی حقیقی شہرت اس کے رومی لقب "پولس" سے ہوئی۔ (۲)

پولس (سینٹ پال) یہودی النسل ہونے کے لحاظ سے رومیوں کی غلام قوم سے تعلق رکھتا تھا، اسے رومی سلطنت کے مکمل شہری حقوق حاصل تھے جس کا اس نے اپنی تبلیغ کے دوران خوب فائدہ اٹھایا، اور اس دوران اس نے اپنا رومی نام پولس ہی استعمال کیا، اس کے خطوط میں بھی یہی نام درج ہے۔

---

(1) Ibid, V.17, P.470

(۲) پولس لاطینی لفظ پاولوس (Paulus) کی یونانی شکل ہے۔ دیکھئے: قاموس الکتاب: ۱۹۹

پولس عیسائیوں کا سخت جانی دشمن تھا، شب و روز انھیں تکلیفیں پہنچاتا اور ان کی بیخ کنی میں مصروف رہتا، باقی یہودیوں کی طرح وہ بھی عیسائیوں پر ہونے والے مظالم میں شریک ہوتا، گھر گھر گھس کر مردوں اور عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر قید کرواتا۔ اس سلسلہ میں اس نے یہودی مذہبی رہنماؤں سے چیدہ چیدہ عیسائیوں کو گرفتار کرنے کا اجازت نامہ بھی حاصل کیا اور پھر اپنی اس مہم کو انجام دینے کے لیے وہ دمشق کی طرف روانہ ہوا، راستہ میں اس کے بقول اس نے ایک نور دیکھا جس سے یہ آواز آئی: اے شاؤل! اے شاؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے''؟ اس نے پوچھا اے خداوند! تو کون ہے؟ اس نے کہا ''میں یسوع ہوں جسے تو ستاتا ہے''۔ (۱)

یہاں یہ بھی خیال رہے پولس کے ساتھیوں میں سے کسی نے نہ کوئی نور دیکھا اور نہ آواز سنی، جیسا کہ خود پولس ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے ساتھیوں نے نور تو دیکھا لیکن جو مجھ سے بولتا تھا اس کی آواز نہ سنی،'' اور دوسری جگہ لکھا ہے ''جو آدمی اس کے ہمراہ تھے وہ خاموش کھڑے رہ گئے کیونکہ آواز تو سنتے تھے مگر کسی کو دیکھتے نہ تھے۔'' (۲)

اس ''مکاشفہ'' کے بعد پولس کی دنیا ہی بدل گئی، اس کی زندگی کو ایک نیا مقصد مل گیا، جو شخص اب تک عیسائیت کا سخت ترین دشمن تھا وہ عیسائیت کا ایک مضبوط پشت پناہ بلکہ اس کا عظیم داعی و مبلغ بن کر سامنے آیا۔

ملاحظہ

یہاں ایک اشکال کا پیدا ہونا بالکل طبعی ہے کہ وہ پولس جو عیسائیت کا سخت ترین دشمن تھا اچانک عیسائیت کا بانی کیسے بن گیا؟ جس چیز کا وہ سخت مخالف تھا اسی کا مصدر و مرجع کیسے قرار پایا؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ کیا کوئی شخص بغیر کسی ظاہری سبب کے عداوت سے محبت کی طرف یکبارگی ایسی جست لگا سکتا ہے، اور مخالفت کو چھوڑ کر اس دین پر ایمان لا سکتا ہے چہ جائیکہ وہ اس دین کا رکن رکین اور مضبوط ستون بن جائے؟!

پولس کے اس ''مکاشفہ'' کو عام عیسائی مبنی بر صداقت سمجھتے ہیں اور اسی کو اس کی تبدیلی مذہب کی بنیاد گردانتے ہیں لیکن محققین نے واضح کیا ہے کہ اس کی نظریاتی تبدیلی اتنی بھی اچانک نہ تھی۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں یہ عبارت موجود ہے:

"What appears to be a sudden conversion had no doubt been the last stage of a long preparatory process."(3)

(جو چیز بظاہر اچانک ایک تبدیلی عقائد معلوم ہوتی ہے، وہ بلاشبہ ایک طویل تمہیدی عمل کا آخری مرحلہ تھی)

بہر حال اس مکاشفہ کے بعد پولس نے پوری شدت کے ساتھ عیسائیت کی دعوت و تبلیغ شروع کی جس سے

---

(۱) اعمال/۹:۳-۶ (۲) تفصیل کے لیے دیکھئے: بائبل سے قرآن تک: ۱/۴۲۷

(3) Encyclopedia of Britanica, V.17, P.470

حضرت عیسیٰ کے حواری بھی ناواقف تھے، اس نے عیسائیت کی تبلیغ واشاعت میں کبھی بھی حضرت عیسیٰ کے اقوال کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ اس نے عیسائیت کی تعلیم کسی بھی حواری سے حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ یسوع مسیح سے براہ راست اور بلاواسطہ تعلیم حاصل کرتا ہے، اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ اس کی تعلیمات کے سوا کوئی اور تعلیم قبول کرے۔ (۱) حالانکہ اس کی تعلیمات کا حقیقی مصدر یونانی فلسفہ اور اور اس زمانہ کے بعض توہم پسند مشرکانہ مذاہب تھے۔ وہ اپنی تبلیغ کو بڑی بے تکلفی سے ''میری خوش خبری'' یا ''میری انجیل'' (My Gospel) کہتا تھا۔

پولس بحیثیت رسول

عیسائی ادب میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں کو ''رسول'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جو کہ یونانی لفظ ''Opostolos'' کا ترجمہ ہے یعنی نمائندہ (Delegate) (۲)

"Apostles: messengers; name given especially to those first selected by Christ."(3)

(رسول یعنی پیغام رساں، خاص کر حضرت عیسیٰ کے ذریعہ ابتدا میں منتخب کردہ افراد کو دیا گیا نام)

یہ رسول یا حواری وہ لوگ تھے جنھیں حضرت عیسیٰ نے اپنی زندگی میں نامزد کیا تھا، لیکن پولس نے اس مکاشفہ کے بعد خود کے رسول ہونے کا اعلان کر دیا، حالانکہ وہ رسول ہونے کے اس معیار پر بھی نہیں اترتا تھا جو یہودا اسکریوتی کی غداری کے بعد حواریوں نے اپنی بارہ کی تعداد پوری کرنے کے لیے بنایا تھا، (۴) چونکہ پولس ایک سخت گیر یہودی تھا اور عیسائیوں پر ہمیشہ ظلم کیا کرتا تھا اس لیے ابتداء میں دیگر رسولوں نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور اور اس کے مکاشفہ کو بھی تسلیم نہیں کیا مگر برناباس کی سفارش پر جسے وہ اپنا مخلص ساتھی گردانتے تھے انھوں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

اخیر ایام میں حضرت عیسیٰ کے مخلص حواری انھیں ''چھوڑ کر بھاگ گئے تھے''، جس کے بعد انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ کو صلیب دے دی گئی، اس بات کا انھیں سخت صدمہ تھا اور ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ یہودی روایات کے مطابق صلیب کی سزا پانے والے کو ''ملعون'' ماننا پڑتا تھا، لیکن پولس نے ان کی شمولیت اختیار کرنے کے بعد انھیں سمجھایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''لعنتی موت'' نہیں مرے، بلکہ ''گناہ کے کفارہ'' کے طور پر انسانیت

---

(۱) تیمتھیس کے نام پہلا خط (۲) قاموس الکتاب: ۴۳۵

(3) The New Catholic Dictionary *(Apostles)*

(۴) یعنی خداوند یسوع کے بپتسمہ سے لے کر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے تک برابر ان کے ساتھ رہا ہو اور ان کے جی اٹھنے کا گواہ ہو۔ (اعمال/۱:۲۱-۲۲)

پر قربان ہو گئے ہیں، اس وضاحت نے ان کا نفسیاتی مسئلہ حل کر دیا اور اس طرح پولس حواریوں اور دیگر عیسائیوں کے لیے قابل قبول بنتا گیا۔

پولس ایک یہودی عالم تھا اور ایک ایسے گھرانہ سے تھا جو یونانی تمدن اور علوم عقلیہ سے بھی بہرہ ور تھا، اس کے علاوہ اسے پیدائشی طور پر رومی شہریت بھی حاصل تھی چنانچہ اپنی صلاحیت اور خاندانی پس منظر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے پورے جوش وخروش سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی، اور اپنے مکاشفوں کو بنیاد بنا کر اس نے ایک نئی عیسائیت سے دنیا کو روشناس کرایا، اور حضرت عیسیٰ کی پیش کردہ عیسائیت کو پوری طرح مسخ کر کے اس میں الوہیت وابنیت، کفارہ، یہودی شریعت کی عملاً منسوخی کے جراثیم داخل کر دیے، اور یہ کام اس نے نہ صرف اپنی زبانی تبلیغ سے کیا بلکہ مختلف شہروں میں عیسائی نمائندوں کو تبلیغی خطوط لکھ کر ان کی اشاعت کی، بعد میں یہی خطوط بائبل کا حصہ اور مروجہ عیسائیت کی بنیاد قرار پائے۔

آج یہ یقین اور دعوی سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جو تعلیم دی تھی مروجہ عیسائیت میں وہ تعلیمات یکسر بدل چکی ہیں، ان کے توحید کے درس کو بدل کر خود حضرت عیسیٰ کو معبود کا مقام دے دیا گیا، اور "اقانیم ثلاثہ" (Trinity) کا ناقابل فہم فلسفہ وضع کیا گیا، اسی طرح ان کی توحید وآخرت کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر ازلی گناہ اور کفارہ کے عقائد وضع کیے گئے، جن مشرکانہ عقائد ومراسم کو مٹانے کے لیے حضرت عیسیٰ تشریف لائے تھے آج وہی عقائد اس مذہب کی شناخت بن چکے ہیں اور پوری عیسائیت یونان کے ان فلسفوں پر آ کر ٹک گئی ہے جنھیں حقیقت کی دنیا میں بہت پہلے ہی رد کیا جا چکا تھا۔

فلسفہ وتاریخ کے نامور فاضل ول ڈیورانٹ (Will Durant) کا یہ موزوں جملہ بھی اس مناسبت سے مبنی بر حقیقت ہے:

"Christianity did not destroy paganism, it adopted it"(1)

(مروجہ) عیسائیت نے قدیم مشرکانہ مذاہب کو ختم نہیں کیا بلکہ ان کو اپنے اندر سمو لیا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ظاہری نسبت کے باوجود موجودہ عیسائیت' ان کی بتائی ہوئی اور ان کے حواریوں کی اختیار کی ہوئی عیسائیت سے کس حد تک دور جا چکی ہے، اس کا اندازہ ایک عیسائی فاضل کے اس تبصرہ سے بخوبی ہوتا ہے:

"There is a great difference between the Christian religion and Christ's religion, between the structure of dogma erected by Greek philosophy on

---

(1)The Story of Civilisation by Will Durant, Vol.3, P.595

a Jewish soil, and the faith held by Christ Himself."(1)

(مسیحی مذہب اور مسیح کے مذہب میں عظیم فرق ہے، (اول الذکر) عقائد کا ایک مجموعہ ہے جو یونانی فلسفہ نے یہودی بنیادوں پر تعمیر کیا ہے، جبکہ (دوسرا) وہ (سادہ) عقیدہ ہے جو مسیح خود رکھتے تھے)

مذکورہ حقائق ودیگر تحقیقات کی بنیاد پر مشہور جرمن مفکر نطشے (Nietzsche) نے پولس کو "عیسائیت کا موجد" (Inventor of Christianity) کا لقب دیا ہے۔ اور انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ نگار وردے ودیگر مصنفین ومفکرین نے اسے بجا طور پر کلیسائی عیسائیت کا بانی قرار دیا ہے:

"Founder of ecclesiastical Christiantiy as distinct from the Christianity of Jesus"(2)

(کلیسائی عیسائیت کا بانی جو کہ عیسیٰ کی عیسائیت سے مختلف وبعید ہے)

پولس کی مخالفت

یہاں یہ سوال اٹھنا فطری ہے کہ جس وقت پولس دین مسیح میں تبدیلیاں کر رہا تھا اور اس کے عقائد کو مسخ کر کے ایک نئی شکل میں ڈھال رہا تھا تو حواریوں نے اس کی مخالفت کیوں نہ کی؟ کیا انھوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی؟ بائبل اور تاریخ کلیسا کا جواب ہے کہ ایسا نہیں ہوا، حواریوں نے اس کی مخالفت کی اور اپنی بساط بھر خوب کی لیکن پولس اتنا شاطر اور عیار تھا کہ وہ اپنے نظریات کی اشاعت عقیدت کے رنگ میں اور متصوفانہ وذو معنی الفاظ کے ذریعہ کرتا تھا، اس لیے عام لوگوں کے لیے اس کے حقیقی منشاء ومراد کو سمجھنا آسان نہ تھا، اور جہاں تک حواریوں کا تعلق ہے تو پولس نے ان سے واسطہ ہی کم رکھا۔ (۳) اس کے باوجود مختلف مسائل پر اس کی سخت مخالفت ہوئی۔

حضرت عیسیٰ کے حواری عیسائیت کو ایک نئے مذہب کے بجائے یہودیت کے اندر ایک اصلاحی تحریک سمجھتے تھے، اور اسے یہودیوں تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے، مگر پولس کا اصرار تھا کہ غیر یہودیوں کو بھی اس میں شامل کیا جائے، بالآخر پولس کی کوششوں اور اس کی فلسفیانہ موشگافیوں سے اس کی رائے غالب آئی، لیکن پھر بھی بعض حواری ودیگر اولین عیسائیوں کی جانب سے پولس کے نظریات کی مخالفت ہوتی رہی۔

حواریوں ودیگر اولین عیسائیوں کی جانب سے پولسی نظریات کی مخالفت کے متعلق پروفیسر آرنلڈ میئر (Arnold Meyer) لکھتے ہیں:

---

(1) Christianity And History by Adolf Harnak: Introductory note to the english Translation by Bally Saunders, P.15

(2) Encyclopedia of Britanica, Vol.17, P.395

(۳) گلتیوں کے نام خط/۱:۱۶-۱۹، ۲:۱

"The first Christians, indeed, regarded St. Paul's mission to the gentiles, together with his liberal attitude towards the law, as an innovation, as such they either tolerated or attacked it: and St. Paul himself does not judge of it otherwise, he is, indeed, proud of the fact that here he goes his own way in the power of divine revelation. In Antioch he demonstrates even to St. Peter that he the "Pillar-apostle" did not yet comprehend the liberty of the Gospel and the significance of Christ."(1)

(اولین عیسائی: غیر قوموں کی طرف پولس کے مشن اور شریعت کے متعلق اس کی آزادانہ روش کو فی الحقیقت بدعت تصور کرتے تھے، لہٰذا وہ اس بدعت کو یا تو برداشت کرتے یا اس پر حملہ آور ہوتے اور مقدس پولس کا اس کے بارے میں اپنا فیصلہ بھی مختلف نہ تھا، بلکہ وہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ خدائی کشف والہام کے تحت اس نے اس سلسلہ میں اپنا راستہ خود بنایا ہے، انطاکیہ میں مقدس پطرس پر اس نے واضح کیا کہ وہ "اعظم الحواریین" ہونے کے باوجود نہ تو انجیل کی دی ہوئی آزادی کو سمجھا ہے اور نہ مسیح کی اہمیت کو)

حواریوں سے پولس کا اختلاف معمولی نوعیت کا نہ تھا، بلکہ اس بنا پر لوگوں میں تفرقہ بھی ہوا اور جھگڑے بھی ہوئے اور دیگر اولین عیسائی الگ الگ گروہوں میں بٹ گئے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی حضرت عیسیٰ کے حواری ان پڑھ اور معمولی درجہ کے سادہ لوح لوگ تھے، پطرس اور یوحنا وغیرہ ماہی گیری کیا کرتے تھے، ان کے مقابل میں پولس ایک پڑھا لکھا یہودی اور یونانی علوم وافکار کا واقف تھا، وہ اپنے نظریات اتنی شدت سے پیش کرتا کہ حواریوں کے لیے اس کی عقلی تردید کرنا آسان نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ حواری اپنی سادہ مزاجی کی وجہ سے نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بلند خیالی کو سمجھ پائے اور نہ پولس کی الٰہیاتی موشگافیوں کو ہی سمجھنا ان کے لیے آسان تھا۔

پولس اپنے نظریات کو پوری طاقت سے بیان کرتا اور ان نظریات کی تردید کرنے والوں اور اس کے برعکس تعلیم دینے والوں کی تعلیم وتبلیغ کو "بے کار کی باتیں" قرار دیتا(۲)، اور اپنے متبعین سے کہتا کہ "ان بے وقوف لوگوں سے دور رہو جو بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں جو خدا کی طرف سے نہیں، ان آدمیوں سے دور رہو جو سچائی کے خلاف بحث کرتے ہیں، وہ لوگ ان باتوں کو "علم" کہتے ہیں حالانکہ وہ علم نہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں انھیں "علم" ہے، ایسے لوگ سچے ایمان کو چھوڑ چکے ہیں۔"(۳)

گلتیوں کے نام اپنے ایک خط میں لکھتا ہے: "میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر دوبارہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی سوائے اس سچی انجیل کے جس کو تم حاصل کر چکے ہو دوسری کتاب شائع کرے۔ وہ ملعون ہے۔"(۴)

---

(1) Jesus or Paul? By Arnold Meyer,P.98

(۲) تمتھیس ۱:۶-۷ (۳) تمتھیس ۶:۲۰-۲۱ (۴) گلتیوں ۱:۹

''حواری اعظم'' پطرس کو پولس کے نظریات سے اطمینان نہیں تھا، اس نے بھی پولس کے نظریات کی مخالفت کی:

"The disciple Peter was among those who insisted upon keeping the movement exclusive Jewish. But, later, when Paul became a Christian, he persuaded Peter and others to admit gentiles into the group."(1)

(حواری پطرس ان لوگوں میں شامل تھا جو اس تحریک کے خالصۃً یہودی رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ مگر جب بعد میں پولس عیسائی ہوا تو اس نے پطرس اور دوسرے لوگوں کو آمادہ کیا کہ غیر قوموں کو بھی اس جماعت میں شامل ہونے دیا جائے)

پولس نے اپنے مکتوب میں پطرس پر سخت تنقیدیں کیں اور اسے ''منافق'' کہا(۲) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولس کے زیر اثر عیسائی تذکرہ نگاروں نے اس حواری اعظم کو گمنامی کے پردے میں دھکیل دیا، چنانچہ ''قاموس الکتاب'' کا مؤلف لکھتا ہے:

''غیر یہودیوں پر نجات کے دروازے کھلنے اور مسیحیت کے پھیلنے کے ساتھ پطرس پس منظر میں چلا جاتا ہے اور پولس رسول غیر قوموں کے رسول کے طور پر ابھرتا ہے، اعمال کی کتاب میں پطرس کا آخری بار ذکر یروشلم کی کانفرنس کے سلسلہ میں آتا ہے۔''(۳)

پولس خود اپنے مقام کی وضاحت کرتا ہوا کہتا ہے:

''جس طرح یہودیوں کو خوشخبری سنانے کا کام پطرس کے سپرد ہوا اسی طرح غیر یہودیوں کو خوشخبری سنانے کا کام میرے سپرد ہوا۔''(۴)

پولس کے عقائد ونظریات

پولس نے عیسائیت میں ایسے بیشمار عقائد پیدا کیے جو حضرت عیسیٰ کی عیسائیت سے بالکل مختلف تھے، ان عقائد کا تذکرہ عہد نامۂ قدیم (توریت وزبور) میں بھی نہیں ملتا، ان عقائد کو لے کر پولس کے حامی ومخالف رہنماؤں کے مابین زبردست کشمکش ہوتی رہی جو تیسری صدی کے آغاز تک قائم رہی، چوتھی صدی کے آغاز میں رومی شہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے عیسائیت قبول کرلی، جس کے بعد حکومت کی سرپرستی میں پولسی عقائد ونظریات کو کبھی فلسفیانہ ومنطقیانہ دلائل سے تو کبھی زور زبردستی کر کے نافذ کر دیا گیا اور پھر پوری عیسائی مملکت میں وہی سکہ رائج ہوا جو پولس کے ٹکسال سے ڈھل کر نکلا، اس دوران وقتہ وقتہ سے مخالفت میں آوازیں اٹھیں لیکن وہ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں، اور آج تاریخ کے کسی گوشہ میں ان کی صرف بازگشت ہی سنی جاسکتی ہے۔

پولس نے عیسائی مذہب کی بنیاد جن عقائد ونظریات پر رکھی تھی کلیسا نے اپنے عہد میں انھیں کو عیسائیت کی

---

(1) Ross and Hills: Great Religions By Which Men Live p.137.

(۲) گلتیوں کے نام خط/۲:۱۱-۱۳ (۳) قاموس الکتاب:۱۹۲ (۴) گلتیوں کے نام خط/۲:۷

بنیادوں میں شامل کرلیا اور اس سلسلہ میں اختلافات کے دروازوں کو پوری شدت کے ساتھ بند کردیا، اب ان عقائد سے سرمو انحراف کرنے والوں کو عیسائی علماء اپنی برادری سے خارج اور ملحد و کافر قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہی وہ عقائد ہیں جن کی بنیاد پر موجودہ عیسائی مذہب دیگر مذاہب سے امتیاز رکھتا ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام عقیدوں میں سے کوئی ایک بھی عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی ارشاد سے ثابت نہیں، اس کے برعکس ایسے اقوال کی تعداد بے شمار ہے جن سے ان عقائد کی تردید ہوتی ہے، اب یہ کج فہمی اور کور باطنی کے سوا اور کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حقیقی تعلیمات کو چھوڑ کر پوری عیسائی دنیا پولس کے نظریات سے چمٹی ہوئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے، جس عقیدت و محبت کو دعویٰ کرتا ہے اس کا نقطۂ ارتکاز حضرت عیسیٰ کے بجائے پولس کی ذات ہے!

نوٹ

پولس نے جو عقائد و نظریات پیش کیے ان کے دلائل بائبل میں بھی مل جائیں گے لیکن اس سے ان کی صداقت اس وجہ سے ثابت نہیں ہوسکتی کہ بائبل خود مشکوک ہے، اور اگر اس میں پولس کی حمایت میں "آیتیں" موجود ہیں تو اس کی مخالفت میں بھی ہیں، نیز یہ واضح رہے کہ بائبل کی ترتیب و تدوین یا اس کی تحریفات میں کلیسا کے نظریات کی مکمل رعایت برتی گئی ہے، بالفاظ دیگر کلیساؤں کا دارومدار بائبل کی تعلیمات پر نہیں بلکہ بائبل کا مدار کلیسائی نظریات پر ہے، جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کی وضاحت ہے:

"What we have in the Gosples would then be what the church itself was teaching and saying ascribe to the historical Jesus."(1)

(جو کچھ ہمارے پاس اناجیل میں موجود ہے وہی ہے جو خود کلیسا کہہ اور بتا رہا تھا، جسے مسیح کی تاریخی شخصیت سے منسوب کردیا گیا)

اس وضاحتی نوٹ کے بعد ذیل میں پولس کے وضع کردہ بنیادی عقائد کا مختصر تذکرہ و تجزیہ ملاحظہ ہو:

الوہیت مسیح

پولس نے حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا دروازہ آپ کی ذات اور آپ کے مقام کے بارے میں اپنے متوصوفانہ (Mystical) تبصروں سے کھولا، اس سلسلہ کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

"مسیح ان دیکھے خدا کی صورت ہے، اور تمام مخلوقات سے پہلے موجود ہے، اسی کے وسیلہ سے خدا نے سب کچھ خلق کیا ہے..... وہ سب چیزوں میں سب سے پہلے ہے اور اسی میں سب چیزیں قائم رہتی ہیں۔" (۲)

---

(1) Encyclopedea of Britanica. Vol.13,P.14

(۲) کلسیوں کے نام خط/۱:۱۵-۱۷

''مسیح جو خدا کی صورت ہے''۔ ''ہم اپنے متعلق تبلیغ کو نہیں پھیلاتے بلکہ ہم یہ تبلیغ اس لیے کرتے ہیں کہ یسوع مسیح ہمارا خداوند ہے۔''(۱)

''مسیح خود ہر چیز میں خدا کے جیسا تھا، مسیح خدا کے مساوی تھا۔''(۲)

اس طرح پولس حضرت عیسیٰ کو خدائے واحد کی خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ حضرت عیسیٰ کو اپنا ''خداوند'' اور خود کو اس کا ''بندہ'' بھی قرار دیتا ہے، جبکہ خود بائبل میں جا بجا خدا کی وحدانیت اور اس کے توحید کی دعوت موجود ہے۔

پولس اپنی تحریروں میں معبود حقیقی کے لیے خدا (God) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خداوند (Lord) کا لفظ استعمال کرتا ہے:

''ہمارے نزدیک تو ''خدا'' (God) ایک ہی ہے جو آسمانی باپ ہے، اور سب چیزوں کا خالق ہے اور ہم اسی کے لیے جیتے ہیں۔ ایک ہی ''خداوند'' (Lord) ہے یعنی یسوع مسیح جس کے وسیلہ سے سب چیزیں پیدا ہوئیں، اور ہم بھی اسی کے وسیلہ سے موجود ہیں۔''(۳)

پولس نے اپنی تبلیغ اور اپنی تحریروں میں روم کے فلسفیانہ مزاج سے بھرپور استفادہ کیا اور پھر اسی کے ذریعہ حضرت عیسیٰ کو خدائی صفات کا حامل بتانے کی کوشش کی ہے، جبکہ اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات بالکل واضح اور صاف ستھری موجود ہیں، نیز خود بائبل میں جا بجا حضرت عیسیٰ کی بشریت، بشری کمزوریوں اور بشری تقاضوں کو بیان کیا گیا اور سب سے بڑھ کر خود عیسائی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی موت اور موت سے قبل ان کی بیچارگی، کم مائیگی و بے بضاعتی ان کی بشریت کی اعلیٰ دلیل ہے، اس کے بعد بھی حضرت عیسیٰ کی حقیقی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر پولس کی تعلیمات سے چمٹے رہنا سوائے گمراہی و ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں!

عقیدۂ کفارہ

پولس رومیوں کے نام خط میں لکھتا ہے:

''جس طرح ایک ہی شخص (یعنی آدم) کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گناہ گار ٹھہرے، اسی طرح ایک (یسوع) کی فرمانبرداری سے بہت سے لوگ راست باز ٹھہریں گے۔''(۴)

قبول عیسائیت کے ابتدائی زمانہ میں پولس کا نظریہ باقی عیسائیوں کی طرح یہی تھا کہ نجات کے لیے توبہ اور عمل کی ضرورت ہے، لیکن جب ''ان کے عقیدہ کے مطابق'' حضرت عیسیٰ کو صلیب دے دی گئی تو پولس اور حواریوں کو یہودی عقیدہ کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا جس کے مطابق جسے صلیب کی سزا دی جاتی ہے وہ خدا کی طرف سے

---

(۱) کرنتھیوں کے نام خط/۴:۴-۵
(۲) فلپیوں کے نام خط/۲:۶
(۳) کرنتھیوں کے نام خط/۸:۶
(۴) رومیوں کے نام پولس کا خط/۵:۱۹

''ملعون'' ہوتا ہے، تو کیا ان کا ''خداوند'' (نعوذ باللہ) ملعون تھا؟

اس قباحت سے بچنے کے لیے پولس نے یہ نظریہ وضع کیا کہ آدم کے گناہ کا اثر اور اس کا نتیجہ ان تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ ازلی گناہ (Original Sin) ان کی ساری اولاد کو گنہگار کر گیا، اور اس کا کفارہ انسان کے بس کی بات نہ تھی، کیونکہ انسان شر کے باعث ناپاک ہو چکا تھا اور ناپاک کی قربانی قابل قبول نہیں، اس لیے کفارہ کی صرف یہی صورت تھی کہ خدا خود سطح زمین پر آئے اور اس ازلی گناہ کا کفارہ ادا کر کے اولاد آدم کو اس سے رہائی دلائے، چنانچہ خدا کا بیٹا خداوند یسوع مسیح زمین پر آیا، اور صلیب پر اپنی جان دے کر آدم کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کر گیا، اور یہ کفارہ قبول ہو گیا۔

یہ نظریہ رومی معاشرہ کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ خدا، خدا کے فرزند، ان کی بیویاں نہ صرف یونان بلکہ ساحل روم کے ہر معاشرہ میں انسانی ہیئت میں پیدا ہوتے، مرتے، پھر زندہ ہوتے اور اپنا مشن پورا کر کے آسمان پر چلے جاتے تھے۔

پولس کے اس نظریہ سے ایک طرف حضرت عیسیٰ کی بیچارگی، بے بسی اور مسکینیت کی توضیح ہو گئی اور دوسری طرف یونانی و رومی ذہن کے لیے اس کے تصورات کے عین مطابق عقیدہ بھی فراہم ہو گیا۔

اس ''عظیم کفارہ'' سے قبل انسان کو اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف مجاہدے کرنے پڑتے تھے، مگر اب صرف حضرت عیسیٰ پر ایمان لانا کافی تھا۔ بعد کی صدیوں میں پولس کے نظریۂ گناہ و کفارہ کو اس طرح استوار کیا گیا کہ وہ عیسائی عقائد کی بنیاد بن گیا۔

عمل سے خلاصی

پولس کہتا ہے:

''ہم اب آزاد ہیں، مسیح نے ہمیں آزاد رکھا ہے، لہٰذا اس کو بنائے رکھو اور پھر سے شریعت کی غلامی کے شکار نہ بنو۔''(۱)

عقیدۂ کفارہ کی آڑ میں پولس نے اصل مسیحی تعلیم پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ اس نے شریعت اور عمل کی اہمیت ہی ختم کر دی، اور صرف اپنے بتائے ہوئے عقائد پر ایمان و یقین کو ہی مذہب کی مدار قرار دیا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

''شریعت کا ایمان سے واسطہ نہیں اس کا راستہ مختلف ہے۔''

شریعت سے ہم پر لعنت ہے لیکن اس لعنت سے چھٹکارہ دلانے کے لیے مسیح وہ لعنت لے لیتا ہے۔''

---

(۱) گلتیوں کے نام خط/۵:۱

''آدمی راست باز صرف شریعت پر عمل کر کے نہیں بلکہ یسوع مسیح پر ایمان لا کر ہی خدا کے نزدیک راستباز کہلاتا ہے۔''(۱)

''شریعت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتے ہیں، شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے۔''(۲)

بپتسمہ

بپتسمہ یا اصطباغ (Baptism) یہ عیسائی مذہب کی پہلی رسم ہے، اس کے بغیر کسی انسان کو عیسائی نہیں کہا جا سکتا، اس کی پشت پر بھی پولس کا ''عقیدہ کفارہ'' ہی کارفرما ہے، عیسائی عقیدہ کے مطابق بپتسمہ لینے سے انسان یسوع مسیح کے واسطہ سے ایک بار مر کر دوبارہ زندہ ہوتا ہے، موت کے ذریعہ اسے ''ازلی گناہ'' کی سزا ملتی ہے، اور نئی زندگی سے اسے آزاد قوت ارادی حاصل ہوتی ہے۔ بپتسمہ کے طریقوں میں بپتسمہ کے پانی میں غوطہ دینا (Immersion) یا پانی انڈیلنا (Pouring) یا پانی چھڑکنا (Sprinkling) شامل ہے۔

ازلی گناہ کے اثرات کا ساری نسل انسانی کی طرف منتقل ہونے کا تصور نہ صرف عقل سلیم بلکہ بائبل کی تعلیم کے بھی خلاف ہے، کوئی عقل یہ نہیں کہتی کہ مجرموں کو ''پاک'' کرنے کے لیے کسی معصوم کو موت کی سزا دی جائے۔

ایک طرف عیسائیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے پوری انسانیت کی طرف سے ''گناہ آدم'' کا کفارہ ادا کر دیا، دوسری جانب حضرت عیسیٰ کی اس عظیم قربانی کا فائدہ انھیں کو حاصل ہوگا جنھوں نے مخصوص طریقہ پر بپتسمہ لیا ہو۔

بپتسمہ کی اہمیت اور اس سلسلہ میں ان کی شدت کو آگسٹائن اور اس کے ہمنواؤں کے اس فقرہ سے سمجھئے:

"Infants dying in infancy are justly condemned to eternal punishment."(3)

(جو بچے (بغیر بپتسمہ) لیے مر گئے، ان کے لیے ابدی عذاب عین انصاف ہے)

گویا حضرت عیسیٰ نے گناہ آدم کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے جو قربانی پیش کی وہ صرف اور صرف انھیں کے لیے ہے جنھوں نے بپتسمہ لے کر عیسائیت قبول کی ہو، اس کا سیدھا اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا ''عظیم الشان احسان'' صرف عیسائیوں پر ہوا اور باقی ماندہ پوری انسانیت اس سے محروم رہی!

عشائے ربانی

بپتسمہ کا تکملہ عشائے ربانی (Lord's Supper) ہے، یعنی عیسائیوں کی وہ اہم ترین رسم جس میں شرکت کا مجاز ہر وہ عیسائی ہے جو بپتسمہ لے کر دائرۂ عیسائیت میں داخل ہو چکا ہو، بپتسمہ سے قبل اس میں شرکت کی اجازت نہیں۔

---

(۱) گلتیوں کے نام خط/۳:۱۱-۱۲ _/۲:۱۶ (۲) رومیوں کے نام خط/۴:۱۵

(3) Encyclopedia of Religion and Ethics, V.5, P.644

یہ رسم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مبینہ قربانی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے، بائبل کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے اپنی گرفتاری سے ایک دن قبل اپنے حواریوں کے ساتھ رات کا کھانا کھایا تھا، کھانے کی اس مجلس کا حال انجیل متیٰ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

''جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو یسوع نے روٹی اٹھائی اور خدا کا شکر ادا کیا اور اس کو توڑ کر کہا کہ ''اس کو اٹھا لو اور کھاؤ اور اپنے شاگردوں کو یہ کہہ کر دیا کہ یہ میرا جسم ہے'' پھر یسوع نے مے کا پیالہ اٹھایا اور اس پر خدا کا شکر ادا کیا اور کہا ''یہ کوئی اس کو پی لے، یہ نئے عہد نامہ کو قائم کرنے کا میرا خون ہے، اور یہ بہت سے لوگوں کے گناہوں کی معافی و بخشش کے لیے بہایا جانے والا خون ہے''(۱)

لوقا اپنی انجیل میں اس واقعہ پر اتنا اضافہ کرتا ہے:

''اور کہا مجھے یاد کرنے کے لیے تم اس طرح کرو۔''(۲)

اس رسم کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ اتوار کو کلیسا میں ایک اجتماع ہوتا ہے، شروع میں کچھ دعائیں اور نغمے پڑھے جاتے ہیں، پھر حاضرین ایک دوسرے کا بوسہ لے کر مبارک باد دیتے ہیں، اس کے بعد روٹی اور شراب لائی جاتی ہے، پادری (صدر مجلس) باپ بیٹے اور روح القدس سے برکت کی دعا کرتا ہے، اور حاضرین آمین کہتے ہیں، دعا کے بعد روٹی اور شراب کو حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اس عمل سے روٹی فوراً مسیح کا بدن بن جاتی ہے اور شراب مسیح کا خون، اور تمام حاضرین اسے کھا پی کے اپنے ''عقیدۂ کفارہ'' کو تازہ کرتے ہیں۔(۳)

یہ بات عرصۂ دراز تک بحث و تکرار کا موضوع رہی ہے کہ روٹی اور شراب کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے مسیح کے بدن اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ اسی سے حاضرین کی ضیافت بھی کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں جب پروٹسٹنٹ (Protestant) فرقہ ظاہر ہوا تو اس نے ان اصطلاحات کو حقیقت پر محمول کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور اس رسم کو محض حضرت مسیح کی قربانی کی یادگار کے طور پر باقی رکھا۔

یہاں تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آج ایک طرف عیسائی معاشرہ شراب کے مہلک جراثیم کے تعفن کا شکار ہے، اور وہ اس لعنت سے چھٹکارہ کی تدبیریں کر رہا ہے، اس کی روک تھام کے قوانین بنائے جا رہے ہیں، مختلف سیمینار اور کانفرنسیں ہو رہی ہیں، شراب کی تباہ کاری سے لوگوں کو باور کرایا جا رہا ہے اور دوسری طرف وہی شراب ان کے مذہب میں بھی شامل ہے، اور ہر ہفتہ عبادت خانوں میں اس کی محفلیں منعقد بھی ہوتی ہیں، اور تو اور خود ان کا ''خداوند'' اپنے ہاتھوں سے اپنے محبوب شاگردوں کو شراب کے جام بھی دیتا ہے، تعجب خیز!

---

(۱) متی/۲۶:۲۶-۲۸ (۲) لوقا/۲۲-۱۹ (۳) عیسائیت کیا ہے؟ صفحہ نمبر ۶۰

صلیب کی تقدیس

عقیدۂ کفارہ اور حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت کو تسلیم کرنے کے بعد صلیب کی تقدیس کو تسلیم کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ یہ صلیب ہی ہے جس کے ذریعہ حضرت عیسیٰ نے پوری انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا تھا۔

چوتھی صدی عیسوی تک صلیب کو تقدس کا درجہ حاصل نہیں تھا، شاہ قسطنطین کے بارے میں روایت ہے کہ 312ء میں اپنے ایک حریف سے جنگ کے دوران اس نے خواب میں شعلہ بار صلیب (Flaming Cross) کا نشان دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ حضرت عیسیٰ نے اسے ایک جھنڈا دیا ہے جس پر صلیب بنا ہوا ہے، اور فرمایا کہ تو اس جھنڈے کو ساتھ لے کے جس میدان میں بھی جائے گا فتحیاب ہوگا۔ اس خواب کے بعد اس نے اسی طرح کا جھنڈا بنوایا، اور اس کو اپنے لشکر کے آگے کیا، اسی جھنڈے نے پہلے پہل حضرت عیسیٰ کو "لڑائی کے دیوتا" کی شان میں نمودار کیا، سب سپاہیوں کو حکم دیا کہ اپنے ہتھیاروں اور اپنے ڈھالوں وغیرہ پر صلیب بنائیں، اس نشان سے اس مدبر و دور اندیش بادشاہ نے بہت فائدہ اٹھایا کہ عیسائی سپاہی اس صلیبی جھنڈے کے نیچے مافوق العادت جوش سے لڑتے تھے، اول تو صلیب خود ہی ایک قہر و غضب کا نشان تھی پھر اس کے ساتھ مسیحیوں کے مذہبی جوش نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ دوسری ہی لڑائی سے یہ حالت ہوگئی کہ اس کے دشمن اس ہیبت ناک جھنڈے کو دیکھتے ہی ڈر جاتے تھے۔ اسی زمانہ سے صلیب عیسویت کا نشان بن کے کلیسا میں داخل ہوگئی، اور گرجوں کے محرابوں میں اور عالیشان عمارتوں کے برجوں پہ چمکنے لگی۔ (۱)

پھر 326ء میں قسطنطین کی ماں سینٹ ہلینا (St. Helina) - جو مسیحیت سے خاصا متاثر تھی - کو کہیں سے ایک صلیب دستیاب ہوگئی، جس کے بارے میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ یہ وہی صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ کو سولی دی گئی تھی، بس اس کے بعد سے ہی صلیب کو زبردست تقدس حاصل ہوا اور یہ مسیحیوں کا شعار (Symbol) بن گیا۔ صلیب کی عظمت و تقدس کا اندازہ مشہور عیسائی عالم ٹرٹولین (Tertullian) کے اس قول سے لگانا بالکل آسان ہے:

> *"At each journey and progress, at each coming in and going out, at the putting on of shoes, at the bath, at meals, at the kindling of lights, at bedtime, at sitting down, whatsoever occupation engages us, we mark our foreheads with this sign of the cross." (2)*

(ہم سفر و حضر اور آمد و رفت کے موقع، جوتے اتارتے وقت، نہاتے وقت، کھانا کھاتے اور شمعیں روشن کرتے وقت،

---

(۱) تاریخ ارض مقدس: ۱۲۸-۱۳۱ ملخص/ مولانا مولوی عبدالحلیم شرر (مشہور مؤرخ و ناول نگار)

(2) http://www.newadvent.org/cathen/13785a.htm

سوتے وقت اور بیٹھتے وقت غرض ہر حرکت وسکونت کے وقت ہم اپنی پیشانی پر صلیب کا نشان بناتے ہیں)

عقیدۂ حلول وتجسم

عقیدۂ کفارہ کا لازمی نتیجہ عقیدۂ حلول وتجسم کا اعتراف بھی ہے یعنی یہ تسلیم کرنا کہ بیٹا جو کہ خداوند ہے اس نے حضرت عیسیٰ کی شکل میں ایک جسم اختیار کیا، پھر اس میں حلول کیا اور پھر صلیب پر قربان ہوکر پوری انسانیت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عیسائیوں کے نزدیک "بیٹے" کا حضرت عیسیٰ میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ "بیٹا" خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے وہ پہلے صرف خدا تھا، اب انسان بھی ہو گیا۔

اس تمہید کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص خدا بھی ہو اور انسان بھی، خالق بھی ہو اور مخلوق بھی، اعلیٰ بھی ہو اور ادنیٰ بھی؟ عقیدۂ تثلیث کی طرح یہ عقیدہ بھی صدیوں سے بحث وتمحیص کا موضوع رہا ہے، اور اس عقدۂ لاینحل کے حل کی جس قدر کوششیں کی گئیں یہ عقیدہ اتنا ہی گنجلک ہوتا گیا۔

حلول وتجسم کے اس عقیدہ کے سلسلہ میں انجیل یوحنا کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے، اس انجیل کے آغاز میں یہ عنوان ہے: "مسیح کی دنیا میں آمد"، اور پھر انجیل کی شروعات اس طرح ہوتی ہے:

"دنیا کی ابتداء سے پہلے کلام وہاں تھا، کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا، وہ ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا، سب چیزیں اس کے ذریعہ پیدا ہوائیں۔"(۱)

اس کے بعد یہ لکھا ہوتا ہے:

"کلام نے انسان کی شکل لی اور ہم میں رہا، ہم نے اس کا جلال دیکھا جیسا کہ باپ کے اکلوتے بیٹے کا جلال، کلام سچائی اور فضل سے بھرپور تھا۔"(۲)

یہاں یہ واضح رہے کہ اناجیل اربعہ اور خصوصاً انجیل یوحنا حضرت عیسیٰ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے لمبے عرصہ بعد لکھی گئی ہیں جبکہ اس وقت تک پولس کے عقائد ونظریات اصل عیسائی عقائد پر غالب آچکے تھے۔

نیز خود عیسائیوں میں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنھوں نے اس عقیدہ کی سختی سے مخالفت کی اور یہ واضح کیا کہ حضرت عیسیٰ صرف ایک مخلوق تھے، چنانچہ مشہور مفکر "پال آف سموسٹا" (Paul of Samosta) حلول کے عقیدہ کا انکار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حضرت مسیح کے وجود میں خدا کے حلول کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے ایک غیر شخصی عقل عطا ہوئی تھی:

(۱،۲) یوحنا/۱:۱-۳، یوحنا/۱:۱۴

"...as a mere manin whom the impersonal divine wisdom or logos manifested itself."

(From Christ to Constantine. London 1936)

اور دوسرا مشہور عیسائی عالم لوسین (Lucian) نے حلول کے عقیدہ کو اس طور پر پیش کیا کہ خدا کی صفت علم ان میں حلول کر گئی تھی لیکن یہ حلول ایسا نہ تھا کہ حضرت مسیح کو خدا، خالق، قدیم، اور جاودانی بنادے بلکہ اس حلول کے باجود خدا بدستور خدا رہا، اور حضرت عیسیٰ بدستور مخلوق۔

"Lucian and his school regarded him as a heavenly being who was created by God out of nothing, in whom the divine logos becomes personal, who, at the incarnation, assumed a human body, but not a human soul, and whose mission it was to reveal the father. But he was not God in the absolute sense and was not eternal."

(From Christ to Constantine, London 1936)(1)

پال اور لوسین کے نظریات سے متاثر ہوکر چوتھی صدی عیسوی میں مشہور عیسائی مفکر آریوس (Aryus) نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف زبردست جنگ لڑی اور پوری عیسائی دنیا کو متوجہ کیا اور تہلکہ مچا دیا، اگرچہ اس کی پاداش میں اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن اس کے حامی ومؤیدین ہمیشہ سرگرم رہے اور ملک بدر ہونے کے بعد دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل کر آریوسی نظریات کی تبلیغ کرتے رہے، اس کے نظریات کا خلاصہ "جیمس میک کنن" (James Mackinon) کے الفاظ میں یوں تھا:

"آریوس اس بات پر زور دیتا تھا کہ صرف خدا ہی قدیم اور جاودانی ہے، اور اس کا کوئی ساجھی نہیں، اسی نے بیٹے کو پیدا کیا جبکہ وہ پہلے معدوم تھا، لہٰذا نہ بیٹا جاودانی ہے اور نہ خدا ہمیشہ سے باپ، کیونکہ ایک وقت ایسا تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا، بیٹا باپ سے بالکل الگ ایک حقیقت رکھتا ہے، اور اس پر تغیرات واقع ہو سکتے ہیں، وہ صحیح معنی میں خدا نہیں ہے، البتہ اس میں "مکمل" ہونے کی صلاحیت موجود ہے، وہ ایک مکمل مخلوق ہے، ایک عقل مجسم جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے، اس طرح اس کے نزدیک مسیح ایک ثانوی خدائی کا حامل ہے، یا یوں کہہ لیجیے نیم دیوتا جو خدائی اور انسانیت دونوں کی صفات سے کسی قدر حصہ رکھتا ہے لیکن بلند ترین معنی میں خدا نہیں ہے۔"

گویا اس کی نظر میں حضرت مسیح کی حیثیت یہ تھی

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔"(۲)

عقیدۂ تثلیث

عیسائی عقائد میں خدا تین اقانیم (Pesrons) سے مرکب ہے؛ باپ، بیٹا اور روح القدس، اور اسی مرکب کو

(۱-۲) عیسائیت کیا ہے؟ صفحہ ۳۵

تثلیث (Trinity) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

باپ

باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے جو بیٹے کے وجود کے لیے اصل (Princple) کا درجہ رکھتی ہے۔ مشہور عیسائی فلسفی سینٹ تھامس (St.Thomas) نے باپ کی تشریح اس طرح کی ہے:

''باپ کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے کسی کو جنا ہے اور کوئی ایسا وقت گذرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے، جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کی اصل ہے، ورنہ جب باپ موجود ہے اس وقت سے بیٹا موجود ہے، اور ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی اولیت حاصل نہیں ہے۔''(۱)

بیٹا

بیٹے سے مراد خدا کی صفت کلام (Word of God) ہے، کلمہ (Logos) ابتدا میں خدا کی ایک صفت تھی لیکن یونانی فلاسفر فائلو (Philo) نے اس کو ایک مستقل بالذات ہستی اور خدا کا نقش اول قرار دیا ہے، اس کے خیال میں خدا نے براہ راست تخلیق عالم کا کام انجام نہیں دیا ہے بلکہ پہلے کلمہ کو تخلیق کیا اور پھر اس کی وساطت سے دنیا پیدا کی، اس طرح گویا کلمہ ایک خدائے ثانی تھا۔ خدا کی یہ صفت حضرت عیسیٰ کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی۔(۲)

روح القدس

روح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور صفت محبت ہے، یعنی اس صفت کے ذریعہ خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے۔ یہ صفت اپنا جوہری وجود رکھتی ہے، اور باپ و بیٹے کی طرح قدیم و جاودانی ہے، اسی وجہ سے اسے مستقل اقنوم (Person) کی حیثیت حاصل ہے، حضرت عیسیٰ کے انتقال کے بعد یہ صفت آتشیں زبانوں کی شکل میں حواریوں پر نازل ہوئی تھی۔

ان تینوں میں ہر ایک خدا اور اور تینوں مل کر تین خدا نہیں بلکہ ایک ہی خدا ہے، اس کا مطلب ہوا: تثلیث فی التوحید (تین ایک میں) اور توحید فی التثلیث (ایک تین میں) اسی کو کہتے ہیں Trinity۔(۳)

تثلیث کا عقیدہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں شامل ہے، اس عقیدہ کی تدوین چوتھی صدی عیسوی کے بعد سے عیسائیوں کی ''شریعت ساز کونسلوں'' کے ذریعہ ہوتی رہی، اور بالآخر قسطنطنیہ کی کونسل (منعقدہ 381ء) میں یہ اعلان کر دیا گیا:

(۱-۲) یہودیت، عیسائیت اور اسلام: ۱۷۱/ شیخ احمد دیدات (۳) دیکھئے: اعمال/۲:۱-۲۲۔ عیسائیت کیا ہے؟ صفحہ: ۱۶

"The Father is God, The Son is God and the Holy spirit is God, and yet they are not three God but one God"(1)

(باپ بھی خدا ہے، بیٹا بھی خدا ہے اور رسول بھی خدا ہے تاہم وہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے)

اس عقیدہ کو آخری شکل کونسل کے ذریعہ دی گئی لیکن اس کا بنیادی تخیل خود پولس نے ہی پیش کیا تھا، چنانچہ اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے:

''خداوند یسوع کا فضل اور خدا کی محبت اور روح القدس کی شراکت تم سب کے ساتھ ہوتی رہی۔''(۲)

عیسائی متکلمین اور دینیات کے عالموں نے اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں ایک طرف اس کوشش میں کھپادیں کہ تثلیث کے اس عقیدہ کو تین الگ الگ خدا کے تصور سے پاک رکھیں کیونکہ عیسائیت توحید پرستاری اور شرک بیزاری کی داعی ہے، اور دوسری طرف ایک اُلوہیت میں تین صورتوں (باپ، بیٹا، روح القدس) کا اختصاص بھی ثابت کردیں، کیونکہ یہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے، لیکن جب رد وقبول پر بحثیں طول پکڑتی گئیں تو کلیسا نے یہ فیصلہ دے دیا کہ تثلیث حق ہے اور اس کی مخالفت الحاد ہے، اور اس کی حقیقت انسانی فہم سے بالاتر ایک بھید ہے جس میں مزید موشگافیوں کی گنجائش نہیں!

عقیدۂ تثلیث کا پس منظر

یونان وروم کے فلسفہ میں تثلیث کا نظریہ بہت پہلے سے موجود تھا، جس کا مصدر افلاطون کا فلسفہ تھا، افلاطون اور اس کے پیروکاروں کے نزدیک ماہیت خداوندی (Divinenature) کی تین حیثیتیں تھیں جنھیں وہ سبب اول (First Cause) حکمت وکلام (Reason of Logos) اور روح کائنات (The Spirit of the Universe) کی حیثیت سے بیان کرتے تھے، اس فکرہ نے باقی بت پرستوں کو بھی متاثر کیا تھا اور ان کے عقائد میں تین اقنوم کا نظریہ اثر انداز ہوتا گیا، عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے صدیوں قبل یہ عقیدہ رائج ہو چکا تھا مثال کے طور پر:

اسوری تثلیث (Assyrians Trinity):

(1) Ashur: باپ (2) ElGar: بیٹا (3) Ishtar: ماں

شامی تثلیث (Syrian Trinity):

Haddad (1) Targatis (2) Simios (3)

روی تثلیث (Roman Trinity):

Jupetor (1) Venus (2) Mercury (3)

---

(1) Encyclopedia of Britanica Vol.22, P.479

(۲) کرنتھیوں کے نام پولس کا دوسرا خط/۱۳:۱۴

ہندستانی تثلیث(Hindu Trinity):

(1)Brahma:خالق(2)Vishnu:قائم رکھنے والا(3)Shiva:تباہ کرنے والا (۱)

تثلیث کا عقیدہ دراصل بت پرستانہ فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ ''عقیدۂ اوتار'' کی بازگشت ہے، اور اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ خدا کی ذات یا صفات بشکل انسانی کائنات ارضی میں وجود پذیر ہوسکتی ہے۔ چنانچہ پولس اور پھر اس کے متبعین نے عیسائیت کو اس طرح پیش کیا کہ بت پرستوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں معلوم ہوئی بلکہ انھیں اس کے اندر ایک کشش محسوس ہوئی، کیونکہ اس کے اندر وہی عقائد ونظریات تھے جس سے وہ پہلے سے متعارف تھے، یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث پر روم کے بت پرست عیسائیوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تثلیث کی یہ راہ خود رومی بادشاہوں نے طے کرائی ہے اور ان کی دلچسپی کے نتیجہ میں اس عقیدہ کو فروغ حاصل ہوا، عیسائی پادریوں نے تو بس اس پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی اس دلیل کے ساتھ کہ مقدس پولس نے بہت پہلے ہی یہ تعلیمات پیش کردی تھیں۔

بائبل میں اگر پولس کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو اس کا ایک ہی منشور تھا کہ جیسے بھی ہو لوگوں کو مسیحیت میں داخل کیا جائے، وہ خود لکھتا ہے:

''میں یہودیوں کو جیتنے کے لیے یہودی جیسا بنا تا کہ یہودیوں کو جیت سکوں، جو لوگ شریعت کے ماتحت ہیں ان کے لیے میں اس آدمی کی طرح شریعت کے ماتحت ہوا تا کہ شریعت کے ماتحتوں کو جیت سکوں، وہ لوگ جو شریعت کے ماتحت نہیں' میں ان کی طرح ویسا آدمی بنا۔'' (۲)

''اہم چیز یہ ہے کہ وہ لوگوں سے مسیح کے متعلق کہتے ہیں، مجھے خوشی ہے کہ وہ لوگ مسیح کے متعلق کہیں، خواہ کسی سبب سے ہو، یا سچائی سے یا جھوٹے بیانوں سے۔'' (۳)

قرآن مجید نے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے اسے کفر میں شامل کیا ہے:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنْ لَمْ يَنتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ (المائدۃ:۷۳)

(یقیناً وہ کافر ہوئے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین کا تیسرا ہے جبکہ ایک معبود کے سوا کوئی بھی معبود نہیں، اور اگر وہ اپنی باتوں سے باز نہیں آتے تو ان میں کفر کرنے والے ضرور دردناک عذاب کا مزہ چکھیں گے)

ختنہ کی منسوخی

ختنہ شریعت موسوی کا ایک اہم ترین حکم تھا جس کا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ اسلام سے چلا آرہا تھا، یہودی

---

(۱) فارقلیط اسمہ احمد بجواب فارقلیط از پادری وکلف اے سنگھ:۵۳/حکیم محمد عرفان ثاقب

(۲) کرنتھیوں کے نام خط/۹:۲۰،۲۱ (۳) فلپیوں کے نام خط/۱:۱۸

اس پر سختی سے کاربند تھے، چنانچہ ان کے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو آٹھویں دن اس کی ختنہ کرائی جاتی، اسی دستور کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ختنہ ہوا:

''بچہ جب آٹھ دن کا ہوا تو اس کی ختنہ ہوئی، پھر اس کا نام یسوع رکھا گیا۔''(۱)

یہودی شریعت کے اس حکم کا پابند خود پولس بھی تھا، وہ خود اپنے ختنہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میری پیدائش کے آٹھ دن بعد میرا ختنہ کروایا گیا، میں اسرائیل کے لوگوں کے بنیامین خاندان سے ہوں، میں عبرانی ہوں، میرے والدین بھی عبرانی تھے، موسیٰ کی شریعت میرے لیے بہت اہم تھی، اسی لیے میں فریسی ہوا۔''(۲)

ختنہ کی رسم اصولی طور پر نومولود بچہ کے لیے تھی، لیکن یہودی علماء بائبل کے حکم کے مطابق عیسائیت میں داخل ہونے والے ہر شخص کے لیے اسے لازمی قرار دیتے تھے، یہ عمل چونکہ لوگوں کے لیے ایک تکلیف دہ عمل تھا اس لیے ''غیر اقوام'' نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا، چونکہ پولس کا بنیادی مقصد کسی بھی صورت میں لوگوں کو عیسائیت میں داخل کرانا تھا اس لیے اس نے احکام شریعت کی پاسداری کو لعنت قرار دے کر صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کو کافی قرار دیا اور ختنہ کے سلسلہ میں وضاحت کر دی کہ اصل ختنہ تو روح کا ختنہ ہے، جسمانی ختنہ کی کوئی ضرورت نہیں، اس طرح اس نے اس حکم کو ہی منسوخ کر دیا:

''ختنہ صحیح وہی ہے جو دل کا ہے اور مقدس روحانی ہے، لکھی ہوئی شریعت سے نہیں۔''(۳)

گلتیوں کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

''سنو! میں پولس ہوں اور تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم ختنہ کرواکر پھر پرانی رسموں کے پیچھے چلو گے تو مسیح سے تمہیں فائدہ نہیں ہوگا۔''(۴)

پولس کی کامیابی

پولس اپنے فلسفیانہ مزاج، وسعت معلومات اور تخریبی واختراعی ذہن کی مدد سے اپنے نظریات دور دور تک پہنچانے اور شائع کرنے میں کامیاب ہوا، دور ونزدیک کے بہت سے لوگوں تک عیسائیت کا پیغام اسی کے ذریعہ پہنچا اور لوگوں نے اس پیغام کو حقیقی عیسائیت سمجھ کر قبول کر لیا۔

یروشلم کے لاکھوں تارکین وطن بحر روم کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے، پولس اور اس کے نمائندے انطاکیہ، اسکندریہ، کورنتھ اور روم کے باشندوں کے پاس عیسائیت کا پیغام لے کر پہنچے جسے انھوں نے جلد ہی قبول کر لیا، کیونکہ پولس نے عیسائی اعتقادات اس انداز میں ڈھالے تھے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوں:

---

(۱) لوقا/۲:۲۱ (۲) فلپیوں کے نام خط/۳:۵
(۳) رومیوں کے نام خط/۲:۲۹ (۴) گلتیوں کے نام خط/۵:۱

فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) بھی بیان کرتا ہے:

"Through the efforts of Paul and the Early Christian Fathers; Christinity was so Hellenized as to make it palatable to Greeks and Romans."(1)

پولس کی کامیابی میں روم کے سیاسی و مذہبی حالات اور وہاں کے فلسفیانہ ذوق و مذاق کا بھی دخل تھا، مذہبی کھوکھلا پن اور شعور کا فقدان کسی بھی نئے مذہبی فلسفہ کو قبول کرنے کے لیے بالکل تیار تھا، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رومی باشندوں کا مزاج جدت پسندی و تجدد پسندی کا عادی ہو چکا تھا اور اپنے جسم و روح کی تسکین کے لیے انھیں کسی ایسے مذہب کی ضرورت تھی جو ان کے فلسفیانہ مزاج سے بھی ہم آہنگ ہو۔

مشہور مؤرخ کولن ولسن (Colin Wilson) روم کی تہذیبی ثقافتی ماحول کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر ہم روم میں عیسائیت کے پھیلنے کی وجہ جاننا چاہیں تو اس نکتہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ روم کی تہذیب و ثقافت اور اس کی مذہبی بنیادوں میں مادیت کے عناصر پیوست تھے، رومی مذہب مضحکہ خیز حد تک لکیر کا فقیر بن چکا تھا، مثلاً روم کے باشندے سمجھتے تھے کہ سینیٹ میں دیا ہوا ان کا ایک ووٹ ان کے آنجہانی شہنشاہ کو دیوتاؤں کے دربار میں پہنچا دے گا، اس کے علاوہ روم کا مذہب روم کا حقیقی مذہب بھی نہ تھا بلکہ سارا کا سارا قدیم یونان سے ماخوذ تھا، نیز رومن ادب، رومن آرٹ، رومن فلسفہ سب کی سطح بہت ہی ہلکی تھی، رومن کلچر میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو کسی صاحب تخیل کو متاثر کر سکے، جبکہ عیسائیت انسانی زندگی میں گہرے معانی تلاش کرنے کی ایک تڑپ تھی)۔ (۲)

رومی سلطنت گہرے طبقاتی فرق و امتیاز کا شکار تھی، ساری خوشحالی و فارغ البالی حاکم طبقہ کا حصہ تھی، اور مفلوک الحال عوام ضروریات زندگی سے بھی محروم تھے، بے شبہ معاشی بدحالی سے دماغ ماؤف ہو جاتے ہیں اور مزاج میں قنوطیت شامل ہو جاتی ہے، ایسے حالات میں مذہب ہی سب سے مضبوط سہارا ہوتا ہے، لیکن روم کے بت پرست مذہب میں ظاہری کشش بھی باقی نہ بچی تھی جس کی وجہ سے روم میں مذہبی سرگرمیاں تقریباً ٹھپ ہو گئی تھیں اور دلوں کی انگیٹھیاں سرد ہو چکی تھیں، فلاسفہ نے اس خلا کو بھرنا چاہا اور وجدانی ارتقاء اور اور عقلی تربیت کے ذریعہ جذبات میں پاکیزگی اور رفعت پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ فکر کی لذت میں لوگ جسم کے مطالبات بھول جائیں، ایسے حالات میں پولس نے فلسفہ کی آمیزش کے ساتھ جو مذہب پیش کیا وہ دل و دماغ، عقل و روح دونوں کے لیے یکساں تسکین کا سامان تھا۔

اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ دینی مظالم کے دوران دو مختلف رجحانات سامنے آئے، کچھ عیسائی اپنے اوپر مظالم کی تاب نہ لا سکے اور روم کی بت پرستی میں داخل ہو گئے لیکن ان کے دل و دماغ اور ان کی ہمدردیاں

---

(1) Syria-A Short History, P.91

(2) A Criminal History Of Mankind by Colin Wilson, P.131

مسیحیت کے ساتھ وابستہ رہیں، اسی طرح روم کے بہت سے بت پرستوں نے عیسائیت کو اختیار تو کرلیا لیکن وہ اپنی بت پرستی کے اثرات کو زائل نہ کر سکے، اور یہ دونوں طبقے روم کے فلسفیانہ ماحول ونظریات میں ہی پرورش پا رہے تھے، اس امتزاج کے نتیجہ میں رومی بت پرستی اور عیسائیت میں ایک ہم آہنگی پیدا ہوائی، اور اس طرح مذہب نما فلسفہ یا فلسفہ نما مذہب نے وہاں کی حیاتیاتی اور نفسیاتی فضا کو اپنے لیے ہموار اور ہم آہنگ پایا اور عیسائیت کو فروغ عام حاصل ہوا۔

صرف تین صدی کے اندر ہی اندر عیسائیت نے روم کے ہر طبقہ میں رسوخ حاصل کرلیا تھا، نامساعد حالات کے باوجود اس نے پھیلنا شروع کیا، اور مشرق کی طرف نہ صرف شام، ایشیائے کوچک، آرمینیا بلکہ ایران کی سرحد تک اس کے ماننے والے پیدا ہو گئے، گرچہ بعض شہروں میں وہ اقلیت میں ضرور تھی لیکن کچھ علاقوں میں اسے بھاری اکثریت بھی حاصل تھی، اسی طرح جنوبی روس، بلقان، اور مشرقی یورپ کے بعض علاقوں میں بھی عیسائیت کے قدم اسی وقت پہنچ گئے تھے، مغرب میں اٹلی کے بیشتر شہروں میں روم کے براہ راست توسط سے عیسائی جماعتیں سرگرم ہو چکی تھیں، اس کے علاوہ جنوبی فرانس، اسپین اور انگلینڈ تک عیسائیت کے اثرات پہنچ چکے تھے، جنوب میں شمالی افریقہ کے قرطاجنہ اور مصر میں اسکندریہ پہلی صدی کے بعد ہی سے عیسائی مراکز کی حیثیت سے نمایاں اہمیت کے حامل ہو گئے تھے، اور یہیں سے ان علاقوں میں تبلیغ کا کام جاری رہا، اور پھر چوتھی صدی کے آغاز ہی میں روم کے سرکاری مذہب کے طور پر عیسائیت نے ابھرنا شروع کیا جس کے بعد اس کا اثر ورسوخ پھیلتا ہی چلا گیا۔ (۱)

حامی ومخالف فرقے

پولس کے عقائد ونظریات چونکہ اصل عیسائیت سے بالکل مختلف تھے اس لیے ان کی مخالفت پولس کی زندگی میں بھی ہوئی اور اس کے بعد بھی جاری رہی۔

پولس کے بعد ابتدائی دور میں جس فرقہ نے پولسی نظریات کی مخالفت جاری رکھی، عیسائیت کی تاریخ میں اسے ایبونی (Ebionites) کہا جاتا ہے، ایبونیوں نے پولس کے خطوط یکسر مسترد کر کے انھیں دین کی اساس ماننے سے انکار کر دیا، پولس کی تبلیغ کے برعکس موسوی شریعت (Mosaic Law) کی پابندی پر زور دیا، اور حضرت عیسیٰ کو خدا یا اس کا بیٹا کہنے کے بجائے ایک عظیم انسان اور رسول قرار دیا۔ اس طرح ایبونی بڑی حد تک ان نظریات کے پابند تھے جو پولسی اثرات وتحریفات سے قبل تھے۔

---

(۱) مزید توضیح کے لیے دیکھئے: مسیحیت۔ علمی وتاریخی حقائق کی روشنی میں/ ۳۷-۴۴۔ دنیا کے بڑے مذاہب: ۳۱۰/ عماد الحسن آزاد فاروقی۔

ایک اور فرقہ جس نے ابتدائی دور میں پولیسی نظریات پر کاری ضرب لگائی وہ ''فرقۂ دوسیتی'' (Deocetists) کہلاتا ہے، اس کے حامیوں نے منجملہ دیگر نظریات کے، حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کا انکار کیا۔

اس کے علاوہ پہلی صدی کے آخر میں ہرمس (Hermas) نامی بزرگ کی لکھی ہوئی کتاب ''چرواہا'' (The Shephard) میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے بجائے خدا کی توحید کو زیادہ اجاگر کیا گیا تھا، یہ کتاب ان کتابوں میں شامل تھی جنھیں طویل عرصہ تک الہامی حیثیت حاصل رہی ہے۔ (۱)

ممکن تھا کہ حواریوں کی مخالفت اور مذکورہ بالا فرقوں اور ان کی کوششوں سے پولس کے اثرات زائل یا بالکل کم ہوجاتے مگر بدقسمتی سے دوسری صدی میں پولسی عقائد و نظریات کو ایسے ترجمان اور کارکن مل گئے جنھوں نے بالواسطہ طور پر انھیں تقویت پہنچائی، مثلاً غناسطی فرقہ (Gnostics) جو کہ پولسی عقائد کا زبردست حامی تھا، (۲) اسی طرح ایک سرگرم کارکن جسٹن (Justin) تھا جس نے دوسری صدی میں یہ بحث چھیڑ دی کہ جو عیسائی ابھی تک موسوی شریعت پر عمل پیرا ہیں (جیسے ایبونی فرقہ) ان کی نجات ہوگی یا نہیں؟

جسٹن سے بڑھ کر مرقیون (Marcion) پولس کا حامی و مؤید تھا، اس کا کہنا تھا: ''حضرت عیسیٰ کے حواری اور دوسرے لوگ حضرت عیسیٰ کی حقیقت سے کورے رہے (Blinded to the truth) اور یہ حقیقت صرف پولس کو معلوم ہوئی، اس لیے دین وہی ہے جو پولس نے سکھایا ہے۔'' مرقیون کے عام اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے اس نے یہودیوں کی بائبل (عہد قدیم) کو بالکل مسترد کرکے عیسائیوں کے لیے الگ تھلگ بائبل (عہد جدید) پر زور دیا، اس کے نتیجہ میں بالآخر کلیسا نے بائبل کی کتب منتخب کیں جن میں مرقیون کے ہی زیر اثر پولس کے خطوط کو بہت زیادہ جگہ اور اہمیت دی گئی۔ (۳)

عیسائی تاریخ میں جسٹن اور مرقیون کے علاوہ ایرینیش، اوریجن اور طرطلین، جیسے بہترے متکلمین پیدا ہوئے جن کی کوششوں سے پولس کے عقائد و نظریات کو استحکام حاصل ہوا، نیز ان جیسے حامیوں کے علاوہ عوامی اور جذباتی رنگ بھی پولس کا حامی بنا رہا جس کا سبب یونانی نظریات کا فروغ تھا، لوگ رفتہ رفتہ اس مذہبی رہنما کو پسند کرنے لگے جو حضرت عیسیٰ کی شان میں غلو سے کام لیتا، اور غلو کا مقابلہ عقل و دیانت سے کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

حاصلِ بحث

عیسائیت میں جتنا سامان خدا پرستی کا موجود تھا پولس نے اتنی ہی دلکشیاں ایک بت پرست کے لیے بھی اسی

---

(۱) عیسائیت - تجزیہ و مطالعہ: ۹۳-۹۴/ پروفیسر ساجد میر/ مطبوعہ دارالسلام - لاہور)

(۲) قاموس الکتاب: ۶۴۲

(۳) مرقیون کے حالات کے لیے دیکھئے قاموس الکتاب: ۹۰۲، ۹۰۳

کے مذاق شوق کے مطابق پیدا کر دیں، حواری جس طرح یہودیوں کو اپنی طرف بلا رہے تھے اسی طرح پولس نے بھی رومی و یونانی بت پرستوں کو عیسائیت کی دعوت دی، اور عیسائیت کو اس طرح پیش کیا کہ وہ ان کے ذوق و عقائد کے مطابق نظر آئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین عیسوی ایک ایسے رنگ روپ میں ڈھل گیا کہ بت پرستوں کو مذہب بدلنے میں یہ نہیں نظر آتا تھا کہ وہ اپنے آبائی دین سے الگ ہو رہے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا اور انھیں ایسا ہی دکھانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ گویا وہ ایک بے اصول اور بے ڈھپ بت پرستی کو چھوڑ کر ایک مہذب و شائستہ بت پرستی اختیار کر رہے ہیں، اور واقعی پولس کو ان دنوں سب سے زیادہ فتحیاب کرنے والی یہی کمند تھی جس کی مدد سے اس نے رومیوں کو اپنا بنانا شروع کیا۔

پولس نے یہ کام صرف اپنی زبانی تبلیغ اور فلسفیانہ و منطقیانہ دلائل سے ہی نہیں کیا بلکہ مختلف کلیساؤں اور شہر کے عیسائیوں کو اس نے تبلیغی خطوط لکھے، ان میں اپنے عقائد و نظریات کی وضاحت اور اس کی تلقین بھی کی، اور بعد میں یہی خطوط بائبل کا حصہ بنائے گئے اور خود کلیسا نے اپنے عقائد و نظریات کی بنیاد انہیں خطوط پر استوار کی، اسی بنیاد پر ان خطوط کو ''مسیحی علم الٰہی کی جان'' کہا گیا۔ (۱)

پولس کی تبلیغ سے ایک بہت بڑی تعداد عیسائیت میں داخل ہوئی، ابتدا میں انطاکیہ کے باشندوں نے پولس کی سخت مخالفت کی، وہ پولس کے پیش کردہ دین کو ''مسیحیت'' اور اس کے پیروکاروں کو ''مسیحی'' کا لقب دیتے تھے، شروع میں یہ لقب تحقیرانہ انداز میں استعمال ہوتا تھا، لیکن بعد میں یہی لفظ ان کی شناخت بن گیا۔ (۲)

آج دنیا بھر میں جو عیسائیت نظر آتی ہے اس کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی اعلیٰ تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں، بلکہ فی الواقع یہ وہی ''مسیحیت'' ہے جس کا بانی ''سینٹ پال عرف پولس'' تھا۔ اور اس مسیحیت کی ترویج و اشاعت میں سب سے بنیادی کردار ان کلیساؤں کا ہے جو پولس کے عقائد و نظریات کی حامی اور اسی کے نام پر مستحکم ہوئے، اور اس نے اپنی طاقت و سطوت کے ذریعہ لوگوں کو مسیحی بننے پر مجبور کیا، اور اس سلسلہ میں کسی بھی طرح کی انسانی و مذہبی اقدار کی کوئی رعایت نہیں کی، یہ گویا پولس کے اس دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی:

''میں اہل شریعت کے لیے شریعت والا بنا تا کہ اہل شریعت کو جیت سکوں حالانکہ میں خود شریعت کا پابند نہیں۔ جو لوگ شریعت نہیں رکھتے میں ان کے لئے بے شرع بنا تا کہ بے شرع لوگوں کو جیت سکوں۔'' (۳)

---

(۱) قاموس الکتاب: ۲۰۸ (۲) قاموس الکتاب: ۹۲۱ (۳) کرنتھیوں کے نام خط/ ۹: ۲۱

مسیحیت میں کلیسا کا کردار

سلطنت روما (Roman Empire) میں مذہب اور سیاسی عقیدے پہلو بہ پہلو چلتے تھے، ان کا اپنا مذہب اور اس کا مخصوص فلسفۂ حیات تھا، عوام کی خوشحالی اور ان کی اصلاح و ترقی کے لیے مذہب و سیاست دونوں سے یکساں مدد لی جاتی تھی، لیکن جب مسیحیت روم میں داخل ہوئی تو اس نے اس اتحاد و ہم آہنگی کو پاش پاش کر دیا، اور اس کے ٹوٹتے ہی سیاسی ذہنیت میں ایک عنصر ایسا شامل ہو گیا جس نے سیاسیات کو بالکل نیا رنگ دے دیا، دین و دنیا کی تفریق کر دی گئی، ''قیصر اور خدا کے حقوق'' الگ الگ ہو گئے۔ اور جس طرح ریاست و حکومت قیام امن اور خوشحالی کے بدلہ اطاعت و فرمانبرداری کی دعویدار تھی، اسی طرح کلیسا بھی روحانی فلاح و بہبود کا ذمہ دار بن کر اپنا حق طلب کرنے لگا۔ قیصر اور خدا کا پورا پورا حق ادا کرنے میں عوام پریشانیوں میں مبتلا ہونے لگے، نتیجتاً ریاست اور کلیسا کے مابین ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا جس میں اکثر کلیسا کا ہی پلڑا بھاری رہا۔

کلیسا کا اقتدار اس قدر مضبوط ہوا کہ وہی قرون وسطیٰ کی سب سے وسیع اور مقتدر انجمن تھی، اس کا نظام ریاست بالکل جدا تھا، اس کی اپنی عدالتیں تھیں، اپنا مجموعۂ قانون اور محکمۂ تفتیش تھا، ریاست کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ عہدہ دار کو اپنے قانون کے مطابق سزا دے، اور اگر کوئی مجرم کسی کلیسا میں پناہ لیتا تو وہ گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کلیسائی اقتدار کے حامیوں نے پاپا اور کلیسا کے مرتبہ کو خوب بڑھا دیا، اور ان کے متعلق ایسے دعوے کیے جنھیں تسلیم کرنا سیاسی حاکموں کی خودداری کے بالکل خلاف تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کلیسا سولہویں صدی کی اصلاحی تحریکوں کے کامیاب ہونے تک یورپ کی سب سے وسیع اور متحد ریاست تھا، اور اپنے اختیارات اور حقوق کے لحاظ سے ایک منظم اور خود مختار حکومت!

کلیسا کیا ہے؟

کلیسا/کلیسیا (۱) یونانی لفظ ''اکلیسیا'' (Ekklesia) سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے مجلس (۲) انگریزی میں اسی

---

(۱) مسیحی طبقہ اپنی عبادت گاہ کے لیے کلیسا اور مذہبی جماعت کے لیے کلیسیا کا لفظ مختص کرتا ہے لیکن اردو زبان میں ان دونوں کے لیے ''کلیسا'' اور انگریزی میں ''چرچ'' کا لفظ مستعمل ہے۔

(۲) قاموس الکتاب: ۸۰۴

کو"Church"(چرچ) بھی کہتے ہیں۔

"The word "CHURCH" in the New Testament is translated from the Greek word 'ekklesia'"(1)

(عہد نامہ جدید میں چرچ کا لفظ یونانی لفظ اکلیسیا کا ترجمہ ہے)

اصطلاحی طور پر کلیسا عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں کی وہ جماعت ہے جو مذہبی امور میں میں تمام عیسائیوں کی سربراہ اور اور ذمہ دار ہے۔ نیز کسی خاص ملک یا علاقہ کی مسیحی جماعت کو بھی کلیسا کہتے ہیں۔ (۲)

"Church; It is the people's congregation, together with the clergy, as being Christ's Body."(3)

کلیسا/کلیسیا کی اہمیت وعظمت کا اندازہ بائبل کی مختلف روایات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جنھیں "قاموس الکتاب" میں یکجا بیان کیا گیا ہے:

"کلیسیا ایک ایسی عمارت ہے جس کے سرے کا پتھر یا بنیاد مسیح ہیں، یہ "پاک مقدس" اور "خدا کا مسکن ہے"، یہ مقدسوں یا خدا کے لوگوں کی رفاقت ہے، یہ خداوند مسیح کی دلہن ہے جسے انھوں نے اپنے لیے پاک وصاف کیا، یہ حقیقتاً مسیح کا بدن ہے۔" (۴)

مختصر الفاظ میں کلیسا/کلیسیا ایک منظم ومقدس، دینی وسیاسی جماعت کا نام ہے جو مسیحیت کی بقا اور اس کی اشاعت کے لیے مختلف میدانوں میں کوشاں رہتی ہے:

"دوسرے بہت سے مذہبوں کی طرح شروع سے ہی عیسائیت نے اپنے مذہب اور اجتماعی زندگی کو ایک ادارہ کی شکل دینا شروع کیا تھا، اس منظم عیسائی جماعت کو چرچ کا نام دیا گیا۔" (۵)

عیسائیوں کے تمام روحانی معاملات کلیسا سے وابستہ ہوتے ہیں، چنانچہ کلیسا ان کے مذہبی معاملات کی نگرانی، عبادات ورسوم کی ادائیگی، روحانی رہبری اور مقدس عمارتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے، اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام ذمہ داریاں اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ملی ہیں جس کا تذکرہ "اناجیل اربعہ" کے مختلف صفحوں میں ہے، اس حوالہ سے "قاموس الکتاب" کی یہ عبارت نہایت مفید اور معتبر ہے:

"مسیح خدا نے رسولوں کی صورت میں راہنماؤں کی ایک جماعت اپنے پیچھے چھوڑی جنھیں انھوں نے خود چنا تھا..... مسیح خداوند نے بارہ اشخاص کو چنا تا کہ وہ ان کے ساتھ رہیں..... ان اشخاص کو شروع ہی سے ناپاک روحوں کو نکالنے اور بیماریوں کو شفا دینے کا اختیار ملا، اور جب باپ کا وعدہ پاک روح کی بخشش کی صورت میں ان پر نازل ہوا

---

(1)http://www.hisholychurch.net/ekklesia.php#1

(۲) مکالمہ بین المذاہب از مولانا ولی خاں المظفر صفحہ:۹۳

(3) Dictionary of Church Terms *(Church)*

(۴) قاموس الکتاب:۸۰۵

(۵) اردو انسائیکلوپیڈیا جلد سوم صفحہ ۴۲۷/مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

تو ان کی اس قدرت کی تجدید ہوئی اور اس میں مزید ترقی ہوئی، مسیح خداوند نے انھیں انجیل کی منادی کرنے کے لیے مقرر کیا اور بھیجا، اور اپنے عظیم حکم میں تمام قوموں میں منادی کرنے کی ہدایت کی، یوں بالآخر انھیں انجیل کی منادی کرنے کے لیے مسیح کا اختیار مل گیا، لیکن اس کے ساتھ ان سے ایک خاص قسم کا وعدہ بھی کیا گیا یعنی وہ خدا کے لوگوں کے منصف اور حاکم بھی ہوں گے، نیز انھیں باندھنے اور کھولنے، گناہ معاف کرنے اور قائم رکھنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ یہ اختیار سب سے پہلے پطرس کو ملا، لیکن یہ اسے انفرادی حیثیت کے بجائے نمائندہ ہونے کی صوت میں ملا، کیونکہ جب اس کا اعادہ متی (۱۸:۱۸) میں کیا گیا تو یہ اختیار تمام رسولوں کو مجموعی طور پر دیا گیا۔ پس کسی فرد کے بجائے یہ وہ وفادار جماعت ہے جو مسیح کے نام میں ایمانداروں کے لیے بادشاہت کے دروازے کھولتی ہے، اور بے ایمانوں کے لیے بند کرتی ہے۔"(۱)

گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ان کے حواریوں کی جماعت کو دعوت و تبلیغ اور مذہبی رہنمائی کی ذمہ داریاں تفویض ہوئیں، اور یہ سلسلہ بعد کے متبعین کے توسط سے قائم رہا اور مختلف علاقوں میں منظم ادارہ کی شکل میں کلیسا کے نام سے سرگرم ہوا۔

کلیسائے یروشلم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے متبعین نے ان کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی کی، اور جب مسیحیت پھیلنا شروع ہوئی تو ان کے متبعین نے مختلف علاقوں میں "کلیسا" (Church) قائم کیے تاکہ منظم طریقہ پر مسیحیت کی اشاعت اور مذہبی رہنمائی ہو سکے تاہم مرکزی حیثیت "کلیسائے یروشلم" کو حاصل تھی جو حضرت عیسیٰ کے حواری اور دیگر صحبت یافتہ شاگردوں نے قائم کی تھی، اسی کے تحت وہ عظیم کونسل منعقد ہوئی جس میں تمام مقتدر حواریوں نے باہمی مشورہ کے بعد یہ طے کیا تھا کہ غیر قوموں کو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے، اور انھیں موسوی شریعت کے احکام کا پابند نہ بنایا جائے۔(۲)

70ء میں یہودیوں نے رومن ایمپائر کے خلاف بغاوت کی، اس بغاوت کو کچلنے کی ذمہ داری جنرل ٹائٹس (Titus) کو دی گئی، اور اس نے یہ کام روایتی رومی سفاکی و شقاوت کے ساتھ انجام دیا، چھ مہینے تک محاصرہ کیا گیا، ہیکل کو جلا دیا گیا، لاکھوں یہودی قتل کیے گئے جن میں یہاں کے عیسائی باشندے بھی شامل تھے۔

کلیسائے روم

حضرت عیسیٰ کی عیسائیت یہودیوں کے ساتھ خاص تھی، لیکن جب پولس کو یہودیوں کی طرف سے خاطر خواہ قبولیت نہ ملی تو اس نے غیر یہودیوں میں تبلیغ شروع کر دی، یونان و روم کے خصوصی اسفار کیے، اور روم میں قائم

---

(۱) قاموس الکتاب: ۸۰۷ (۲) اعمال: ۱۵

کلیسا کو اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، اور اپنے اصول ونظریات کے مطابق تعمیر نو کی، جسے بعد میں "مغربی کلیسا" یا "کیتھولک کلیسا" (Catholic Church)[1] کا نام دیا گیا۔ اس کیتھولک کلیسا کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں غیر یہودی بھی شامل تھے، اور اس کی نسبت پطرس حواری اور پولس رسول کی جانب کی جاتی تھی۔

پولس اور دیگر حواریوں کے تعلقات شروع سے ہی کشیدہ تھے، جس کی بنیادی وجہ پولس کی ہٹ دھرمی اور عیسائیت میں من چاہی تبدیلی تھی، یہ اختلاف غیر یہودیوں میں تبلیغ کے موضوع پر نہایت سنگین ہوگیا جس کے حل کے لیے یروشلم کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے بعد پولس و دیگر حواریوں کے تعلقات نہ صرف منقطع ہوگئے بلکہ عیسائیت کے دو الگ الگ مکتب فکر وجود میں آگئے، اور ان کے متبعین کے مابین کشاکش شروع ہوئی، اور پھر بعد کے دور میں مختلف فرقے وجود میں آتے گئے۔

پولس کی سرگرمیوں کا مرکز یونان وروم تھے، یونانیوں اور رومیوں کی اپنی رسومات واپنے اعتقادات، اپنے فلسفیانہ نظریات اور مخصوص علوم الٰہیات (Theology) تھے، انھوں نے پولس کی تعلیمات کا موازنہ اپنے نظریات واپنی اقدار سے کیا اور جو اختلاف نظر آیا پولس سے اس کی وضاحت طلب کی، پولس نے حضرت عیسیٰ کی اصل تعلیمات سے ہٹ کر ایسے جوابات دیے جو مغربی سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے، اس طرح اس نے مغربی ذہن کی مناسبت سے عقائد کی تدوین کی، نیز کلیسا کو درپیش مسائل کے حل اپنے خطوط کے ذریعہ بھیجے، جو آگے چل کر بائبل کا جزء لاینفک بن گئے۔

بقا کی جدوجہد

کلیسا نے رومن ایمپائر میں اپنی تنظیم اس وقت شروع کی جب حکومت عیسائیوں کے سخت مخالف تھی، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود عیسائی تعلیمات میں روم مخالف مواد موجود تھا، اس کے علاوہ ان کا تعلق یہودیوں سے تھا اور یہودی مذہبی لحاظ سے متعصب اور فتنہ پرداز تھے جن کی شرانگیزی ہمیشہ جاری رہتی۔ اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو مسیحا کہتے تھے اور رومی حکومت اس عقیدہ سے واقف تھی کہ مسیحا ان کی حکومت کا خاتمہ کر کے یہودی حکومت قائم کرے گا، اس عقیدہ کے تناظر میں مسیحیت رومن امپائر کے خلاف ایک بغاوت تھی جسے طاقت کے زور پر کچلنا ضروری سمجھا گیا۔

شہنشاہ روم نیرو (Nero) کے عہد میں عیسائیوں پر نہایت سنگین مظالم ڈھائے گئے، جس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہوئی کہ 64 عیسوی میں روم میں زبردست آگ لگی جس میں روم جل کر تباہ ہوا، یہ آگ ایک ہفتے تک بھڑکتی

---

(۱) کیتھولک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہے عالمگیر، چونکہ کلیسا کا تصور عالمی ہے، یعنی ہر قوم کے لیے اور علاقہ کے لیے، اس لیے اس کے ساتھ کلیسا کا لفظ بھی مستعمل ہوا۔ (قاموس الکتاب: ۸۲۳)

رہی، افواہیں پھیلنے لگیں کہ یہ آگ شہنشاہ نیرو کے اشارے پر لگائی گئی ہے کیونکہ نیرو "گولڈن ہاؤس" (Golden House) کے نام سے ایک عظیم الشان محل تعمیر کروانا چاہتا تھا، جس کے لیے اسے شہر کے درمیان میں صاف اور بڑے رقبہ کی ضرورت تھی، نیرو نے نہایت چالاکی سے یہ سارا الزام عیسائیوں کے سر تھوپ دیا۔ عوام نے بھی اس الزام کو بلا تردد قبول کرلیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عیسائی اس دنیا کے جلد فنا ہو جانے کا ایمان رکھتے ہیں، اس وجہ سے اگر انھیں دنیوی چیز سے نفرت ہے تو عجب نہیں کہ آگ انھوں نے ہی لگائی ہو۔ (1)

اس الزام کے بعد عیسائیوں کا قتل عام بڑی شدت سے شروع ہوا، ان پر تارکول لگا کر ان کو کھمبوں سے باندھ دیا جاتا اور آگ لگادی جاتی کہ زندہ مشعلیں معلوم ہوں، جانوروں کی کھالیں پہنا کر ان پر کتے چھوڑ دیے جاتے جو ان کی بوٹی بوٹی کر دیتے، اکھاڑے میں جنگلی جانوروں کے سامنے ڈال دیے جاتے، اور بہت بڑی تعداد میں صلیب پر لٹکائے جاتے۔

شہنشاہ روم ٹراجان (Trajan) کے عہد میں مظالم میں اور شدت پیدا ہوئی، جس کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ 132ء میں یہودیوں نے رومی حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اس کی غلامی کا پٹہ اتار پھینکنے کی ایک بار پھر مسلح جدوجہد کی تو عیسائی بھی اس میں شریک تھے، ان حالات میں رومی حکومت کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ یہ نیا فرقہ مذہب کی آڑ میں ایک سیاسی تحریک ہے جس کا مقصد رومن ایمپائر کو ختم کرنا ہے، چنانچہ حکومت کی طرف سے قید و بند اور دار ورسن کا سلسلہ شروع ہوا، مذہبی اجتماعات پر پابندیاں لگیں، کتابیں جلائی گئیں، جائدادیں ضبط ہوئیں، مقدمے قائم ہوئے، مسیحیت سے برأت کے حلف نامے لیے گئے، اس انتقامی کارروائی سے وہی لوگ بچ پاتے جو فرار ہو جاتے یا حکومت کی طرف سے یہ صداقت نامہ حاصل کر لیتے کہ یہ شخص ملکی قانون کا پابند ہے۔ ان کارروائیوں سے کلیسا کی بے چینی بڑھتی جاتی، اور یہ بے چینی تحریک میں شدت پیدا کر دیتی جس کا نتیجہ مزید تشدد ہوتا، یہ ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو لمبے عرصے تک چلتا رہا، کلیسا کی سربراہی میں مظاہرے ہوتے اور پھر ان کے خلاف حکومت کا سخت اقدام ہوتا۔

"تاریخ اخلاق یورپ" کا مصنف "Edward H. Lecky" لکھتا ہے:

"249ء میں ڈیسیس (Decius) کی تاج پوشی سے لے کر 260ء میں گالینس (Gallienus) کی تاج پوشی تک کا زمانہ گرجا کے سخت ترین ابتلا کا زمانہ ہوا ہے، اس گیارہ سال کی مدت میں سے پورے چھ سال تک برابر گرجا پر دست درازیاں جاری رہیں، گو ان دست درازیوں کے مدارج مختلف رہے، ابتداء میں تو خصوصاً اس کے شدائد ایسے سخت تھے کہ ان سے زیادہ ناقابل تحمل شدائد کی نظیر شاید ہی کہیں ملے، رفتہ رفتہ ان کی زد میں خاص پادریوں کی جانیں ہوگئیں، اس تعدی کے اسباب سیاسی تو تھے، مگر ان کے علاوہ رعایا کے اس عقیدہ کو بھی اس میں بہت دخل تھا کہ ملک پر

(1) A Criminal History of Mankind By Colin Wilson, P.128

آفات ومصائب وناگہانی عیسائیوں ہی کی بے دینی وبداعمالیوں کی پاداش میں آتے ہیں، سیاسی شورش وبدامنی تو جو رومی قوم انحطاط کا پیش خیمہ تھی ملک میں پھیل ہی رہی تھی، مگر اسی کے ساتھ قحط وطاعون کی بھی گرم بازاری تھی مشرکین ان کو دیکھ دیکھ کر عیسائیوں سے بدظن وبرہم ہوتے۔"(۱)

249ء میں رومن امپائر پر بیرونی حملہ ہوا تو عیسائیوں نے رومی افواج کے خلاف حصہ لیا، جس کی پاداش میں ہزاروں عیسائی تہہ تیغ کیے گئے۔ مظالم کی انتہا تو یہ ہوئی کہ جب قتل وخونریزی اور انسانیت سوز سزائیں انھیں مذہب سے برگشتہ نہ کرسکیں، اور جب مذہب کے نام پر جان دینا موجب وقار ہوگیا تو روم نے ان کے ساتھ "مذہب یا عصمت" کا معاملہ کیا، یعنی عصمت بچالو یا مذہب بچالو! یہ سلسلہ رومی نوجوانوں نے کے لیے نہایت دل خوش کن تھا، حد تو یہ ہوئی کہ نوجوان عیسائی مردوں کی عصمت دری کا فرض رومن خواتین نے ادا کیا۔ (۲)

ابتدائی صدیوں میں کسی کا عیسائی ہونا ہی ایک سنگین جرم تھا اور اقبال جرم کی صورت میں لرزہ انگیز سزائیں ملتی تھیں، حالات کی اس سنگینی کے باوجود کلیسا اپنا وجود منواتا رہا اور مسیحیت اپنا دامن وسیع تر کرتی رہی حتی کہ تیسری صدی کے اختتام تک مسیحیت ملک کے ہر خطہ اور معاشرہ کے ہر طبقہ میں پہنچ گئی۔

ملاحظہ

مسیحیت کی تاریخ میں ابتدائی صدیاں ظلم وظلمت اور وحشت وبربریت کے لیے بہت ممتاز کہی جاسکتی ہیں، جن میں مسیحیت سخت مظالم وتعدیات کا نشانہ بنتی رہی، بلاشبہ عیسائیوں کے ساتھ جو کچھ گذری اس پر ہم مسلمانوں کو سخت افسوس بھی ہے اور مظلوموں سے دلی ہمدردی بھی، تاہم تاریخ وانصاف کے تناظر میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان مظالم کی جو داستانیں ہم تک پہنچی ہیں ان کے مآخذ خود عیسائی مصنفین ہیں، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ ان واقعات کو بیان کرنے میں میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی بھی کی گئی ہو۔

اس سلسلہ میں مشہور مؤرخ لیکی کا یہ اقتباس نہایت مفید ہے:

"سب سے زیادہ ناظرین کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ آج اس تعدی کے اصل محرکات اور اس کے مظلوموں کی تعداد سے متعلق کوئی صحیح اور قطعی اطلاع نہیں حاصل ہوسکتی، فریق ثانی یعنی بت پرستوں کی کوئی تصنیف آج اس بحث میں موجود نہیں، اس لیے ہمارے پاس جو کچھ بھی معلومات ہیں مسیحی ذرائع سے آئے ہوئے ہیں، اور ان میں بھی ہمارے مآخذ صرف دو ہیں، ایک یوسی بیس (Eusebius) کی تاریخ اور دوسرے لیکٹین ئیس (Lactantius) کا رسالہ اہل تعدی کی مدتوں سے متعلق، ان دونوں کا بھی یہ حال ہے کہ یوسی بیس اگرچہ اپنے زمانہ کے معیار سے

---

(۱) A History of European Morals by E.H.Lecky, V.1, P.455,456
(ترجمانی: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: تاریخ اخلاق یورپ)

(2) The Decline & fall of roman empire by E.Gibbon, V.2 P.96

ایک عالم وسیع النظر شخص تھا، تاہم اس نے اس کا کبھی غلط دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے یہ کتاب مؤرخانہ بے تعصبی و نا طرف داری کے ساتھ لکھی ہے، بلکہ وہ غریب صاف صاف کہتا ہے کہ "اس تصنیف میں میں ان واقعات کو پی گیا ہوں جن سے گرجا کی اہانت ہوتی تھی" رہے لیکھین ٹیس تو ان کے رسالہ کو آج کل کی اصطلاح میں ایک "پارٹی پمفلٹ" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، اس میں اول سے لے کر آخر تک ہر جگہ یہی دکھلایا گیا ہے کہ مسیحیوں کو آزار پہنچانے والوں کا کتنا برا انجام ہوا، اور اس کے ایک ایک لفظ سے مبالغہ و تعلی کی جھلک نظر آتی ہے، تاخذ صحیح کے اس انتقاد اور تاخذ موجودہ کے اس ضعف نے تعدیوں کی تاریخ کو ایک مجموعہ اکاذیب بنا دیا ہے، کچھ غلط بیانیاں تو قصداً داخل کی گئیں، اور کچھ ان پر خوش اعتقادیوں نے رنگ چڑھایا، چنانچہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ رنگ اور پختہ ہوتا گیا، ایک ہی واقعہ بیسیوں طرح رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کیا جانے لگا۔"(1)

شہنشاہ قسطنطین کی مسیحیت

چوتھی صدی کی ابتداء کلیسا کے لیے سرکاری سرپرستی کا پیغام لائی، اس دور میں رومی سلطنت میں زوال کے آثار پیدا ہوئے، شہنشاہیت کے دعویداروں میں شدید خانہ جنگی شروع ہوئی، اور قسطنطین (Constantine) فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا، 300ء میں اس نے کلیسا کو امان دی، فوج میں ایک بڑی تعداد مسیحیت قبول کر چکی تھی، ان سب کی وفاداری قسطنطین کو حاصل ہوئی، اور پھر اگلے چند سالوں بعد 306ء میں وہ بلا شرکت غیر روم کا شہنشاہ بن گیا۔

قسطنطین کے مسیحیت کی طرف میلان کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اس نے آسمان میں ایک شعلہ بار صلیب (Flaming Cross) کا نشان دیکھا، جس کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ یہ اس کی جنگی فتوحات کی بشارت ہے، مگر واقعات یہ ہیں کہ روم کی خانہ جنگی کے دوران اس نے محسوس کیا کہ عیسائیوں پر مظالم کا خاتمہ اور کلیسا کا اتحاد اور اس کی پشت پناہی ایک سیاسی ضرورت ہے:

"He had hoped that Christian unity would help the unity of the Empire."(2)

(اس کو توقع تھی کہ عیسائیوں کے اتحاد سے پوری سلطنت کے اتحاد میں مدد ملے گی)

علاوہ ازیں قسطنطین نے منجملہ دیگر مظالم کے ہوسِ اقتدار میں اپنے سگے بیٹے کرسپس (Crispus) کو قتل کروایا تھا، پھر اس کے الزام میں اس کی سوتیلی ماں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا،(1) بعد ازاں معلوم ہوا کہ بیٹا

---

(1) A History of European Morals, V.1, PP.463

(ترجمانی: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:- تاریخ اخلاق یورپ)

(2) The First Advance (Church History) by John Foster,P.139

(3) http://www.roman-emperors.org/fausta.htm#16

بے گناہ تھا اور ناحق مارا گیا جس پر وہ سخت نادم ہوا اور دل میں ایک کوفت رہنے لگی، اس ندامت کا اثر رفع کرنے کے لیے اس نے بت پرستی کے بڑے بڑے مقتداؤں کو جمع کیا اور نجات کی تدبیر پوچھی، سب نے بالاتفاق کہا کہ ایسے غیر قابل عفو جرم کو مٹانے کے لیے ہمارے دین میں کوئی کفارہ نہیں، انہیں دنوں ایک عیسائی قسطنطین کے دربار تک پہنچا اور اس نے شہنشاہ کو یقین دلایا کہ "مسیح کا دین روح کو ہر گناہ سے پاک وصاف کر دیتا ہے"، یہ بات افسردہ خاطر بادشاہ کے دل میں جم گئی اور اسی وقت سے وہ مسیحیوں کا ہمدرد بن گیا، وہ مذہب کی خاطر مسیحیوں کے صبر واستقلال سے پہلے ہی سے متاثر تھا، اس کے علاوہ اس کا باپ اور خاص کر اس کی ماں بھی مسیحیت کے حامی تھی۔

شہنشاہ قسطنطین اپنی مہم جوئیوں اور عظیم الشان فتوحات کی وجہ سے بہت جلد ہی "قسطنین اعظم" کے لقب سے مشہور ہوا، سیاسی استحکام اور دشمنوں سے امن حاصل ہونے کے بعد اس نے اپنا دارالخلافہ ایک ایسی جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جو جغرافیائی اعتبار سے خاصا اہمیت کا حامل تھا، اس نو آباد علاقہ کا نام اس نے "نیا روما" رکھا لیکن یہ نام تاریخ کے دربار میں مقبول نہ ہو سکا بلکہ "قسطنطنیہ" کے نام پر مشہور ہو کر اپنے بانی کی نہ مٹنے والی یادگار کے طور پر جاویداں ہو گیا۔

قسطنطین کو اگر چہ بت پرستوں سے کوئی خاص ہمدردی نہ تھی مگر ان کے مذہب سے اس نے کچھ مزاحمت بھی نہ کی، اور اسی وجہ سے وہ بت پرست یونان وغیرہ سے بہت سے بت بھی لے آئے اور کسی گرجہ کے قائم ہونے سے پہلے ہی بتوں کے کئی مندر بن کر کھڑے ہو گئے، خود قسطنطین نے خوبصورتی وزیبائش کی خاطر مختلف مقامات میں دیویوں کی مورتیں قائم کرائیں، اس کے علاوہ بڑی تعداد میں کلیسا بھی تعمیر کروائے۔

مندروں اور کلیساؤں کے علاوہ قسطنطین نے ایک بلند مینار پر یونان کے دیوتا اپولو (Apolo) کی مورت قائم کروائی، مگر اس مورت میں سر اور چہرہ خود اپنا لگوایا، اور مقدس چہروں کے گرد تصویروں میں جو کرنیں دکھائی جاتی ہیں ان کے بدلہ تین طرف سے صلیب کی تین نوکیں نکال دیں، گویا یہ مورت قسطنطین کے اصلی مذہب کی حقیقی تصویر تھی، درحقیقت وہ اب تک نہ مسیحی ہوا تھا اور نہ بت پرست باقی رہا تھا، بلکہ عظمت پسندی کی جو ہوس اس کے افعال سے ہمیشہ ظاہر ہوتی رہتی تھی اس کا انتہائی درجہ یہ تھا کہ وہ خود ایک ایسا دیوتا بننا چاہتا تھا جو فلسفیوں، بت پرستوں اور مسیحیوں کا معبود کہلائے، اس طرح اس نے بت پرستی اور مسیحیت دونوں کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا۔

قسطنطین اعظم کا باپ ایک غیر متعصب بت پرست تھا اور اس کی ماں ایک پختہ مسیحیہ عورت تھی، اگر چہ آغوش مادری کا اثر کشش پدری پر غالب آ چکا تھا تاہم وہ اپنی عمر کے آخری وقت تک دونوں کے درمیان تذبذب کا شکار رہا، خود پرستی کا شوق بت پرستی میں خود اپنے آپ کو دیوتا بنا سکنے کی امید دلاتا رہا لیکن سیاسی مصلحتیں اسے

مسیحیت کی طرف کھینچتی رہیں، اسی گومگو کے عالم میں تھا کہ موت کا وقت سر پر آ گیا اور اس وقت اس نے مجبوراً مسیحیت کا بپتسمہ لے لیا۔ (۱)

کلیسا کا استحکام

کلیسا نے قسطنطین کے ساتھ اپنی مکمل وفاداری کا ثبوت دیا، اور اسی کی بدولت پورا روم اس کے زیر نگیں آ گیا، شہنشاہ نے بھی کلیسا کی وفاداری اور اس کی عدیم المثال معاونت کے عوض اس پر مراعات کی انتہا کر دی، کلیسا کو عزت، دولت و عظمت سے نوازا اور اس کی حفاظت کو عدلیہ کا فرض قرار دیا۔ وہ خود کلیسا کا مضبوط پشت پناہ ثابت ہوا، اور اس کے احسان کا بدلہ بڑی قابلیت سے ادا کیا، کوئی مسیحی فرمانروا ہوتا تو بھی شاید مسیحیوں کے ساتھ اتنی رعایت نہ کرتا جتنی اس نے کی، تخت روم پر متمکن ہوتے ہی اس نے حکم دیا کہ جتنے کلیسا، جتنی جائدادیں، اور جتنا مال و اسباب گذشتہ مظالم کے دور میں مسیحیوں سے چھینا گیا ہے وہ سب کا سب انھیں واپس کر دیا جائے، جو کلیسائیں اور مکانات منہدم کیے گئے انھیں حکومت کے مصارف سے دوبارہ تعمیر کرایا جائے، اس قسم کے کسی حکم کا پورے رومن امپائر میں نافذ ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی، اور کیا عجب بہتوں نے صدیوں پیشتر کے جعلی دعوے بھی پیش کیے ہوں اور بیٹھے بٹھائے دولت مند بن گئے ہوں۔ تھوڑے ہی زمانہ میں ہر جگہ اور ہر حصۂ ملک میں عالیشان کلیسا قائم ہو گئے، اور بڑی شان کے ساتھ بے روک ٹوک دین مسیحیت کی تبلیغ شروع ہو گئی، رومیوں اور بت پرستوں کو جائدادیں چھین لینے کی دھمکیاں دی جاتیں جس کے خوف سے کثرت سے رومی اور بت پرست مسیحیت کو قبول کرنے لگے کیونکہ اس وقت کسی معزز رومی و بت پرست کا اپنی دولت و حشمت سے محروم ہونے کے لیے کسی مسیحی کا فقط اتنا دعویٰ کافی تھا کہ فلاں جائداد مجھ سے چھین کر اس کو دی گئی تھی، اور حقیقت یہی ہے کہ مسیحیت کو اسی قانون کے خوف و دہشت نے پھیلایا ہے، بے شک یہ قانون صدیوں کی جدوجہد، سیکڑوں جنگوں اور ہزارہا حملہ آوریوں سے بھی زیادہ مؤثر اور خطرناک تھا! بہرحال حکومت کی سرپرستی اور اس کی پشت پناہی کے نتیجہ میں کلیسا ایک مضبوط و مستحکم ادارہ بن گیا، اور آگے کے دنوں میں اس کا رسوخ بڑھتا ہی رہا۔ (۲)

شریعت ساز کونسلیں

کونسل سے مراد وہ مذہبی اجتماع یا دوسرے لفظوں میں ''شریعت ساز مجلس'' ہے جس میں حکومت کی نگرانی اور

---

(۱) تاریخ ارض مقدس از مولانا عبدالحلیم شرر، صفحہ: ۱۳۲-۱۳۶

(۲) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: تاریخ ارض مقدس، صفحہ ۱۳۷/ مولانا عبدالحلیم شرر

اس کے زیر اثر کلیساؤں اور مذہبی جماعتوں کی نمائندگی ہوتی تھی، عقائد واعمال پر مباحثے ہوتے اور پھر قرارداد کے ذریعہ ان کو "عیسائی عقائد" میں شامل کرلیا جاتا تھا، مؤیدین نوازے جاتے تھے، اور مخالفین آزمائے جاتے تھے۔

نیقیہ کی کونسل سب سے پہلی کونسل تھی، اگرچہ اس کونسل نے مذہب کے بنیادی عقائد کو مدون کردیا تھا لیکن یہ عقائد کچھ اس قدر گنجلک اور مبہم تھے کہ ان کی تعبیرات وتشریحات میں عرصۂ دراز تک شدید اختلاف جاری رہا، اس اختلاف کو دور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر علمائے مسیحیت کی بڑی بڑی کونسلیں منعقد ہوتی رہیں جن کی مجموعی تعداد اکیس (21) تک پہنچتی ہے، سب آخری کونسل ویٹکن دوم (Vatican II) ہے جو 1962 تا 1965ء میں منعقد ہے۔ (1)

چوتھی اور پانچویں صدی میں مسیحیت اپنے تدوینی مراحل سے گذر رہی تھی، جس کی وجہ سے مذہبی مباحثے اپنے شباب پر تھے اسی لیے اس زمانہ کو عیسائی مؤرخین "عہد مجالس" (Age of Councils) یا "عہد مباحثات" (Controvercy Period) کہتے ہیں۔ ان جملہ مجالس میں بھی چار (4) کونسلیں اس طور پر اہمیت کی حامل ہیں کہ ان کا تعلق عقیدۂ تثلیث سے تھا:

(1) نیقیہ کی پہلی کونسل (Council of Nicea) منعقدہ 325ء۔

(2) قسطنطنیہ کی پہلی کونسل (Council of Constantinople) منعقدہ 381ء

(3) افسس کی کونسل (Council of Ephesus) منعقدہ 431ء۔

(4) خلقدونیہ کی کونسل (Council of Chalcedon) منعقدہ 451ء۔

نیقیہ کی کونسل

جب عالم مسیحیت شہنشاہ قسطنطین کی پناہ میں آیا تو شہنشاہ کو عیسائی دنیا میں فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ اس وقت مصری، شامی، یونانی اور رومی کلیسا ایک دوسرے سے سنگین اختلافات رکھتے تھے، ہر کلیسا کے اپنے اعتقادات تھے جو جزء ایمان بن چکے تھے، ہر کلیسا صرف خود کو حضرت عیسیٰ کا حقیقی جانشین سمجھتا تھا اور باقی سارے کلیسا کو کافر۔

کلیساؤں کے مابین شدید ترین اختلاف حضرت عیسیٰ کا مقام اور ان کی حیثیت اور عقیدۂ تثلیث کی نوعیت پر تھا، یونان ومصر فلسفہ کے گہوارے تھے، شام مذاہب کا مولد ومسکن تھا، جبکہ روم کا مزاج سپاہیانہ تھا، پس ہر کلیسا کی فکر کا انداز

---

(1) *http://www.papalencyclicals.net/Councils/index.htm*

جداگانہ تھا، ہر علاقہ میں مذہبی فرقہ بندی تھی، اوران فرقوں میں حضرت عیسیٰ کی شخصیت کے بارے میں خاصا اختلاف تھا کہ وہ صرف خدا کے رسول ہیں یا رسالت سے آگے بڑھ کر ''ابن اللہ'' بھی ہیں، پھر وہ ابن حقیقی ہیں یا اصطلاحی۔

کلیسائے روم اور مصر کا کلیسائے اسکندریہ الوہیت وابنیت مسیح کا قائل تھا جو عقیدہ پولس نے دیا تھا، اور مصر کا مفکر آریوس (Arius) کلیسا کے خلاف تھا اور کسی بھی صورت حضرت عیسیٰ کو ''ابن اللہ'' تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا، اس ذہنی انتشار اور مذہبی فرقہ بندی کی وجہ سے ملک کا امن وامان بھی متاثر ہو رہا تھا، اس لیے شہنشاہ قسطنطین نے عیسائی علماء کی ایک کونسل منعقد کرانے کا فیصلہ کیا۔

325ء شہنشاہ کے حکم پر یہ کونسل منعقد ہوئی، جس کے لیے دارالحکومت قسطنطیہ کے قریب ہی مقام نیقیہ (Nicaea) کا انتخاب ہوا تا کہ کونسل میں شہنشاہ بھی شریک ہو اور مکمل کارروائی خود اس کی نگرانی میں ہو۔ چنانچہ تقریباً 318 بشپ اور بڑی تعداد میں ارباب کلیسا اس کونسل میں شریک ہوئے، اور شہنشاہ قسطنطین نے شاہی جاہ وجلال کے ساتھ اس کی صدارت کی:

"About 318 Bishops and a number of "church" leaders attended this meeting. Constantine presided over it with great displays of pomp and power."(1)

نیقیہ میں منعقد ہوئی یہ اہم ترین کونسل تاریخ مسیحیت میں ''پہلی عالمگیر کونسل'' (First Ecumenical Council) کہلاتی ہے۔ اس کونسل کا اہم ترین مبحث آریوس اور اس کے حامیوں کے نظریات تھے، جو یہ کہتے تھے:

"The son of God was not eternal, but created by The Father."(2)

(خدا کا بیٹا ازلی نہیں ہے بلکہ باپ کا پیدا کیا ہوا ہے)

دوسری طرف ان کے مخالفین حضرت عیسیٰ کی ازلیت پر زور دیتے تھے، مجلس میں آریوس کے موافقین ومخالفین کی بڑی کثرت موجود تھی، کونسل کی کارروائی تقریباً دو ماہ تک جاری رہی، اس دوران مناقشات نے محاربات اور ہاتھا پائی کی شکل اختیار کر لی، لیکن خاطر خواہ کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

قسطنطین نہ فلسفی تھا اور نہ کوئی بڑا مذہبی، بلکہ مسیحیت بھی اس نے بستر مرگ پر قبول کی تھی، وہ بنیادی طور پر ایک رومن جنرل تھا، اس لیے اسے فلسفیانہ موشگافیوں، الٰہیاتی مباحث اور علم کلام کی گہرائیوں سے زیادہ ملک کے امن وامان سے دلچسپی تھی، جب دو مہینے تک کی لاحاصل بحثوں اور شدید اختلافات کے پیش نظر افہام وتفہیم کی توقع نہ رہ گئی تو اس نے جنرل کا کردار ادا کیا، اور ''اتحاد جوہر'' کے رومی عقیدہ کے اضافہ کے ساتھ کلیسائے رومن کے ''عقیدۂ الوہیت'' کے حق میں فیصلہ کر دیا، ''اتحاد جوہر'' کا مطلب یہ تھا کہ بیٹا اور باپ ''ایک ہی جوہر'' سے ہیں یعنی یسوع

---

(1) A Study of Church History By Gene Taylor

(2) Oxford Dictonary of Church, P.80

مکمل طور پر خدا بھی ہیں اور مکمل طور پر انسان بھی (Fully God and Truly Man)۔[1]

پروفیسر لیٹز مین (H.Letizmann) اپنی کتاب ''تاریخ کلیسیا'' میں لکھتا ہے:

"It is a quite astonishing that the Emperor should have placed great emphasis on introducing in to the creed a term that hitherto neither of the parties had put forward, the terms 'homoustos'."(2)

(یہ بات خاصی حیران کن ہے کہ بادشاہ نے عقیدہ میں ایک ایسی اصطلاح شامل کرنے پر بڑا زور دیا جو فریقین میں سے کسی نے پیش نہیں کی تھی، یعنی ''اتحاد جوہر'' کی اصطلاح)

گویا یہ فیصلہ جو آئندہ ''عقیدہ تثلیث'' کی بنیاد بنا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام یا انجیل حتی کہ محرف شدہ انجیل پر بھی مبنی نہ تھا، لیکن پھر بھی مادیت پرست پادریوں نے اس پر مہر تصدیق ثبت کردی، اور حد تو یہ کہ بعد میں اسی عقیدہ کی بنیاد پر لاکھوں افراد کو مرتد قرار دے دیا گیا، پھر انھیں زندہ جلایا گیا، قتل کیا گیا اور تباہ و برباد کیا گیا۔

قسطنطین اعظم کا فیصلہ طاقت کے زور پر نافذ ہوا اور یہ اعلان کردیا گیا:

''وہ لوگ جو اس مقدس کونسل کے آسمانی فیصلہ سے متفق نہ ہوں وہ جلاوطنی کے لیے فوراً تیار ہو جائیں۔''(۳)

کونسل کا یہ فیصلہ آریوسی (Arian) عقیدہ کے بالکل خلاف تھا، کونسل میں ایسے چیدہ چیدہ اصحاب بھی تھے جو گرچہ آریوسی نہیں تھے پھر بھی اس فیصلہ کے حق میں نہیں تھے، تاہم وہ بھی ''بادل نخواستہ'' اس فیصلہ پر تائیدی دستخط کرنے پر مجبور تھے۔ آریوس کے حامیوں کو جلاوطن کردیا گیا، جلاوطنی اور مصائب سے تنگ آکر انھوں نے بھی عقیدہ کی دستاویز پر دستخط کردیے، اور اس طرح ''عقیدۂ نیقیہ'' کلیسا کے عقائد کی بنیاد بن گیا۔ بعد میں جتنی بھی کونسلیں منعقد ہوئیں ان میں اسی کونسل کا حوالہ دیا جاتا اور اس میں پاس ہوئیں قرارداد کو اور مضبوط کیا جاتا۔ اس طرح عالمی کونسلوں کے مختلف فیصلے قسطنطین اور اس کے جانشینوں کی خواہشات اور شاہ پسند، بے ضمیر اور لالچی پادریوں کی ملی بھگت سے ہوتے رہے، جس کے ذریعہ انھوں نے عیسائیت کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔

کلیسا کا اقبال

نیقیہ کے فیصلہ کے بعد کلیسائے روم اپنے رقیب کلیساؤں (کلیسائے یروشلم، اسکندریہ، قسطنطنیہ، انطاکیہ) پر غالب آگیا، مخالفین کو سختی سے کچلا گیا، غیر متفق پادری معتوب ہوئے، آریوس کو جلاوطن کیا گیا، جن مشکوک حالات

---

(1) The First Advance (Church History) by John Foster,P.140

(2) The Beginning of the Christian Church by Hans Leitzman, PP.118-119 (بحوالہ عیسائیت تجزیہ و مطالعہ از پروفیسر ساجد میر صفحہ ۱۰۶)

(3) The Decline and fall of Roman Empire,V.11, P.356

میں اس کی موت ہوئی اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اسے عمداً راستہ سے ہٹایا گیا تھا، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا، سڑکوں پر لاشوں کی نمائش کی گئی، اور اس طرح کلیسا کے غلبہ کی راہ ہموار ہوگئی۔

شہنشاہ کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد بادشاہ کو عملاً مرکزی رہنما تسلیم کرلیا گیا، جس کے تحت روم، قسطنطنیہ، اسکندریہ، انطاکیہ، اور یروشلم کے سبھی کلیسا تھے، رفتہ رفتہ ان میں سے رومی کلیسا اور اس کے سربراہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہونے لگی، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شہنشاہ نے روم کے بجائے قسطنطنیہ کو اپنا دارالحکومت بنالیا جس کی وجہ سے رومی کلیسا کا سربراہ ہمہ وقتی شاہی اثر سے آزاد ہوگیا اور پہلے سے زیادہ مضبوط بھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کلیسائے روم کا دعوی تھا کہ اس کا بانی پطرس حواری تھا۔

متی کی انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا:

''تم پطرس ہو، ایک چٹان، اس چٹان پر میں اپنا کلیسا تعمیر کروں گا، اور کہا کہ آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں میں تجھے دوں گا، اس زمین پر دیا جانے والا تیرا فیصلہ وہ خدا کا فیصلہ ہوگا، اور اس زمین پر دی جانے والی معافی خدا کی معافی ہوگی۔''(۱)

مذکورہ وجوہات کے علاوہ رومی کلیسا کے سربراہوں کا خوش آمدی مزاج اور چاپلوسانہ طریقوں نے بھی خوب فائدہ پہنچایا، چنانچہ نیقیہ کی کونسل کے بعد جتنی بھی کونسلیں منعقد ہوئیں ان سب میں کلیسا نے حکومت کے نظریات اور اس کی مرضی کی ہی تائید کی، جس کے انعام کے طور پر کلیسا کو حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل ہوئی، دربار میں عہدے ملے، جائدادیں ملیں، حکومت میں اختیارات ملے، اور معاشرہ میں غیر معمولی رسوخ حاصل ہوا۔

اس طرح شہنشاہ کی سرپرستی نے کلیسا کو ایک نہایت طاقتور اور خودمختار ادارہ بنادیا، رفتہ رفتہ یہ اقتدار اس قدر بڑھا کہ ہر صاحب اقتدار اس کے رحم وکرم پر تھا، صرف شہنشاہ اور اس کے افراد خاندان اس کی دسترس سے باہر تھے، کلیسا اگر کسی کو مذہب سے خارج کردیتا تو خود شہنشاہ بھی مداخلت نہیں کرسکتا تھا۔

کلیسا نے اپنے اثر ورسوخ کا بے جا استعمال شروع کیا، پرتشدد ظلم وزیادتی کے ذریعہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی شرک وبت پرستی کا خاتمہ کردیا، لوگوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، جن لوگوں نے انکار کیا انھیں تہہ تیغ کردیا گیا۔ اس طرح سوسائٹی میں کلیسا کے اثرات گہرے اور دوررس ہوتے گئے۔ کلیسا کی گرفت معاشرہ پر اتنی مضبوط ہوگئی کہ اس نے دولت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عقل وروح پر بھی ٹیکس لگادیے، ان سے عشر وتاوان لیا جاتا، انھیں مجبور کیا جاتا کہ وہ کلیسا کی زمینوں میں مفت کام کریں، اور کلیسا کے حامی لشکروں میں زبردستی شامل کیا جاتا، یہ گویا حکومت کے اندر ایک نئی حکومت کا آغاز تھا۔

---

(۱) متی/۱۶:۱۸

کلیسا کے مخالفین کی جب فہرست جاری ہوتی تو عوام ان کا جینا دوبھر کر دیتے، بعض مرتبہ اسے عشائے ربانی میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اور بعض مرتبہ باقی جماعت اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا بند کر دیتی تھی، جسے لاطینی میں "Aquae et igins interdictio" کہتے تھے یعنی پانی اور آگ بند کرنا جو ہمارے اردو محاورہ "حقہ پانی بند کر دینے" کے بہت قریب ہے۔ (۱) حتی کہ لوگ اس کے جنازہ میں بھی شریک نہیں ہوتے، اس آمرانہ تسلط کے سبب ہر کوئی کلیسا کے آستانہ پر سجدہ ریز ہونے کو مجبور تھا۔

کلیسا کے عہدے ومناصب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواریوں (رسولوں) وابتدائی عیسائیوں نے کلیسائیں قائم کیں، ان کلیساؤں کے تحت مسیحیت کی تبلیغ واشاعت اور عیسائیوں کی مذہبی رہنمائی کی جاتی تھی، جب کام کا دباؤ بڑھ گیا تو رسولوں نے اپنے لیے سات معاون ومددگار متعین کیے، ان معاونین کو اصطلاحی طور پر "ڈیکن" (Deacon) کہا جاتا تھا۔ (۲)

رسولی زمانہ میں کلیسائی نظام کو عام طور پر بزرگوں یا پاسبانوں کی انتظامیہ چلاتی تھی، ہر ایک مقامی کلیسا کی اپنی انتظامیہ ہوتی تھی، ڈیکن نظم ونسق میں مدد کرتے تھے اور رسول ومبشر کلیسا کی عام دیکھ بھال کیا کرتے تھے، اس "کلیسائی بورڈ" میں سے ایک بزرگ کو مستقل صدر مقرر کر دیا جاتا تھا اور اسے بطور خاص "نگہبان" (Bishop) کا لقب دیا جاتا تھا۔ (۳)

نیقیہ کی کونسل کے بعد جب کلیسا نے اقتدار ورسوخ حاصل کر لیا اور اسے حکومت میں بہت کچھ اختیارات بھی نصیب ہوئے تو اس کے عہدوں ومنصبوں کی اہمیت بھی خوب بڑھ گئی، کیونکہ یہ عہدے سرکاری عہدوں سے کسی بھی صورت کم نہ تھے، بلکہ بعض اعتبارات سے ان پر بھی فائق تھے، اسی لیے ان عہدوں کے حصول کے لیے بڑی بڑی لڑائیاں ہونے لگیں، رشوتیں دی جانے لگیں، سازشیں رچی جانے لگیں حتی کہ قتل کی واردات بھی ہونے لگیں، کیونکہ ان عہدوں کے ذریعہ سیم وزر، اعزاز واکرام اور پرتعیش زندگی کا حصول بہت ہی آسان تھا، بالآخر نئے عہدے بھی وضع کیے گئے، اور اختیارات میں اضافے بھی کیے گئے، ان عہدوں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

---

(۱) قاموس الکتاب: ۸۰۵

(۲) اعمال ۶:۱-۶/ ڈیکن یونانی لفظ Diakonos کی انگریزی شکل ہے، اس کا اردو ترجمہ خادم کیا گیا ہے (قاموس الکتاب: ۴۲۱) اسی کو عربی میں شماس کہتے ہیں

(۳) قاموس الکتاب: ۸۰۸

پوپ/پاپائے اعظم:

کلیسائے روم کے سب سے بڑے پادری (Arch-Bishop of Rome) یعنی کیتھولک عیسائیوں کے سربراہ کو "پوپ" (Pope) کہا جاتا ہے، تحریک اصلاح کلیسا سے پہلے پوپ ہی تقریباً سارے عالم مسیحیت کا سربراہ ہوتا تھا۔

مسیحی عقائد کی دنیا میں پوپ کو پہلے پطرس کا جانشین (Successor) اور پھر حضرت عیسیٰ کا نائب (Vicar of Christ) کہا گیا، اور پھر اس حیثیت سے اسے معصوم عن الخطا (Infallible) قرار دے دیا گیا۔ (۱)

پوپ کا صدر مقام "ویٹی کن سٹی" (Vatican City) ہے۔ (۲)

ابتدا میں اس عہدہ کا حامل بشپ (Bishop) کہلاتا تھا جو سبھی کلیساؤں کے صدر کے لیے عام تھا۔

کلیسائی تاریخ میں اب تک دوسو چھانچھٹ (266) پوپ عزت وذلت کے ساتھ گذر چکے ہیں، 2013ء سے منصب پاپائیت پر پوپ فرانسس (Pop Francis) فائز ہے جو کہ ترتیب میں دوسو سڑسٹھواں (267) پوپ ہے۔ (۳)

پوپ کا انتخاب

نئے پوپ کے انتخاب سے قبل ایک قدیم رسم یہ چلی آرہی ہے کہ فوت شدہ پوپ کی میت کے پاس تین بار اس کا پیدائشی نام لے کر پکارا جاتا ہے، پھر چاندی کے ایک چھوٹے سے ہتھوڑے سے اس کے سر پر تین ضربیں لگائی جاتی ہیں اور اس بعد اس کے منہ پر ایک جالی دار کپڑا ڈال دیا جاتا ہے، اس رسم کے بعد پوپ کے انتقال کا حتمی اعلان کر دیا جاتا ہے۔ ایک مختصر سی تقریب میں اس کی انگوٹھی، مہر اور سرکاری نشانیاں تلف کر دی جاتی ہیں، اب یہ صرف ایک روایتی عمل ہے جبکہ پہلے اس کا مقصد جعل سازی کے امکان کا خاتمہ تھا۔

اس کی تدفین کے رسمیں ادا کی جاتی ہیں، انیسویں صدی تک پاپائے روم کا دل علیحدہ دفن کیا جاتا تھا، تدفین کے بعد نو روز تک اس کا سوگ منایا جاتا ہے۔ پوپ کے کمرہ سے پوپ کی لاش باہر نکالنے کے بعد اس کمرہ کو پوری

---

(1) Christianity on Trial by Colin Champan, PP.32-33

(۲) ویٹی کن سٹی (Vatican City) اٹلی کے شہر روم میں واقع ہے، یہ ایک خودمختار ریاست ہے جو کہ تقریباً چاروں طرف سے دیواروں سے گھری ہوئی ہے، اس کا کل رقبہ 44 ہیکٹر ہے، آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے چھوٹی خودمختار ریاست ہے، جو کہ 1929ء میں قائم کی گئی تھی، اس ریاست کا سربراہ "پاپائے روم" ہوتا ہے، پاپائے روم کی رہائش گاہ کو "اپوسٹالک محل" (Apostolic Palace) کہا جاتا ہے۔ (بحوالہ: آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا)

(3)http://www.papalencyclicals.net/popelist.htm

طرح خالی کر دیا جاتا ہے اور پھر نئے پوپ کے انتخاب تک اس میں تالا لگا دیا جاتا ہے۔ نئے پوپ کا انتخاب رائے شماری کے ذریعہ ہوتا ہے، اور اسے اس قدر خفیہ رکھا جاتا ہے کہ کارڈینل کو بھی اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ کس نے کس کے حق میں ووٹ کیا ہے۔ سبھی کارڈینلوں کو پوپ کے محل کے ایک ہال میں جمع کیا جاتا ہے، اس اجتماع کو ''کانکلیو'' (Conclave) کہا جاتا ہے، ہال میں جمع ہونے کے بعد کسی بھی کارڈینل کو خارجی رابطہ کی اجازت نہیں ہوتی، پہلے کوشش ہوتی ہے کہ اتفاق رائے سے کسی کو پوپ منتخب کر لیا جائے، جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو پھر خفیہ بیلٹ کے ذریعہ دو تہائی اکثریت سے نیا پوپ منتخب کرنے کی کوشش ہوتی ہے، ہر روز دو بار بیلٹ ہوتے ہیں، اور اگر تیرہ دن میں بھی یہ ممکن نہ ہوا تو پھر سادہ اکثریت کے ذریعہ فیصلہ کیا جاتا ہے، رائے شماری کی ساری پرچیاں نذر آتش کر دی جاتی ہیں، پھر پوپ کے محل کی چمنی سے سفید دھواں اٹھتا ہے، یہ گویا علامت ہوتی ہے کہ نیا پوپ منتخب کر لیا گیا ہے۔ (۱)

مشہور پاپائے اعظم

کلیسا کی تاریخ میں چار پاپائے اعظم کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت ملی، ان چار پوپ کو علمائے کلیسا (Doctors of the Church) کہا جاتا ہے، ان کے نام ہیں:

(۱) سینٹ ایمبروس (St.Ambrose)

(۲) سینٹ جیروم (St. Jerome)

(۳) سینٹ آگسٹائن (St.Augustine)

(۴) پوپ گریگوری اعظم (Pope Gregory the Great)

بدنام پاپائے اعظم

پاپائیت کے منصب پر فائز ہونے والے ''اکثر پوپ'' اپنی دنیا پرستی، شہوت پرستی، جاہ پرستی اور زن پرستی میں خاصے بدنام تھے لیکن ان میں بھی چند پوپ اپنی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے نہ صرف بدنام تھے بلکہ بدنامی کی مثال تھے، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) پوپ الیگزینڈر ششم (AlexanderVI)

(۲) پوپ اسٹیفن ششم (Stephen VI)

(۳) پوپ جان دوازدہم (John XII)

---

(1)www.bbc.com/urdu/regional/story/2205/04/050403_papacy_ history-zs.shtml

(۴)پوپ اربن ششم (Urban VI)

(۵)پوپ بینڈکٹ نہم (Benedict IX)

(۶)پوپ لیودہم (Lio X)

(۷)پوپ بنی فیس ہشتم (Boniface VIII)

کارڈنیل بشپ

پوپ کے بعد کارڈنیل بشپ (Cardinal Bishop) کا عہدہ ہوتا ہے جسے صرف ''کارڈنیل'' بھی کہا جاتا ہے، کارڈنیل کا تقرر پوپ کرتا ہے۔

کارڈینلوں کی مجموعی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، جو دوسو (200) سے زائد تک بھی ہوسکتی ہے، اس مجموعہ کو "College of Cardinals" کہتے ہیں۔

کارڈینل ابتدا میں کسی بھی عام پادری اور بالخصوص روم کے پادری کو کہا جاتا تھا، آٹھویں صدی کے قریب جب پاپاؤں کا اختیار وسیع ہوگیا اور انھیں خصوصی معاونین کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے کارڈینل بشپ یا اسقف اعظم کا عہدہ بنالیا، جو انتظامی امور میں نگراں اور کلیسائی امور میں پوپ کا معاون ہوتا ہے۔ مسیحیت میں کارڈینل کو ''رسولوں کے جانشین'' کا مرتبہ حاصل ہے۔

نئے پاپ کا انتخاب بھی انہیں کے ذمہ ہوتا ہے اور انہیں میں سے ہوتا ہے۔

آرچ بشپ

مرکزی حلقہ کا بشپ آرچ بشپ (Arch-Bishop) کہلاتا ہے، علاقہ کے سارے بشپ اس کے ماتحت ہوتے ہیں، ایک کارڈینل بھی آرچ بشپ کا عہدہ سنبھال سکتا ہے۔

بشپ

مخصوص علاقہ (Diocese) کے بڑی پادری کو بشپ (Bishop) کہتے ہیں۔ یہ اپنے علاقہ کا روحانی حکمراں اور وہاں کے چھوٹے پادریوں کا نگراں ہوتا ہے۔

پادری

ایک کلیسا کے ناظم کو پادری (Priest / Padre) کہتے ہیں، یہ پادری شادی اور موت کی رسومات ادا کرواتا ہے، کلیسا میں ''اعتراف گناہ'' بھی اسی پادری کے سامنے کیا جاتا ہے، اس پادری کو "Confessor" بھی کہا جاتا

CamScanner

ہے، نیز یہی پادری مسیحیت کی تبلیغ اور اس کی تعلیمات کی وضاحت کرتا ہے، عام مسیحیوں کا سب سے زیادہ واسطہ اسی پادری سے پڑتا ہے۔

چھوٹا پادری

چھوٹا پادری (Deacon) دراصل زیر تربیت پادری کو کہتے ہیں، یہ عموماً خیرات وصدقات کا منتظم اور مذہبی معاملات میں بڑے پادری کا معاون ہوتا ہے، یہ چھوٹا پادری چاہے تو شادی کرسکتا ہے لیکن پھر اس کی آگے ترقی نہیں ہوسکتی۔

کلیسا کا اصلاحی کردار

کلیسا کا آغاز نہایت کسمپرسی و درماندگی کی حالت میں ہوا تھا، لیکن اس نے آتے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے سوا دنیا کے تمام مذاہب باطل ہیں، اس کے بعد گرچہ اس کے ہمنواؤں کو اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں، یہود اور روم دونوں اس کے سخت خلاف تھے، لیکن حواریوں کی پاکیزہ زندگی، اور کلیسا کی ابتدائی تعلیم اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتی تھی، جس نے لوگوں کو جوق در جوق اپنی طرف مائل کرلیا۔

کلیسا نے مذہبی تعلیمات کو انسانی دماغ کی پیداوار اور بشری کوششوں کے نتائج کے بجائے فرمان ربانی اور کلام ایزدی کے طور پر پیش کیا، اور مختلف پیرایوں میں بار بار یہ ظاہر کیا کہ مذہب کی حقیقت شناسی کے لیے دماغ کی جگہ قلب کی، بحث واستدلال کی جگہ خشوع وخضوع کی، عقل کی جگہ عقیدہ کی اور دلیل وبرہان کے بجائے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔

کلیسا کی دعوت وتبلیغ کا محور خدا کی وحدانیت، عقیدۂ آخرت اور اخلاق کی پاکیزگی ہی تھا، اس نے اخلاقی پاکیزگی کو نجات اخروی کا ذریعہ بنایا اور حسن اخلاق کے لیے وہ محرکات ومرغبات فراہم کردیے جن سے عوام وخواص دونوں برابر متاثر ہوتے تھے، اس طرح اس نے اخلاق ومذہب کے ڈانڈے ملا دیے تھے۔

کلیسا نے اخلاقی تعلیمات کو مؤثر بنانے کے لیے بالکل نیا اسلوب اختیار کیا، سب سے پہلے اس نے دنیا کو حیات بعد الموت سے آگاہ کرایا، اس نے قیامت کے آنے، بدکاروں کے واصل جہنم ہونے اور نیک کاروں کے داخل جنت ہونے کی بشارت دی، دیگر مذاہب میں یہ تخیل اگر تھا بھی تو بہت ہی دھندلا اور مبہم، کلیسا نے اسے پوری وضاحت وقطعیت کے ساتھ پیش کیا، دوسرے یہ کہ اس نے یہ باور کرایا کہ ہر نفس کو اپنے جزئیات اعمال تک کا فرداً فرداً حساب دینا ہوگا اور وہاں پر سزائیں عارضی نہیں بلکہ دائمی ہوں گی۔ یہ دونوں طریقے دنیا کے لیے بالکل نئے تھے اور ان کا عام قلوب پر بے حد اثر پڑا، اب تک لوگ عاقبت کی طرف سے بالکل غافل وبے خبر رہتے تھے، لیکن

کلیسا کی اس تبلیغ کے بعد انہیں اپنے ہر معمولی قول وفعل پر بھی ذمہ داری کا احساس ہونے لگا، اور انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی یوم آخرت کے محاسبہ و باز پرس سے باہر نہیں رہ سکتا، خواہ دنیا میں وہ سب کی نظر سے مخفی رہے۔

کلیسا کی اصلاحی تحریک کا یہ اثر تھا کہ لوگ کھلم کھلا برائی کرنے میں جھجک محسوس کرنے لگے۔ ان کی طبیعتیں نیکی کی طرف مائل ہونے لگیں، لوگ گناہ کرتے تھے مگر ساتھ ہی یہ دہشت بھی دلوں پر طاری رہتی تھی کہ عاقبت میں اس کی سزا بھگتنی ہوگی، جب کسی معصیت کا ارتکاب کرنے لگتے تو ضمیر کی ملامت شروع ہو جاتی اور کم از کم دنیا کے سامنے اپنی رُسوائی وذلت کا خوف بہر حال لگا رہتا تھا، غرض وہ بے خوفی، ڈھٹائی اور بے شرمی جو بیشتر گناہ گاروں میں تھی مسیحیت کے اثر سے جاتی رہی تھی، اور معاشرہ بدی و برائی کی گھٹن سے نکل کر فلاح وکامرانی کی آزاد فضا میں سانس لینے لگا تھا۔ کلیسا کا یہ سنہرا دور ''رسولوں کے عہد'' تک مخصوص تھا۔

کلیسا کا اخلاقی انحطاط

رسولی دور اور اس کے بعد آزمائشی دور میں کلیسا کی حیثیت ایک سنگ میل کی تھی یا یوں کہیے کہ مسیحیت کے وسیع تر دائرہ کا وہ نقطۂ ارتکاز تھا، لیکن جب اس کو شہنشاہ قسطنطین کی سرپرستی حاصل ہوئی اور حکومت کی پشت پناہی میں اسے استحکام نصیب ہوا تو اس کے ذمہ داران نے اپنی روش ہی بدل ڈالی، دنیا تیز گام قدموں سے ان کی جھولی میں آگری لیکن مذہب ان کی زندگیوں سے دبے پاؤں رخصت ہوتا گیا، اقتدار کے غرہ میں ارباب کلیسا نے عیسائیت بلکہ انسانیت کے جملہ اقدار کو بے آبرو کر دیا، وہ دنیا کے خوگر اور جاہ ومنصب کے گرویدہ ہوتے گئے، اور پھر وہ ساری خرابیاں اور اخلاقی برائیاں ان میں در آئیں جو عام سطح کے عیش پرست حکمرانوں میں ہوا کرتی ہیں۔

اگلے صفحات میں ارباب کلیسا کی انہیں مذہبی واخلاقی انحطاط اور مسیحی سماج پر کلیسا کے دور رس اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

CamScanner

کلیسا کی حکمرانی

کلیسا کی عالمگیر طاقت وسطوت اور اس کے بے پناہ رسوخ اور پھر اس کے نتیجہ میں عوام کے ہر طبقہ پر ظلم وبربریت کی طویل داستاں کو سمجھنے سے پہلے رومن امپائر کے تاریخی وسیاسی حالات کا مختصر جائزہ ضروری ہے:

سلطنت روم کا ماضی چار حصوں میں منقسم ہے؛(۱)رومی جمہوریہ (۲)رومی سلطنت (۳)مشرقی سلطنت روم(۴)مغربی سلطنت روم۔

رومی جمہوریہ (Roman Republic)

رومی تہذیب وثقافت کے اولین معمار ایشیائے کوچک کے باشندے ''ایٹرسکن'' (Etruecans) تھے، انھوں نے شمالی اطالیہ پر قبضہ کیا،اور صنعت وتجارت اور تہذیب وثقافت کے میدان میں خوب ترقی کی،حکومت کی سرحدوں کو وسیع کیااور تقریباً ڈھائی سو سال حکمرانی کرنے کے بعد 474ق م میں وہ پردۂ گمنامی میں چھپ گئے،اس دوران اطالیہ کی ایک جماعت جزیرۂ منی کے جنوبی حصہ کی نوآبادیوں کے شمال میں آباد ہوگئی، یہ ایک مقدس پہاڑی کے اطراف میں بارہ قصبوں پر مشتمل تھے،اور یہ لوگ ''لاطینی'' کہلاتے تھے،ان نوآبادیوں کی ایک جماعت دریائے ٹائبر (Tiber) کے کنارے آباد ہوئی جہاں ڈھلوان پہاڑیاں واقع تھیں، جوزیادہ بلند تو نہ تھیں لیکن مدافعت کے لیے کافی تھیں،ان نوآبادیوں کو پہلے پہل تاجروں اور پناہ گزینوں نے آباد کیا تھا،بعد میں یہی نوآبادیاں باہم مل گئیں اور ''شہر روم'' بن گیا۔

ابتدائی زمانہ میں روم پر بادشاہوں یا سرداروں کی حکومت تھی، بادشاہ کو امن وجنگ دونوں زمانوں میں بڑا اقتدار حاصل تھا،وہی سب سے بڑا مذہبی پیشوا اور صدر عدلیہ بھی ہوتا تھا،رومیوں نے اس اقتدار کا نام ''امپیریم'' رکھا تھا،اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ امیروں کو طلب کر کے ان سے مشورہ کرے گا،اور عوام کی بھلائی میں ہی فیصلہ کرے گا،ان امیروں کی ایک جماعت تھی جو ''سینیٹ'' (Senate) کہلاتی تھی،اگر بادشاہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتا تو یہ طبقہ اس کی مخالفت کرتا،ان امیروں کے نیچے عوام کا طبقہ تھا۔

چھٹی صدی قبل مسیح کے آخر میں روم پر بیرونی حملے ہوئے اور ایک قبائلی حکمراں نے جس کی نسبت

CamScanner

''ایٹرسکن'' (Etruecans) کی طرف کی جاتی ہے روم کو تاراج کر دیا، لوٹ مار اور قتل وغارت گری میں ملک کی بنیادیں ہل گئیں، بالآخر رومی باشندے اس غیر ملکی استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، اور ایک سخت کشمکش کے بعد اپنے شہر کی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، اس عمومی تباہی نے رومی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا، مگر رومیوں نے اپنے قدامت پسند مزاج کی بنیاد پر شاہی اقتدار اعلیٰ یعنی ''امپیریم'' کو باقی رکھا، البتہ اسے مضبوط و مستحکم کرنے کی غرض سے اس میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، چنانچہ بادشاہ کا فوجی اقتدار دو ججوں کو دیا گیا جو ''کونسل'' کہلاتے تھے، مذہبی پیشوائی کا حصہ جو خاص بادشاہ کا تھا وہ ایک دوسرے عہدیدار کو دیا گیا جو ''قربانیوں کا بادشاہ'' کہلاتا تھا، اس کے علاوہ بادشاہ کے عدالتی اختیارات ''پیٹرنوں'' کو دیے گئے۔ ریاست کے ان تمام عہدوں میں سب سے اہم کونسل کا عہدہ تھا جس کی مدت صرف ایک سال ہوا کرتی تھی، ان کا تقرر پوری قوم کی اسمبلی کیا کرتی تھی، اور کونسل اپنی میعاد مکمل کرنے کے بعد اسمبلی کے آگے ذمہ دار ہوا کرتے تھے۔ اس طرح رومیوں نے ''جمہوریت'' کی داغ بیل ڈالی اور اپنے استحکام اور مستقبل کی کامیابی کی طرف ایک مثبت قدم بڑھایا۔

روم کی رعایا جفاکش، محنتی اور آزاد کاشتکار تھی، لیکن ساتھ ہی یہ لوگ اپنے شہر کی خدمت اور اس کی حفاظت و بقا کے لیے فوجی نظم وضبط کے لیے بھی مستعد و سرگرم تھے، اور ہر طرح کی مصیبت جھیلنے کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے، چنانچہ تیسری صدی قبل مسیح تک یہ چھوٹی سی حکومت اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ وہ بیرون اطالیہ بسنے والی قوموں سے ٹکر لینے لگی۔ (1)

کارتھیج

''کارتھیج'' (Carthage) ایک عظیم سامی تہذیب تھی جو صنعت وتجارت میں بے مثال تھی، بحر روم کے ساحل پر جہاں اب تیونس (Titnis) واقع ہے اس کے عظیم الشان شہر آباد تھے، جس کی آبادی دس لاکھ سے بھی زائد تھی، روایات کے مطابق ملک شام کے ساحل پر رہنے والے فونیشین لوگوں (Phoenicians) نے اس کو آباد کیا تھا۔

"Carthage was a colony of the Canaanites of phoenicia and in it we find the last and perhaps the greatest empire of the Semitic Nation of Western Asia "(2)

(کارتھیج فونیشیائی کنعانیوں کی ایک کالونی تھی، یہ آخری اور شاید سب قدیم سامی حکومت تھی جو مغربی ایشیا میں قائم تھی)

---

(1) مختصر تاریخ تمدن از سید مبارز الدین رفعت (مترجم) صفحہ ۸۵-۹۸

(2)The Empires of the old world By M. Bramston. P.168.

روم کا زبردست حریف ''کارتھے جیہ'' تھا، ان دونوں کے درمیان 264 ق م سے 146 ق م یعنی ایک صدی سے زائد عرصہ تک جنگیں جاری رہیں، یہ جنگیں پونک وارز (Punic Wars) کہلاتی ہیں۔ تاریخ روم کی یہ اہم ترین جنگیں کارتھے جیہ کی مکمل تباہی پر ختم ہوئیں، جس کے بعد رومی حکومت بحر روم کی سب سے بڑی حکومت بن گئی۔ (۱)

روم کی توسیع

یونان کی قوت واقتدار کو جیسے جیسے زوال آتا گیا روم اس کی جگہ لیتا گیا، 202 ق م میں اسپین (Spain) کو روم کا صوبہ بنایا گیا، 146 ق م میں افریقہ کا علاقہ حکومت میں شامل کیا گیا، مقدونیہ اور یونان بھی اسی سال روم کے زیر نگیں آ گئے، ایشیائے کوچک اور جنوبی گال (Gaul) 118 ق م میں فتح ہوئے، اسی سال شام بھی فتح کیا گیا، 66 ق م تا 63 ق م میں آرمینیہ کی فتوحات ہوئیں، 58 ق م تا 48 ق م میں جولیس سیزر (Julius Ceasar) نے شمالی گال (فرانس) کو رومی حکومت کا حصہ بنایا، اس کے بعد آگسٹس (Augustus) نے مصر اور دریائے دینوب (Danube) کے علاقوں کو سلطنت میں شامل کیا، آگسٹس کے بعد جزائر برطانیہ کا الحاق ہوا جسے کلاڈیس (Cladius) نے 43ء میں فتح کیا، پھر 99ء میں بالائی عراق کو بھی رومی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح پہلی صدی کے اختتام تک رومی سلطنت دنیا کی عظیم ترین سلطنت بن گئی جو بحر روم سے ملحق تمام علاقوں پر مشتمل تھی۔ (۲)

رومی جمہوریہ کی تاریخ کا بڑا حصہ خانہ جنگیوں اور طبقاتی کشمکش سے عبارت ہے، استقرار کی منزل تک پہنچنے میں اسے عروج وزوال کے لمبے سفر سے گذرنا پڑا ہے، داخلی بغاوتوں کو کچلنے اور خارجی دشمنوں کو پسپا کرنے میں متعدد رومی بادشاہوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہیں، انہیں حکمرانوں میں پامپی (Pampey) اور جولیس سیزر (Julius Caesar) کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، یہ دونوں گرچہ ایک دوسرے کے سخت حریف اور داخلی انتشار وخانہ جنگی کے ذمہ دار بھی تھے لیکن سلطنت کی سرحدوں کو دور تک پھیلانے میں بے مثال جنرل ثابت ہوئے۔

جولیس سیزر عالمگیر شہرت کا حامل شہنشاہ تھا، وہ بہترین سپہ سالار اور عظیم ترین مہمات کا فاتح تھا، اپنے تمام منصوبوں اور مقاصد کے حصول میں وہ مطلق العنان آمر تھا، اپنے پیش روؤں کے مقابل اس نے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی تھی، عوام اس پر پوری طرح فریفتہ تھے، اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا روم کے مندر میں اس کا مجسمہ نصب تھا، اور اس پر یہ عبارت کندہ تھی: ''ناقابل تسخیر خدا کے لیے''، جولیس کا مقصد روم کو ایک عظیم اور مضبوط سلطنت بنانا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے منصوبوں کو پائے تکمیل تک پہنچا پاتا اس کے خلاف بغاوت ہوئی اور وہ مارا گیا۔ (۳)

---

(1) See For details: Rome and Carthage- By Bosworth Smith

(۲) دیکھئے: اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر از ڈاکٹر عبد القادر جیلانی/ ۲۵

(۳) مختصر تاریخ تمدن از سید مبارز الدین رفعت (مترجم) صفحہ/ ۹۹

رومی سلطنت(Roman Empire)

جولیس سیزر کے مرتے ہی پورے روم میں خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، بالآخر جولیس کا پروردہ، اس کا بھانجہ "گایوس اولیوئس"(Gaius Olivious) نے اپنی جنگی مہارت اور سیاسی سوجھ بوجھ سے روم کے حالات کو قابو کر کے اپنے حق میں کرلیا اور پھر مکمل فاتح ہو کر اقتدار پر قابض ہوا، اپنے عظیم کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں آگسٹس سیزر(Augustus Caesar) کے نام سے مشہور ہوا، اس کے بعد سے ہی رومی شہنشاہ آگسٹس کے لقب سے مشہور ہونے لگے۔ آگسٹس کا دور رومی تاریخ میں انتہائی عروج کا دور کہلاتا ہے۔

آگسٹس نے قابل تعریف دانشمندی و فرزانگی، رعایا پروری اور سیاسی قابلیت کے ساتھ جولیس سیزر کے سیاسی مقاصد کو مکمل کرنا شروع کیا، اور ملک کے سیاسی نظم کو قائم کرنے کا کام اتنی دانائی اور دقت نظر سے انجام دیا کہ رومی جمہوریت ایک مستحکم و مضبوط سلطنت کے طور پر ابھرنے لگی، اور یہیں سے اسے "Roman Empire" (رومی سلطنت/رومۃ الکبریٰ) کہا جانے لگا۔ اس طور پر آگسٹس رومن ایمپائر کا پہلا شہنشاہ تھا، اس نے رومن امپائر کو اس قدر مضبوط و مستحکم کردیا تھا کہ چار سو سال تک اس کی بنیادوں کو ہلایا نہ جاسکا، گرچہ اس مدت میں اس کے مختلف حکمرانوں کے دامن خونریزیوں سے داغ دار ہوتے رہے لیکن اس کے باوجود ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ سلطنت کے طول و عرض میں دیوتا کی طرح پوجے جاتے رہے۔

مشرق و مغرب کی تقسیم

رومی شہنشاہیت موروثی نہیں تھی، شہنشاہ کا انتخاب عوام اور سینیٹ (Senate) کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، یہ انتخاب شہنشاہ کے مرنے کے بعد ہی ہوتا تھا، شہنشاہ آگسٹس نے اپنے عہد میں اس میں تبدیلی کرتے ہوئے یہ اختیار صرف سینیٹ (Senate) "مجلس مدبران" تک ہی محدود رکھا، لیکن پہلی صدی عیسوی میں فوج کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ خود سینیٹ فوج کے زیر اثر آگئی، چنانچہ شہنشاہ کلاڈیس (Cladius) کی تخت نشینی کا اعلان فوج نے کیا اور سینیٹ کو اس اعلان کی توثیق کرنی پڑی۔

روم کی تاریخ میں ایسے حکمراں بھی ہوئے ہیں جن کا دور حکومت تاریخ شہنشاہیت میں بے مثال و بے نظیر سمجھا جاتا ہے، ان حکمرانوں میں ٹراجن (Trajan) ہیڈرین (Hadrian) اور اینٹونائنس (Antoninus) مقبول ترین حکمراں تھے اور ان کے دور حکومت کو مغربی مؤرخین نے اس دنیا کی تاریخ میں بہترین دور شمار کیا ہے۔ (۱)

لیکن روم کی تاریخ میں شہنشاہ کی جانشینی ایک ایسا سنگین مسئلہ تھی جس کی باعث روم کو متعدد بار خانہ جنگیوں سے

---

(۱) اردو انسائیکلو پیڈیا، ۱/۴۶۲/قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی

دوچار ہونا پڑا، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے شہنشاہوں نے متعدد طریقے اختیار کیے، کچھ مدت تک وراثتی جانشینی کی شکل بھی اختیار کی گئی لیکن کوئی بھی طریقہ مستحکم اور لمبی مدت تک قائم نہ رہ سکا، اور گاہے گاہے روم خانہ جنگی کا شکار ہوتا رہا، ایک موقع پر ایسا بھی ہوا کہ فوج نے شہنشاہ کے رتبہ کو نیلام پر چڑھا دیا، اور سب سے بڑی بولی دینے والے کے نام پر ختم کر دیا، اس کے ذریعہ جو قیمت حاصل ہوئی اسے فوج نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ لیکن حکمرانی کا نظام ابتر ہونے کی وجہ سے ملک کا امن وامان بھی غارت رہا، ہر طرح کی اخلاق سوزیاں عام ہو چکی تھیں، حالات کچھ ایسے بن رہے تھے کہ رومی سلطنت تاریخ کے صفحات میں دفن ہو جائے، لیکن مد مقابل میں کسی مضبوط طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے روم محض خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھتا رہا اور گھستے گھستے اپنے مستقبل کی جانب بڑھتا رہا۔

284ء میں "ڈیوکلے ٹیانیس" (Diocletianus) نے فوج کی مدد سے روم کا اقتدار حاصل کیا اور مطلق العنان شہنشاہ منتخب ہوا، اس نے سلطنت کے استحکام اور خانہ جنگیوں سے حفاظت کے پیش نظر رومی سلطنت کو دو انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا، اس میں سے ایک حصہ "مشرقی سلطنت روم" (Eastern Roman Empire) اور دوسرا حصہ "مغربی سلطنت روم" (Western Roman Empire) کہلایا۔

مشرقی سلطنت کا نظم ونسق اس نے خود سنبھالا اور مغربی سلطنت کی حکمرانی کے لیے اس نے میکسی میئن (Maximian) کو اپنا ہم منصب منتخب کر دیا، نیز ہر دو حکمرانوں کا ایک ایک معاون بھی متعین کیا جسے "قیصر" (Caesar) کہا جاتا تھا۔

مشرق ومغرب کی یہ تقسیم جغرافیائی اعتبار سے بھی کی جاتی ہے، بحر روم میں سسلی کے جنوب میں کیپ سورلیو (CapeSorello) اور تیونس کی کیپ بون (Cape Bone) کے درمیان تقریباً سو میل (160 کلو میٹر) عریض آبی گذرگاہ بن جاتی ہے جس کے سبب قدرتی طور پر اس کی تقسیم مشرقی ومغربی سمندروں میں ہو جاتی ہے، مشرقی بحر روم کے کنارے واقع تمام ممالک "مشرقی یورپ" اور مغربی بحر روم کے کنارے ممالک "مغربی یورپ" یا صرف "مغرب" کہلاتے ہیں۔ (۱)

قسطنطین اعظم

305ء میں ڈیوکلے ٹیانس (Diocletianus) تخت شاہی سے دستبردار ہوا، تو ہر طرف سے بڑی تعداد میں آگسٹس (شاہ کبیر) اور قیصر (شاہ صغیر) اٹھ کھڑے ہوئے، 306ء میں سات حکمرانوں کو آگسٹس ہونے کا دعویٰ تھا، شدید خانہ جنگی کے بعد 313ء میں قسطنطین (Constantine) شہنشاہ یعنی آگسٹس کی حیثیت سے تخت نشین ہوا، اور لیسی نیس (Licinius) نے قیصر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا۔

---

(۱) دیکھئے:- اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر از ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی / ۲۷

ساحل باسفورس پر بحر روم اور بحر اسود کے درمیان کا علاقہ ''بازنطین'' کہلاتا تھا جس کے تاریخی آثار 6500 ق م تک کے دریافت ہو چکے ہیں، یہ علاقہ یونان کی قلمرو میں شامل تھا، سکندر اعظم کی موت کے بعد یونانی مملکت طوائف الملوکی کا شکار ہو کر کمزور ہو گئی، اور پھر تقریباً سو سال قبل مسیح میں رومی حکومت نے اسے فتح کر کے اپنے حدود میں شامل کر لیا، شہنشاہ قسطنطین اس علاقہ کی زرخیزی اور شاندار محل وقوع کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا، کیونکہ یہ علاقہ بحری و بری رسل و رسائل کا بہترین مقام اتصال تھا اور ایک ایسا نقطۂ ارتکاز تھا جہاں سے مساوی طور پر خطروں سے گھری سرحدوں کی مدافعت کا انتظام کیا جا سکتا تھا، چنانچہ 324ء میں شہنشاہ نے اس علاقہ کو اپنے دارالحکومت کے لیے منتخب کیا، اور ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جو ''قسطنطنیہ'' (Constantinople) کے نام سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، اور جو بعد میں یورپ کا سب سے امیر ترین شہر بنا اور اسے "Vasileousa Polis" (شہروں کی ملکہ) کا لقب ملا۔ (۱)

سلطنت روم کی تقسیم

قسطنطین کی روم سے منتقلی کے بعد سے ''رومن امپائر'' کا دارالخلافہ قسطنطنیہ ہو گیا جس سے اس کی سیاسی اہمیت بڑھتی گئی، یہ منتقلی حقیقت میں مرکز اقتدار کی منتقلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، کیونکہ مشرق میں جو علاقے آباد تھے ان کی زبان یونانی تھی اور ان میں زیادہ تر یونان یا اس کی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر علاقے تھے، اور وہاں کا شہنشاہ خود کو بجز نظام قانون کے بہر صورت آگسٹس کے بجائے سکندر اعظم کا جانشیں سمجھتا تھا، مغرب اس صورتحال کو برداشت کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا، کیونکہ رومن فاتح اور حکمراں قوم تھے اور یونانی مفتوح اور محکوم اس کے علاوہ روم کے باشندے اطالوی زبان بولا کرتے تھے، رفتہ رفتہ مشرق میں یونانی اثرات بڑھنے لگے اور رومی اثرات کم ہونے لگے، اور پھر ایک قلیل مدت بعد مشرقی سلطنت صرف جزوی طور پر رومی سلطنت کے ماتحت رہ گئی، نیز اس نے قدیم رومی شہنشاہوں کے طرز پر قیصر (Caesar) کا لقب بھی اختیار کر لیا، آخرش مغرب نے بھی اپنے معاملات میں خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اس کے شہنشاہ کا تقرر سینیٹ خود کرنے لگی، اور ''روم'' اس کا دارالخلافہ قرار پایا، اس طرح چوتھی صدی عیسوی میں ''عظیم رومن امپائر'' (Great Roman Empire) دو حصوں میں منقسم ہو گیا، مشرقی سلطنت روم (Eastern Roman Empire) اور مغربی سلطنت روم (Western Roman Empire) تاہم یہ دونوں سلطنتیں رومن امپائر ہی کہلاتی تھیں۔

---

(۱) 1453ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا اور آخری بازنطینی حکمراں قسطنطین یازدہم کو شکست دی، فتح قسطنطنیہ کے ساتھ ہی قرون وسطی کا خاتمہ اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا، سلطان فاتح نے اس کا نام بدل کر ''اسلامبول'' رکھ دیا، جو مسلمانوں کی عثمانی سلطنت کا دارالخلافہ قرار پایا، اس کی یہ حیثیت 1923ء تک برقرار رہی، 1930ء میں ترکی حکومت نے اس کا نام بدل کر استنبول کر دیا اور اب یہ ترکی کا ایک اہم ترین شہر ہے۔

392ء میں قسطنطین کے جانشیں کی حیثیت سے تھیوڈوسیس (Theodosius I) روم کا شہنشاہ مقرر ہوا، اس نے کچھ مدت کے لیے مشرق و مغرب کی سلطنت کو متحد کر دیا تھا لیکن 395ء میں اس کی وفات کے بعد یہ جزوی اتحاد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور متحدہ روم شہنشاہ تھیوڈوسیس کے دو بیٹوں آرکیڈیس (Arcadius) اور ہونوریس (Honorius) کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ (۱)

لیکن اس تقسیم کے بعد بھی سلطنت کو مستحکم کرنا اور خارجی حملوں سے محفوظ رکھنا ممکن نہ ہوا کیونکہ تھیوڈوسیس کے دونوں بیٹے جوانمردی سے عاری، کمزور اور نسوانی مزاج کے حامل تھے، بقول مؤرخ:

"Both were weak and effemiate"(2)

(دونوں کمزور اور زنخے تھے)

مغربی سلطنت روم

چوتھی اور پانچویں صدی وحشی و بربر قوموں کے حملے اور مغربی سلطنت کے زوال کی صدی تھی، 372ء میں شمالی یورپ کی "ہون قوم" (Hunes) (۳) اٹھ کھڑی ہوئی، اس دوران دریائے ڈینیسٹر (Deniester) پر جرمن کی گوتھ (Goths) قوم آباد تھی۔

"The Goths had established an empire where the ancient Graeco-Scythians had once been."(4)

(گوتھ نے ان علاقوں میں ایک سلطنت کی بنیاد رکھی تھی جہاں کبھی قدیم یونانی سیتھیا قائم تھی)

گوتھ ایک وحشی و قبائلی قوم تھی جو مغربی ساحلوں کی مناسبت سے آستروگاتھ (Ostrogoths) اور ویزی گاتھ (Visigoths) کہلاتی تھی، ہون قوم کا حملہ آستروگاتھ کی سمت سے ہوا تھا، یہ حملہ اتنا زبردست اور پُر شدت تھا کہ آستروگاتھ اس کے خلاف تاب مقاومت نہ لا سکے، اور پسپا ہو کر مغربی ساحل کے علاقہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔

---

(۱) اردو انسائیکلو پیڈیا، ۱/۳۶۲۔

(2) The Empires of the world, P.257

(۳) ہون (Hunes) نیم وحشی خانہ بدوش قبیلے تھے، یہ لوگ مشرقی یورپ، قفقاز اور وسطی ایشیاء میں پہلی صدی اور ساتویں صدی کے درمیان آباد تھے، ان کا اصلی وطن سائبیریا کا صحرائی علاقہ تھا، جس کو "اسٹیپس کا میدان" (Land of Steps) کہتے ہیں، آبادی میں اضافہ کی وجہ سے انھیں خوراک ملنا مشکل ہو گیا، چنانچہ ان قبیلوں نے دوسرے علاقوں کا رخ کیا، ان کی ایک شاخ دریائے وولگا (Volga) کے راستہ یورپ میں داخل ہو گئی، جہاں انھوں نے ایک وسیع حکومت (Hunnic Empire) قائم کی، ان کا ایک مشہور سردار اتلا (Atila) تھا جس نے یورپ میں زبردست تباہی مچائی تھی، 453ء اس کی موت سے ہون حکومت کو زبردست صدمہ پہنچا اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ اور 560ء میں ترکوں کے ہاتھوں ہن مملکت کا خاتمہ ہوا۔
(The Empires of the old world, P.254)

(4) Short History of Russia by Mary Platt Parmele, P.10

مغربی ساحل پر ویزی گاتھ آباد تھے، آستروگاتھ کے بڑھتے دباؤ کے سامنے انھیں گھٹنے ٹیکنے پڑے، اور اپنا علاقہ چھوڑ کر انھیں مشرقی سلطنت روم کی سرحدوں کی طرف بڑھنا پڑا، اور ان کے سردار نے شہنشاہ سے سلطنت میں داخلہ کی اجازت طلب کی۔ اس وقت رومن افواج سلطنت کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی، اور جو فوج موجود تھی وہ ویزی گاتھ کے مقابلہ کے لیے ناکافی تھی، اور یہ سب اتنی سرعت اور افراتفری میں ہو رہا تھا کہ شہنشاہ کے پاس کسی سیاسی تدبیر کی گنجائش نہیں تھی، چنانچہ مصلحت اسی میں نظر آئی کہ ان کو سلطنت میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائے۔

یہ جرمن قوم مذہبی طور پر ایک بت پرست اور فطرتاً ایک جنگو واجڈ قوم تھی، نہ اسے کسی شہر میں بسایا جاسکتا تھا اور نہ سلطنت میں منتشر کیا جاسکتا تھا، نیز نہ وہ شہنشاہ کے احکام کے پابند تھی اور نہ رومی تہذیب وتمدن سے آشنا، پس جلد ہی وہ سلطنت کے لیے دردسر بن گئی، شہنشاہ نے اس قوم کے سربراہ کو ''رومی جنرل'' کا خطاب بھی دیا تا کہ وہ اپنی قوم کا بادشاہ بھی رہ سکے اور شہنشاہ کے تابع بھی رہے، لیکن چھ سال کا مختصر عرصہ بھی نہ گذر پایا کہ اس بیرونی قوم نے اپنے لیے ایک پسندیدہ علاقہ کا مطالبہ کرتے ہوئے بغاوت کردی۔

مشرقی سلطنت کا شہنشاہ آرکے ڈیس (Arcadius) تھا اور مغرب میں اس کا بھائی ہونوریس (Honorius) کی بادشاہت تھی، دونوں کے درمیان شروع سے ہی نزاع قائم تھا، اس زمانہ میں ''اِلاَرآ'' (Illyria) کا علاقہ دونوں کے درمیان متنازع تھا اور اس پر مغربی سلطنت کا قبضہ تھا۔ جرمن قوم کی بڑھتی بغاوت کو دیکھتے ہوئے آرکیڈیس نے اس مصیبت کا رخ مغرب کی جانب پھیر دیا، اور جرمن قوم کو اِلاَرآ پر حملہ کرنے اور قبضہ کرنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ جرمن کی ویزی گاتھ قوم نے مغربی سلطنت کے ''اِلاَرآ'' حصہ پر پوری طاقت کے ساتھ حملہ کیا وہاں کے ویلین باشندوں (Valens) کو شکست دی اور جلد ہی اس پر قابض ہوگئی:

"Alaric, King of the Goths had conquered Valens and settled in Illyria."(1)

اس فتح کے بعد اس کے قدم سرزمین اطالیہ کی جانب بڑھے جسے مغربی سلطنت نے اپنی بھرپور فوجی قوت کے ذریعہ روک دیا، اور مسلسل شکست کے ساتھ اسے پوری طرح پسپا کردیا۔

ہون قوم کی جو یلغار شروع ہوئی تھی وہ جاری تھی، اور اس کے سخت حملوں کی تاب نہ لاکر دیگر جرمن قومیں بھی پسپا ہونے اور اپنے علاقوں سے فرار ہونے پر مجبور تھیں، اس وقت مغربی سلطنت کی سرحدیں کمزور ہو چکی تھیں اس لیے ان قوموں نے اسی جانب رخ کیا اور جرمن کے قبیلۂ ویندال (Vandals) نے گال (موجودہ جنوبی

---

(1)The Empires of the World,P.257

فرانس) کا پورا علاقہ پامال کر کے بحر روم تک قبضہ جمالیا۔ اسکے بعد اسپین اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی مغربی سلطنت سے چھین کر اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔

وینڈال کی اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے برگنڈی قبائل (Burgundiones) کو بھی شہہ ملی اور اس نے شمالی اسپین اور جنوبی فرانس کو آماجگاہ بنالیا، اس طرح مغربی سلطنت روم ایک کے بعد ایک صوبہ سے محروم ہوتی ہوئی اطالیہ کی سرزمین تک محدود ہوگئی۔ پھر ایک جرمن لیڈر "راداگائی سیس" (Radagaisus) نے اطالیہ پر بھرپور حملہ کیا، گرچہ اس حملہ میں خود اسے شکست ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی اطالوی قوت مدافعت بھی ختم ہوگئی۔

اطالیہ کی قوت کے کمزور ہوتے ہی جرمن کی ویزی گاتھ قوم پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی، اور اپنے عظیم سردار الارک (Alaric) کی قیادت میں نے نئے جوش کے ساتھ اطالیہ پر حملہ کر دیا، اس حملہ میں پہلے سے ہی روم میں موجود جرمن غلاموں نے بھی ساتھ دیا جس کی وجہ سے حملہ کی اس شدت کو سلطنت کے لیے جھیلنا ناممکن تھا، چنانچہ شہنشاہ کو شکست تسلیم کرنی پڑی اور محصور ہوگیا۔ اس طرح 410ء میں گاتھ حکمراں فاتحانہ شان سے روم میں داخل ہوا، اور اطالیہ پر ویزی گاتھ کی حکمرانی قائم ہوگئی۔

"The Gothic and German slaves within the walls opened the gates and the Romans awoke an 24th August 410, to find the Goths in possession of Rome. Alaric allowed them to pillage whatever they found except the churches - especially those of St. Peter ad St. Luke; but commanded them to spare unarmed citizens and the girls and women who had devoted their lives to Christ under vowes of consecration."(1)

(قلعہ میں موجود جرمن اور گوتھ غلاموں نے دروازہ کھول دیا، اور 24/ اگست 410ء کی صبح کو جب رومی بیدار ہوئے تو روم کی سلطنت پر گوتھ قابض ہو چکے تھے، الارک نے فوج کو عمومی لوٹ وتباہی کی کھلی چھوٹ دے دی سوائے کلیسا کے اور خاص کر قدیس پطرس اور قدیس لوقا کی کلیسا کے، ساتھ ہی اس نے یہ حکم بھی دیا کہ نہتے شہریوں، لڑکیوں اور ان عورتوں سے تعرض نہ کیا جائے جنھوں نے اپنی زندگیاں حضرت عیسیٰ کے نام پر وقف کر رکھی ہیں)

جرمن کی یہ فاتح قوم روم کی تہذیب وثقافت سے اس حد تک متاثر تھی ان کے حکمراں اتاولف (Atawulf) نے شہنشاہ کی بہن سے شادی کرنے میں فخر محسوس کیا اور اس رشتہ داری کے سبب تخت شہنشاہی پر ہونوریس (Honorius) باقی رہا۔

453ء میں ہون قوم نے اطالیہ کا رخ کیا، پورے علاقہ کو روند کر آستروگاتھ کو بے دخل کر دیا، لیکن اسی سال اس کے سردار "اتلا" (Attila) کی موت ہوگئی، اور ہون سلطنت جس تیزی کے ساتھ ابھری تھی اسی تیزی کے

---

(1) The Empires of the World, P.260,261

ساتھ بیٹھ گئی۔

ہون قوم کی پسپائی اور آستروگاتھ کی بے دخلی کو دیکھ کر ویندال قوم نے اطالیہ کا رخ کیا اور 455ء میں اس پر حملہ کر کے اس کو تہہ و بالا کر دیا۔

"The third attack was from the Vandalas, in 455, only four years later than Attila's attempt. The Vandals, under Geneseri had now taken possesson of Sicily, carthage and Spain, where they have given their name to the province of Andulusia."(1)

(تیسرا حملہ اتلا کی مہم جوئی کے محض چار سال بعد تھا 455ء میں ویندال قوم کی جانب سے تھا، ویندال نے سسلی، کارتھیج اور اسپین پر اپنی حکومت قائم کی اور اندلس کے علاقہ کو اپنے نام سے موسوم کیا)

458ء میں آستروگاتھ نے ویندال قوم کے خلاف سر اٹھایا اور 463ء میں اس کو شکست فاش دے دی، جس کے بعد سے مغربی سلطنت خانہ جنگیوں اور مسلسل جھڑپوں کی آگ میں سلگتا رہا۔

اطالیہ کی تباہی کے ساتھ رومی سلطنت کا سارا کروفر بھی جاتا رہا، صرف اس کا نام باقی بچا، سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے، اور بالآخر رومن امپائر کا یہ چراغ سحری پانچ صدی تک ضوفشاں رہ کر 4/ستمبر 476ء کو جرمن اقوام کے ہاتھوں بجھ گیا۔

مغربی سلطنت روم کے زوال کے بعد پورے مغرب میں جرمن اقوام قابض ہو گئیں اور اس طرح حسب ذیل چھ خودمختار سلطنتیں وجود میں آ گئیں:

(۱) اینگلو سیکسن سلطنت (Anglo Saxons Empire) .... برطانیہ

(۲) فرینک سلطنت (Frank Empire) ..... شمالی گال

(۳) برگنڈی سلطنت (Burgundion Empire) ..... پراونس

(۴) ویزی گاتھ سلطنت (Visigoth Empire) ..... اکویتانیہ اور اسپین

(۵) ویندال سلطنت (Vandal Empire) ..... افریقہ اور جزائر بحر روم

(۶) آستروگاتھ سلطنت (Ostrogoth Empire) ..... اطالیہ۔(۲)

مشرقی سلطنت روم

مشرقی سلطنت کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا، چونکہ قسطنطنیہ کا سابقہ نام "Byzatium" (بازنطین) تھا اس مناسبت

---

(1) The Empires of the World,p.262

(2) A History of Europe by Henry Pirenne, p.78

سے یہ سلطنت تاریخ کے صفحات میں ''بازنطینی سلطنت'' کے نام سے بھی جاویداں ہے، اس میں ایشیائے کوچک، مصر، حبش، شام، بلقان، ترکی اور یونان کے علاقے شامل تھے۔ مشرقی سلطنت کی شان وشوکت اور قوت وسطوت کے آگے مغربی سلطنت کی حیثیت وحقیقت بالکل ماند پڑ چکی تھی، اور اس کے مقابل میں صرف ایران کی شہنشاہیت تھی۔ ایشائے کوچک اور عراق کے میدانوں میں ان دونوں شہنشائیوں کے درمیان کوئی قدرتی حد فاصل یعنی پہاڑ وسمندر وغیرہ نہیں تھے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ٹکراؤ اور معرکہ آرائی کی صورتیں قائم رہتیں۔

پانچویں صدی مشرقی سلطنت کے عروج کی صدی تھی، لیکن عروج کے ساتھ ہی اس میں مختلف قسم کی خرابیاں بھی در آئیں تھیں، سلطنت کی درباری زندگی بے شمار لغو اور بے معنی رسموں سے بھری ہوئی تھی، دربار میں سازشوں اور فریب کاریوں کی وجہ سے ابتری پھیلی ہوئی تھی، آبادی میں قدیم یونانی فرقہ وارانہ منافرت کی لعنت موجود تھی، ان سب باتوں کے باوجود مشرقی سلطنت نے یونانی علم وتمدن کے چراغ کو دس تاریک صدیوں تک دھندلا سا روشن رکھا۔

527ء میں مشرقی سلطنت کو جسٹی نین (Justiain) جیسا بے مثال حکمراں نصیب ہوا، جس کا سب سے بڑا کارنامہ روم کے ضابطۂ قوانین کی تدوین ہے:

"Justinian's cheif fame in after generations is founded on his legislative achievments.....the first work the Commissioners produced was the Code (Code Constitutionem) a collection of Imperial rescripts in tweleve books."(1)

(جسٹی نین نے دستور سازی کے میدان میں اپنی کامیابیوں کی وجہ سے بعد کی نسلوں میں خاصی شہرت حاصل کی، پہلا کارنامہ یہ کہ اس نے ماہرین قانون کے ذریعہ نہ صرف "The Code" (مجموعہ قوانین) مدون کروایا بلکہ 12 جلدوں میں خلاصہ قوانین اور مبادیات یا تشریحات قانون بھی مرتب کرائیں)

اس نے مغربی سلطنت کے علاقوں کی بازیابی کا فیصلہ کیا اور اپنی سیاسی سوجھ اور جنگی مہارت کے ذریعہ بحر روم سے متصل اکثر علاقوں کو حاصل کر کے مشرقی سلطنت میں شامل کر لیا، اسی کے دور حکومت سے مشرقی سلطنت روم کو ''بازنطینی حکومت'' کہا جانے لگا، جس کی ماتحتی میں مغربی روم کے متعدد علاقے بھی شامل ہو چکے تھے۔

جسٹی نین کی موت کے بعد بازنطینی حکومت کی سرحدیں کمزور ہونے لگیں، جس کا فائدہ اٹھا کر روس کی وحشی اقوام آوار (Avars)(۲) اور سلاؤ (Slav)(۳) نے حملے شروع کر دیے، دوسری جانب ایشیاء میں ایران کی

---

(1)The Barbarian Invasions of Italy by Pasquale v.1,P.194

(۲) قفقازی نسلی گروہ ہے جو روسی جمہوریہ داغستان میں سب سے اہم ہے۔

(۳) ایک نسلی قوم جس کے دو گروہ تھے، مشرقی سلاؤ اور مغربی سلاؤ۔ مشرقی سلاؤ ابتدائی چھ صدی سے وسطی و مشرقی یورپ اور بلقان میں پائے جاتے ہیں، اور مغربی سلاؤ روس، سائبریا اور وسطی ایشیاء میں مقیم ہیں۔ (آزاد دائرۃ المعارف - ویکی پیڈیا)

ساسانی سلطنت سے بھی جنگ چھڑ گئی، مختلف محاذوں پر فوج کشی نے بازنطین کو اس قدر زیر بار کر دیا تھا کہ سلطنت کا خزانہ مزید جنگی بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہ گیا تھا، ان حالات نے بازنطین کو مدافعتی جنگ پر مجبور کر دیا، اور مغربی علاقوں کی جانب سے توجہ ہٹ گئی۔

بازنطین کی کمزوری سے جرمن کے ایک نئے قبیلہ لومبارڈ (Lombard) نے فائدہ اٹھایا، اس نے گاتھ (Goths) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شمالی اطالیہ پر قبضہ کر کے لومبارڈ حکومت قائم کر لی، اس طرح مشرق و مغربی کا ظاہری اتحاد بھی ختم ہو گیا:

"The Lombards who had entered along with the chief in A.D.568 had settled in considerable numbers in the vally of the PO, Which became the seat of their kingdom."(1)

(568ء میں لومبارڈ قوم بڑی تعداد میں اپنے سردار کی قیادت میں اطالیہ میں "پی او" کی وادی پہ قابض ہوئی اور پھر اسی کو اپنا پایہ تخت بنایا)

610ء میں بازنطینی شہنشاہ کی حیثیت سے ہرقل (Heraclius) کے دور کا آغاز ہوا، جس سال ہرقل اقتدار میں آیا بازنطین کی اکثر سرحدوں کو اندرونی و بیرونی خطرات کا سامنا تھا، جس میں خاص کر ایران کی ساسانی حکومت تھی، جو اس وقت انطاکیہ پر قابض ہو چکی تھی، پھر 613ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی، اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر ہی اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے بھی علاقے بازنطینی سلطنت سے نکل گئے، 617ء میں فوجوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون شہر پر بھی قبضہ کر لیا، مغلوبیت کا سلسلہ جاری رہا اور 619ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا، اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنا جھنڈا گاڑ دیا، ایشائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو روندتی کچلتی ہوئی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں۔

مسلسل پسپائی اور ناکامی کے سامنے قیصر نے گھٹنے ٹیک دیے، شہنشاہ ایران نے خسرو کے پاس اپنا قاصد بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے سختی اور درشتگی کا معاملہ کیا اور اپنا غرور ظاہر کیا:

"در اینجا ہرقل با سردار ایرانی ملاقاتی کرده، به صلاح دیدیاو سفیری نزد خسروپرویزبرای مذاکرات صلح فرستاد، ولی مذاکرات به جایی نرسید، زیرا فتوحات خسرو او رامغروروتکبر کرده بود. خسرو نه فقط برای مذاکرات صلح حاضر نشد، بلکه سفیر را محبس انداخته، به قتل تهدیدش نمود که چرا ہرقل را در

(1) The Holy Roman Empire, P.37

غل وزنجیر درپیش تخت او حاضر نکردہ است۔"(۱)

(اس موقع پر ہرقل نے ایرانی سردار سے ملاقات کی، اور اس کے مشورے سے ایک قاصد مذاکرات صلح کے لیے خسرو کے پاس بھیجا، لیکن مذاکرات نہ ہو سکے، کیونکہ خسرو کو اس کی فتوحات نے مغرور و متکبر بنا دیا تھا، خسرو نے نہ صرف یہ کہ مذاکرات سے انکار کر دیا بلکہ سفیر کو بھی قید کر لیا، اور قتل کی دھمکی بھی دی کہ اس نے ہرقل کو پابہ زنجیر اس کی خدمت میں پیش کیوں نہ کیا)

خسرو نے صلح کی پیش کش کو سختی سے رد کر دیا، اور چند شرطیں رکھیں جسے مشہور انگریز مؤرخ گبن "شرمناک شرائط" (Ignominious Terms) کہتا ہے:

I will never give peace to the emperor of Rome, till he had abjured his crucified God, and embraced the worship of the sun."(2)

(میں رومی حکمراں سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے)

بالآخر اس شکست کے بعد قیصر نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (موجودہ تیونس) میں روپوش ہونے کا ارادہ کر لیا، لیکن عین وقت پر کلیسا کے پادری نے اس کو روک لیا۔ (۳)

چند سالوں کے لیے ہرقل نے ہر طرح کی ہزیمت کو گوارہ کر لیا، اس عرصہ میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکست خوردہ روم دوبارہ غالب آ سکتا ہے، لیکن ہرقل خاموش نہیں رہا، اس دوران وہ ہر طرح کی جنگی تیاری میں مصروف رہا، جنگی اخراجات کے لیے اس نے کلیسا سے مدد مانگی، کلیسا نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے اپنی جمع شدہ دولت سود پر قرض دے دی۔ ہرقل خاموشی کے ساتھ بحر اسود کے راستہ "طرابزون" کی جانب روانہ ہوا جہاں اس نے ایران پر پشت سے حملہ کی حکمت عملی تیاری کی، 623ء میں اس نے آرمینیا پر فوج کشی کی، اس کے

---

(۱) تاریخ ایران، از حسن پیرنیا/۲۳۱

(2) History Of The Decline And Fall Of The Roman Empire by Edward Gibbon, V.4, P.466

(۳) یہ وہی حالات تھے جب مکہ کی سرزمین میں اسلام کا سورج طلوع ہو رہا تھا، مظلوم مسلمان حبشہ کو ہجرت کرنے پر مجبور تھے، مشرکین عرب کی زبان پر ایران کی فتح کے زمزمے اور یہ طعنے تھے کہ ایران کی مشرک قوم ان پڑھ ہے اور ہم بھی ان پڑھ ہیں، اسی طرح رومی اہل کتاب ہیں اور تم بھی اہل کتاب ہو، تو جس طرح ایرانی غالب ہوئے رومیوں پر، اور رومی رسوا ہوئے اسی طرح ہم بھی غالب ہوں گے تم پر، اور تم کو انہیں کی طرح ذلیل وخوار کر دیں گے، ایسے نازک دور میں قرآن مجید یہ پیش گوئی کرتا ہے جو بہت ہی مختصر وقفہ میں حرف بہ حرف سچی ثابت ہوتی ہے۔ ﴿الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ (الٓمّٓ۔ رومی شکست کھا گئے، قریبی سرزمین میں اور وہ شکست کھا جانے کے بعد (بھی) جلد ہی فتح حاصل کریں گے، چند ہی سالوں میں، باگ ڈور سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس دن ایمان والے خوشیاں کریں گے) بحوالہ: اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: ۱۰/۳۹۵ (لاہور)

دوسرے سال وہ آذربائیجان تک گھستا چلا گیا، اور زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ کو تباہ کر ڈالا، اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر رومی فوج ایک سیل رواں کی طرح آگے بڑھتی گئی، ہر جنگی محاذ پہ ایرانی ٹوٹتے گئے اور پیچھے ہٹتے گئے، بالآخر 627ء میں نینوا کی فیصلہ کن جنگ ہوئی اور اس نے ایران کی کمر توڑ دی، اس طرح ہرقل نے ساسانی حکومت کے خلاف تقریباً ہاری ہوئی جنگ جیت کر شہرت دوام حاصل کر لی:

"The reign of Heraclius forms the best dividing point in the history of the empire between what we may roughly be called Ancient History and the Middle Ages."(1)

(سلطنت کی تاریخ میں ہرقل کا عہد حکومت ایک بہترین حد فاصل تھا ان دو عہدوں کے مابین جنھیں عام طور پر ہم عہد قدیم اور قرون وسطی کہتے ہیں)

ہرقل کی بہادری اور فوجی تدبیر نے بازنطینی حکومت کو پھر سے استحکام نصیب کر دیا تھا اور اسے ایک بار پھر عروج حاصل ہوا، لیکن ہرقل کے نااہل جانشینوں کی وجہ سے بازنطینی سلطنت طوائف الملوکی کا شکار رہی، کبھی خانہ جنگی تو کبھی بیرونی حملوں سے قسطنطنیہ کی بنیادیں ہلتی رہیں، بازنطینی سلطنت کی تاریخ میں کم وبیش 24 مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا گیا، جن میں ایک مرتبہ 1204ء میں چوتھی صلیبی جنگ کے دوران خود مسیحیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔

بازنطینی سلطنت اپنے دور عروج میں اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ مشرقی روم اپنے علاقے دوبارہ حاصل کر سکے لیکن اسی درمیان ظہور اسلام نے ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی، اور عربوں اور رومیوں کے درمیان کئی صدی تک معرکہ آرائی جاری رہی، ساتویں صدی کے اختتام تک شمالی افریقہ، مصر، شام، فلسطین اور قبرص وغیرہ پر عربوں نے قبضہ کر لیا، اور بازنطینی سلطنت حقیقت میں یونانی سلطنت بن کر رہ گئی، آخر کار 29/مئی 1453ء میں سلطنت عثمانیہ کے فرمانروا سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کر لیا، اس فتح کے ساتھ ہی رومن امپائر کی شاندار تاریخ کا آخری صفحہ بھی پلٹ گیا، اور اسی کے بردس ''قرون وسطی'' کا خاتمہ اور یورپ میں ''نشاۃ ثانیہ'' کا آغاز ہوا۔

کلیسا کا تاریک دور

پانچویں صدی تک مسیحی مذہب سلطنت روما پر پوری طرح چھا چکا تھا، اگرچہ بت پرستی کے مذاہب اس کے حریف بنے رہے لیکن سلطنت میں مسیحی مذہب کو ہی عام رواج حاصل ہوا، مسیحی داعیوں نے دعوت وتبلیغ کے پیش نظر مختلف کلیسا بھی قائم کیے، ان میں روم اور قسطنطنیہ کے کلیسا کو خاصی اہمیت حاصل تھی، اور چونکہ مسیحیت غیر مدون وغیر

---

(1)The Byzantine Empire by C.W.C. Oman,P.141

واضح تھی اس لیے ارباب کلیسا میں شروع سے ہی سخت بنیادی اختلافات موجود تھے۔

روم کی مشرقی و مغربی تقسیم کے ساتھ ہی مشرقی و مغربی کلیسا کے درمیان بھی ایک وسیع خلیج حائل ہوتی گئی، مشرقی کلیسا کا پیشوا ''بطریرک'' (Patriach) کہلاتا تھا، اور مغربی کلیسا جس کا سربراہ ''پوپ'' (Pope) کہلاتا تھا۔ مشرقی کلیسا شروع سے شہنشاہ کے ماتحت رہا، جبکہ مغربی کلیسا پایۂ تخت کی منتقلی کے بعد گویا آزاد ہوگیا، اور مغربی سلطنت کی تباہی کے بعد وہ پوری طرح خودمختار بن گیا۔

رومن امپائر کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا جس کی وجہ سے شہنشاہ نے مشرقی کلیسا کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ اور خاصی اہمیت دی، اس کے علاوہ مسیحیت کی تدوین اور مذہبی اختلافات کے تصفیہ کے سلسلہ میں بیشتر کونسلیں بھی مشرق میں ہی منعقد ہوئیں، اس لحاظ سے مشرق کو بشمول کلیسائے روم تمام کلیساؤں پر فوقیت کا دعویٰ تھا، دوسری طرف کلیسائے روم اس بات کا دعویدار تھا کہ اس کی بنیاد خود پطرس حواری نے رکھی ہے اور اس کی بنیادوں میں پطرس اور پولس کا لہو بھی شامل ہے، اس لحاظ سے کلیسائے روم کو تقدس کا مرتبہ حاصل ہے۔

مشرق و مغرب کی باہمی کشمکش کے نتیجہ میں مسیحیت سخت آزمائش سے دوچار تھی، افتراق وانتشار کی وبائیں پھوٹ رہی تھیں، متعدد فرقے وجود میں آچکے تھے، ساری توانیاں برتری و کمتری ثابت کرنے میں صرف ہورہی تھیں، ایک ایک مسئلہ کے حل کے لیے متعدد کونسلیں منعقد ہوتیں اور ان میں بھی دلائل و براہین سے زیادہ سیاسی و غیر سیاسی قوت کا استعمال کیا جاتا۔

مشرقی و مغربی کلیسا کے تنازعات کی وجہ سے مسیحیت سیاسی و علمی انحطاط کا شکار تھی، باہمی افتراق نے مسیحی سلطنت کو اندر سے کھوکھلا کردیا تھا جس کا سیدھا فائدہ فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والی اسلامی مملکت کو حاصل ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے نصف دنیا پر چھا چکی تھی، اور اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے مسیحی اقتدار بھی لڑکھڑا رہا تھا۔

مسیحیت کی تاریخ میں یہ زمانہ کلیسا کا ''تاریک دور'' رہا ہے جو درحقیقت یورپ کے اس تاریک زمانہ کی تمہید ہے جسے مؤرخین ''قرون وسطیٰ'' یا "Dark Ages" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔

ریاست کلیسا کا قیام

مغربی سلطنت میں کلیسائے روم کئی صدیاں گزار چکا تھا، اس دوران اس نے انتظامی ڈھانچہ، نظم ونسق، زبان، رسم ورواج غرض معاشرہ کے ہر ضابطہ کو رومن امپائر سے اخذ کیا، امپائر کے زوال کے وقت کلیسا نے ان ساری قدروں کو محفوظ اور زندہ رکھا، کلیسا کا ادارہ مالی اعتبار سے خودکفیل اور انتظامی معاملات میں خودمختار تھا، اس

کے سارے کارکن تعلیم یافتہ اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے، اور قریہ قریہ کلیسا قائم ہونے کی وجہ سے پادریوں کی عوام پر مضبوط گرفت بھی تھی۔

مغربی سلطنت کے نئے حکمراں جرمن کے فاتحین تھے، یہ تہذیب وتمدن سے نا آشنا' نیم وحشی اور بہیمیت صفت لوگ تھے، روم کی تہذیب وثقافت کے گرویدہ اور اس کی برتری کے حد سے زیادہ قائل تھے، چنانچہ انھوں نے تیزی سے رومی تہذیب وتمدن اپنانا شروع کیا، اور آہستہ آہستہ رومی ثقافت میں ڈھل گئے، اور ان کا جرمن طور طریقہ رومی انداز معاشرت میں گم ہوگیا۔

کلیسائے روم نے اِن اقوام کی مرعوبیت اور تہذیب وتمدن سے ان کی تہی دامنی کا بھرپور فائدہ اٹھایا، ان کے درمیان مسیحیت کو ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر پیش کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی اقوام نے رومی تہذیب وثقافت کے ساتھ نہ صرف رومی طرز حکومت، اصول سیاست اور انتظام مملکت کو قبول کیا بلکہ کلیسائی مذہب بھی اختیار کرلیا، اس طرح یہ نیم وحشی جرمن جو بظاہر فاتح تھے حقیقی فاتح نہ ثابت ہو سکے، ان کی تہذیبی موت جلد ہی واقع ہوگئی، اور کلیسائے روم حقیقی فاتح ثابت ہوا جس نے ان وحشیوں کو رام کر کے اپنا تابع فرمان بنالیا، اور مغرب کے بھی حکمرانوں نے پوپ کو اپنا روحانی مقتدر اعلیٰ تسلیم کرلیا۔

اسی حقیقت کو مؤرخ ٹوائن بی (Toynbee) ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے:

"Every one of those Arian or heathen Teutonic war-bands that had ventured to trespass on Roman ground had been either converted to Catholicism or wiped out of existence; and, as converts to Catho- licism, the surviving barbarian intruders renounced the pretension to bequeath to the future any positive contribution of their own except a racial starin of uncertain social value."(1)

روم کی تباہی کے بعد مغرب میں جو نئی حکومتیں قائم ہوئی تھیں وہ انتظامی وسیاسی اصول سے بالکل ناواقف تھیں، جس کی وجہ سے حکومت کا ہر شعبہ ناکارہ ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے مملکت کے نظم ونسق کے لیے کلیسا سے کارکن مستعار لیے۔

فرینک (Frank) سلطنت پر کارولن جینن (Carolingian) خاندان کی حکمرانی تھی، اس نے ایسے تمام عہدے جہاں نوشت وخواند، فہم وفراست، حکمت اور فیصلے کی ضرورت تھی مجبوراً کلیسا کے حوالہ کردیے، کلیسا نے ان تمام عہدوں کو قبول کر کے حکومت کے ہر شعبہ میں اپنی بالادستی قائم کرلی، اس طرح کلیسا نے مغرب کی سیاست کو

---

(1) A Study of History by Toynbee , V.2. P.320

اپنے ماتحت کرلیا، جبکہ اس سے قبل کلیسا کو حکومتی معاملات میں مداخلت کی قطعی اجازت نہیں تھی، اور خود شہنشاہ کا فیصلہ حرف آخر کی طرح کلیسا میں بھی نافذ ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ مغرب میں کلیسا کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا، اور کلیسا کا پوپ مغرب کی عظیم ترین شخصیت بن گیا، وہی مغربی حکمرانوں کا راہنما تھا، اسی کے دم سے مغرب کا نظم ونسق قائم تھا، وہی قانون ساز تھا، بوقت ضرورت سیاسی مدبر کی حیثیت سے وہی معاملات کرتا تھا، وہی حملہ آوروں سے صلح کی شرائط طے کرتا، علاقوں کی مدافعت کرتا، اور شاہوں کے مابین تنازعات کو بھی حل کرتا۔ مغرب کے اس معاشرہ میں پوپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نائب تھا، جس کے تقدس کی نظیر روئے زمین پر نہیں تھی، مغرب کے عوام وخواص سب پر اس کا حکم چلتا تھا، ہر حکمراں پوپ کی قدم بوسی کو اپنی سعادت سمجھتا تھا۔

مشرق میں بازنطینی حکومت عروج کی جانب پینگ بڑھا رہی تھی، مغرب کے متعدد علاقوں کی بازیابی میں وہ کامیاب ہوچکی تھی جس میں فرینک سلطنت بھی شامل تھی، بازنطینی شہنشاہ نے فرینک سلطنت میں نہ صرف فوجی اور ملکی اصلاحات کیں بلکہ اس نے مذہبی معاملات میں بھی اصلاح کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ کلیسا کی قوت میں کمی واقع ہو اور عوام اس کی ذہنی غلامی سے نجات پاسکیں۔

شہنشاہ کے ان اقدامات سے کلیسا کا اقتدار مجروح ہو رہا تھا، ایسے موقع پر مسلح فوج نہ ہونے کی وجہ سے کلیسا میں بازنطینی حکومت سے مقابلہ کی تاب نہ تھی، چنانچہ اس کا بڑھتا ہوا رسوخ کلیسا کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔

فرینک سلطنت اپنے ابتدائی دور میں شمالی گال (فرانس) تک محدود تھی اور اس پر جرمن خاندان کی حکومت تھی، لیکن آٹھویں صدی کے آغاز تک بازنطینی حکومت اس پر قابض ہوچکی تھی، اور ''میروونجی ین'' (Merovingian) خاندان اس پر حکمراں تھا، اس وقت تک اس کے حدود اسپین سے دریائے دینوب تک وسیع ہوچکے تھے، نیز فرینک حکمراں اطالیہ پر یلغار کرکے لومبارڈ (Lombard) قوم کو شکست بھی دے رہے تھے اور ممکن تھا کہ وہ پوری طرح کامیاب بھی ہوجاتے لیکن یہ وہی دور تھا جب مسلم فوجیں اسپین کی سرحدوں میں داخل ہو رہی تھیں، چنانچہ فرینک حکمراں نے اپنی ساری توانائی اسی جانب جھونک دیں، مگر مسلم حملوں کی شدت کے سامنے فرینک کے بڑھتے ہوئے قدم کو نہ صرف رک گئے، بلکہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے، دوسری جانب فرینک کے شاہی محل میں بغاوت ہوچکی تھی اور عملی طور پر ''پے پن (Pepin) نے اقتدار پر رسوخ حاصل کرلیا تھا، جس کی وجہ سے شہنشاہ مزید کمزور پڑ گیا، اس طرح فرینک سلطنت کا عروج دھیرے دھیرے زوال میں تبدیل ہونے لگا۔

پے پن تاریخ میں ''پے پن دی شارٹ'' (Pepin the Short) کے نام سے مشہور ہے، یہ ایک جرمن

شخص تھا، اس کا تعلق "کارولن جیئن" (Carolingian) خاندان سے تھا جو ابتداء میں فرینک سلطنت کا حکمراں ہوا کرتا تھا، پے پن نے اپنی بغاوت کو فتح میں تبدیل کرنے کے لیے "سینٹ بونی فیس" (Boniface) کے توسط سے پوپ تک رسائی حاصل کی، اس وقت حالات کچھ ایسے تھے کہ پے پن اور پوپ دونوں کو ایک دوسرے کی سخت ضرورت تھی، پے پن قابض حکمراں تھا اور غاصبانہ تاجپوشی سے خوف زدہ بھی تھا، جبکہ "میرووِنجی ین" گھرانہ آئینی طور پر حاکم تھا، پے پن کو ایسے سہارے کی سخت ضرورت تھی جو اسے آئینی حکمراں کی حیثیت دلا سکے، وہ خود اتنی جرأت نہیں رکھتا تھا کہ قانونی تاجدار سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ سکے، دوسری طرف پوپ بازنطینی شہنشاہ کی گرفت اور اس بغاوت کی وجہ سے خوف زدہ تھا، اور اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے اسے حکومت کی پشت پناہی کی ضرورت تھی، چنانچہ پوپ نے اس کی مکمل حمایت کا اعلان کر دیا۔ جب حالات موافق ہو گئے اور راہ ہموار ہو گئی تو 751ء میں پے پن نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور قانونی بادشاہ کو باقی ماندہ ایام خانقاہ میں گذارنے کے لیے روانہ کر دیا۔

پوپ کی عمومی حمایت کی بنا پر فرینک حکومت پورے طور پر پے پن (Pepin) کے زیر اقتدار آ گئی۔ اس طرح مغرب میں ایک ایسی ریاست کا طلوع ہوا جو بازنطینی اثرات سے پوری طرح آزاد اور پوپ کی خدمت کے لیے پوری طرح وقف تھی۔

پے پن کی تاج پوشی کے موقع پر جو مذہبی رسوم ادا کی گئیں ان کا اس سے قبل تصور بھی نہیں تھا، مذہبی عنصر کی شمولیت نے شاہی اقتدار کو مذہبی تقدس کا درجہ عطا کیا، بادشاہ نے سر جھکا کر اعلان کیا کہ وہ خدا اور اس کے نائب (پوپ) کا وفادار رہے گا:

"....holds his own crown by a decision of the bishop of Rome."(1)

(روم کے بشپ کے فیصلوں کے مطابق شہنشاہ اپنے اقتدار کو قائم رکھتا ہے)

صلیب کو "نشانِ سلطنت" مقرر کیا گیا، اور پوپ کی جانب سے پے پن کو "شاہ بفضل رب" (King By the Grace of God/Gratia Dei Rex) کا خطاب دیا گیا، اور حکومت "مسیحی اصول وضوابط یعنی کلیسا کے احکام کی پابند ہوئی، اس کے بعد یہ پابندی بعد کے حکمرانوں کی وراثت بن گئی، اور مذہب ریاست کا لازمی جزء قرار پایا۔(۲)

---

(1) Rome And The Popes, P.103

(2) A History of Europe by Henry Pirenne, P.78

اس طرح کلیسا نے بازنطینی سلطنت سے مغرب کو پوری طرح آزاد کرا کر اس کے متوازی ایک نئی حکومت قائم کر دی جس کی نشو ونما خود اس کی نگرانی میں ہوئی، تاہم یہ ایک ایسی سلطنت تھی جو کلیسا کی حفاظت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف تھی، اور جس کا شہنشاہ پوپ کی قدم بوسی کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

پے پن نے پوپ سے یہ عہد کیا تھا کہ برسر اقتدار آنے کے بعد وہ اطالیہ کے لومبارڈ (Lombard) حکمرانوں پر فوج کشی کرے گا، اور انھیں شکست دے کر وہ تمام علاقہ کلیسا کی نذر کر دے گا جو شہر روم کے مضافات میں واقع ہیں، حسب وعدہ 754ء میں لومبارڈ سلطنت پر فوج کشی کی گئی اور روم کے مضافات کا پورا علاقہ پوپ کو بطور نذرانہ پیش کر دیا گیا جو تاریخ میں ''عطیہ پے پن'' کے نام سے مشہور ہے:

"Pepin after defeating the Lombards in Italy made the famous "gift" to the Pope."(1)

(اطالیہ میں لومبارڈ کو شکست دینے کے بعد پے پن نے پوپ کی خدمت میں اپنا مشہور تحفہ پیش کیا)

پھر ان علاقوں پر مشتمل ایک نئی ریاست قائم کی گئی جسے ''ریاست کلیسا'' (Church State) کا نام دیا گیا، اس طرح قدیم رومن امپائر کا عظیم پایہ تخت بلا شرکت غیرے پوپ کا پایہ تخت بن گیا:

"Rome As The Capital Of The States Of The Church". (2)

مقدس رومی سلطنت کا قیام (Holy Roman Empire)

"Pippin's first-born son Charles, then a mere lad, but afterwards known to history as Charles the Great, or Charlemagne."(3)

(پے پن کا بڑا لڑکا چارلس، ایک عام سا لڑکا جو بعد میں تاریخ میں عظیم چارلس یا عظیم شارلیمن کے نام سے مشہور ہوا)

768ء میں پے پن کا جانشیں شارلیمن (Charlemagne) تخت نشیں ہوا، ملک اور مذہب کے سلسلہ میں شارلیمن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اسی لیے تاریخ شہنشائیت میں اسے جو دائمی شہرت حاصل ہوئی وہ اس سے قبل رومن شہنشاہ جولیس سیزر (Julius Ceasar) کو یا پھر اس کے بعد نپولین (Napoleon) کو ہی مل سکی۔

شارلیمن کے عہد میں سلطنت کے حدود دریائے دینوب تک وسیع ہو گئے، آج کل کے فرانس، جرمنی، اٹلی اور وسط یورپ کی ریاستیں اس میں شامل تھیں، دینوب علاقے میں بسنی والی آوار (Avar) قوم کا نام ونشاں تک مٹا دیا گیا، سیکسن قوم (Saxon) کو تباہ کر دیا گیا، پھر سلاؤ (Slav) کی شامت آئی، انھیں بری طرح کچلا گیا اور اس قدر غلام بنایا گیا کہ یورپ میں Slave کے معنی ہی غلام کے ہو گئے۔

(1,2) Rome And The Popes, P.102

(3)The Barbarian Inbasions of Italy by Pasquale v.2,P.401

شارلیمن کی تمام مہمات کلیسا کے مفاد میں تھیں، اس نے جس علاقہ کو بھی فتح کیا وہاں پر مسیحیت کو بزور شمشیر نافذ کیا، اور جو لوگ مسیحیت کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اس طرح شارلیمن کی مذہبی شدت پسندی نے اسے کلیسا کا محبوب بنا دیا۔

شارلیمن کی خدمات ملک اور مذہب کے لیے بے مثال تھیں، اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ شارلیمن نے پوپ کی ذات پر بھی احسان عظیم کر دیا، ہوا یوں کہ 799ء میں پوپ لیو سوم (Leo III) پر زنا (Adultery) اور کلیسائی منصب کی خرید و فروخت (Simony) کے الزامات عائد کیے گئے، پوپ نے فرار ہو کر شارلیمن کے دربار میں پناہ لی، شارلیمن نے اسے دوبارہ تعینات کر کے روم بھیجا جس پر مخالفین بھڑک اٹھے، چنانچہ 800ء کو شارلیمن نے خود روم پہنچ کر معاملات کو رفع دفع کیا۔ اس واقعہ کے دو دن بعد پوپ نے شارلیمن کی تاج پوشی کی اور اس کی سلطنت کو "مقدس رومی سلطنت" کا نام دیا:

"Two days later Leo crowned Charlemagne, creating for him the "Holy Roman Empire".(1)

(دو دن بعد پوپ لیو نے شارلیمن کی خاطر مقدس رومی سلطنت کی تخلیق کرتے ہوئے اس کے سر پر تاج شہنشائی رکھ دیا)

شارلیمن چونکہ ایک مذہبی انسان تھا، روم آنے کا اس کا ایک مقصد کرسمس کی عبادت میں شریک ہونا بھی تھا، چنانچہ پوپ کے فیصلہ کے دو دن بعد کرسمس کی عبادت میں شرکت کے لیے وہ حواری پطرس کے کلیسا میں پہنچا جہاں عقیدت مندوں کا ایک جم غفیر موجود تھا، اپنی عبادت کے لیے وہ جیسے ہی دوزانو ہو کر بیٹھا تھا کہ پوپ لیو نے نہایت سرعت کے ساتھ تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا اور ساتھ ہی (بزبان اطالوی) یہ نعرہ بھی بلند کر دیا:

"Carolo Pissimo augusto a Deo coronato, magno pacificio Imperatori vita et victoria."(2)

(محترم تاج خداوند، صاحب عظمت و امن، شہنشاہ روم چارلس زندہ باد!)

تاج شاہی کے بعد لیو نے آداب شاہی کے ساتھ شارلیمن کی شہنشائیت کا اعلان کیا، اور ان آداب و القاب کا استعمال کیا جو بازنطینی شہنشاہوں کے ساتھ مختص سمجھے جاتے تھے، اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مبینہ پیدائش کا دن مغربی شہنشائیت کا یوم تاسیس قرار پایا، اور چونکہ یہ شہنشائیت اُس کلیسا میں قائم ہوئی تھی جس کی بنیاد مقدس پطرس نے رکھی تھی، نیز یہ سلطنت پے پن کی سلطنت کا امتداد بھی تھی جو پوپ کی حمایت سے وجود میں آئی تھی اور آغاز

---

(1) The Popes and their Church, P.29

(2) Decisive Battles of the Western World, P.245

ہی سے کلیسا کی خدمات کے لیے وقف تھی، اس لیے اس کا نام ''مقدس رومی سلطنت'' (Holy Roman Empire) رکھا گیا۔ اس طرح روم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور شہنشاہ شارلیمن اس ''مقدس رومی سلطنت'' کا پہلا عظیم فرمانروا قرار پایا:

"This coronation opened a new epoch in the history of the world."(1)

(اس تاجپوشی نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا)

نوٹ

واضح رہے کہ شہنشاہ کی تاجپوشی سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تھی، پوپ نے اپنے دامن پہ لگے بدنامی کے دھبے کو دھونے، مستقبل کے تحفظ اور شہنشاہ کے نزدیک تقرب کے حصول کے لیے اس کے سر پر تاج رکھا تھا، شہنشاہ شارلیمن کو اس کی بھنک بھی نہ تھی ورنہ شاید وہ اس تقریب میں شریک بھی نہ ہوتا:

"Einhar, Charles' secretary and biographer, says that Charles declared that he would not have entered the Church the day he was crowned if he had known of the Pope's plan."(2)

(شارلیمن کا سکریٹری اور اس کا سوانح نگار ''انہار'' کہتا ہے کہ شارلیمن نے وضاحت کردی تھی کہ اگر اسے پوپ کے منصوبہ کا علم ہوتا تو وہ اس دن کلیسا میں قدم ہی نہ رکھتا جس دن اس کے سر پر تاج رکھا گیا تھا)

کلیسا کی بادشاہت

مقدس رومی سلطنت اپنے پہلے شہنشاہ شارلیمن کے عہد تک ایک عظیم سلطنت تھی لیکن شارلیمن کی موت کے بعد یہ عظیم سلطنت اپنا وجود نہ سنبھال سکی، اور حفظ و بقا کی جنگ لڑتے ہوئے انتشار کا شکار ہوگئی، اور اس کی عظمت تین الگ الگ حصوں اٹلی، فرانس اور جرمنی میں منقسم ہوگئی، مگر سلطنت کے اس افتراق کے باوجود کلیسا کا اختیار اور اس کی اجارہ داری بدستور باقی رہی، اور شارلیمن کے عہد سے ہی یہ روایت قائم ہوگئی کہ ہر ریاست کا بادشاہ پوپ کے ہاتھوں تاج پوشی کے بعد ہی حقیقی فرمانروا شمار ہوسکتا ہے، اس طرح کلیسا کا اقتدار مضبوط اور وسیع تر ہوتا گیا، اور مقدس رومی سلطنت کا قیام درحقیقت کلیسائی اقتدار کا آغاز ثابت ہوا۔

''ریاست کلیسا'' کے قیام کے بعد سے کلیسا کا اقتدار اس قدر مضبوط اور مستحکم ہوتا گیا کہ آٹھویں صدی کے اواخر تک روم کی بادشاہت کلیسا کی کاسہ لیس بن گئی، کلیسا ہی شہنشاہی عطا کرتا اور شہنشاہی چھین لیتا، وہی علاقوں میں امن قائم کرتا اور امن کو تاراج کرتا، ایک ملک کو دوسرے ملک پر حملہ کرنے کا پروانہ وہی عطا کرتا، شاہی دربار کلیسا کے

---

(1) Decisive Battles of the Western World, P.245

(2) The Middle Ages By Joseph R.Satrayer,P.90

نمائندوں سے رونق پاتا اور شاہانِ مغرب کلیسا میں جبیں سائی کو باعث فخر گردانتے۔

"The next factor in the European political disorder was the resolve of the Church at Rome to make no temporal prince but the Pope of Rome himself emperor in effect."(1)

(یورپ کی سیاست کا دوسرا المیہ کلیسائے روم کا یہ فیصلہ تھا کہ فی الحال کسی کو ولی عہد نہ بنایا جائے کیونکہ فی الواقع پوپ خود ہی شہنشاہ تھا)

کلیسا کا اقتدار بڑھتا ہی گیا، اور اس قدر بڑھا کہ اس نے اپنی حکومت قائم کر لی، اس کا اپنا تخت تھا، اپنے جھنڈے، اپنے معاشی وسائل اور اپنا خزانہ، اپنے قوانین اور اپنی عدالت، اپنی پولیس اور اپنے قید خانے سب کچھ تھے، اور دیگر رومی سلطنتیں اس کی مرہون منت تھیں، اس طرح کلیسا رومی سلطنتوں کے اندر ایک متوازی سلطنت بن گیا، جس کے حدود میں ملکی طاقت داخل نہیں ہو سکتی تھی، جہاں دنیوی قانون کا گذر نہیں تھا، اور جہاں کلیسا کا فرمان سبھی شاہی فرمانوں سے بڑھ کر تھا۔

کلیسا نے اپنے اقتدار میں رومن امپائر کے طور طریق اور اس کی اصطلاحوں کو بھی اختیار کیا۔ ملاحظہ ہو ذیل کا جدول:

شعبہ	سلطنت روم	کلیسائے روم
سربراہ	ایمپرر	پوپ
نائب	صوبائی گورنر	پیٹری آرچ بشپ
عمال	حکام	پریسٹ
رکنیت کی تقریب	حلف برداری	بپتسمہ
خلاف ورزی میں	سزا	کفارہ
غداری کی سزا	موت	موت
انتظامیہ	سول سروس	آرڈر
قانون سازی و انتخاب	سینیٹ	کیوریا

(1) Short History of the World by H.G.Wells, P.179

CamScanner

مسیحیت کا دور ظلمات

پانچویں اور چھٹی صدی کا دور کیتھولک کلیسا کے استحکام اور عوامی مقبولیت کا دور ہے، وحشی و بربر اقوام نے مغربی روم کے ٹکڑے ٹکڑے ضرور کر دیے لیکن یہ ساری قومیں مغربی کلیسا کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئیں، اور مسیحیت کو قبول کر کے کلیسا کی خوشہ چیں بن گئی۔ 590ء کو منصب پاپائیت پر گریگوری اول (Gregoryl) متمکن ہوا جس نے پاپائی نظام کو مضبوط و مستحکم کیا، دیہاتوں اور افتادہ علاقوں میں بھی کلیسا تعمیر کروائے، مذہبی رسومات میں نرمی پیدا کی، دعا و مناجات کی نظر ثانی کرائی، اس کے علاوہ اس نے کلیسا میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی کیا، یہ اضافہ راہبوں (Monks) کی شمولیت اور ان کی خانقاہوں کا انضمام تھا، اس سے قبل راہبوں کی خانقاہیں نہ تو شیرازہ بند تھیں اور نہ کلیسا سے وابستہ تھیں، ان کی شمولیت سے کلیسا کو مذہبی کارکنوں کی ایک ایسی رضا کار فوج میسر آ گئی جو مالی اعتبار سے خود کفیل تھی، اور معاشرہ میں ایک ممتاز مقام رکھتی تھی۔

گریگوری نے مسیحیت کی اشاعت و تبلیغ کے لیے مختلف علاقوں میں وفود روانہ کیے جن میں عام طور خانقاہوں کے راہب بھی شامل ہوتے تھے، یہ وفود پہلی بار برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کے علاقوں تک پہنچے، جس کے نتیجہ میں چار صدیوں کی مسلسل کاوشوں کے بعد تقریباً پورا یورپ مسیحیت کا حامی و پیروکار بن گیا، اور اس کی ساری وفاداریاں کلیسا کے لیے وقف ہو گئیں۔

کلیسا کی عوامی طاقت و مقبولیت کے ذریعہ شہنشاہ پے پن (Pepin) اور پھر شہنشاہ شارلیمن (Charlemagne) نے اقتدار حاصل کیا اور پھر اپنا سارا خلوص اور اپنی ساری خدمات کلیسا کے لیے وقف کر دیں، اور جن علاقوں میں مسیحیت کے قدم لڑکھڑا رہے تھے انھیں تلوار کے ذریعہ مضبوط کر دیا۔

قرون مظلمہ

حضرت عیسیٰؑ نے جو تعلیمات پیش کی تھیں وہ ایک سادہ سی مسیحیت تھی جس میں توحید کے عقیدہ اور اخلاق کو نہایت پاکیزگی و شفافیت ساتھ پیش کیا گیا تھا، عیسائیت کا یہ امتیاز اس وقت تک قائم رہا جب تک وہ سینٹ پال کے

دستبرد سے محفوظ تھی، سینٹ پال کے دست تصرف نے اسے لغویات وخرافات کا ایک آمیزہ بنا دیا تھا تاہم اس دستبرد کے بعد بھی اس میں کہیں کہیں زندگی کے آثار محسوس ہوتے تھے، شرک وبت پرستی کے مقابلہ توحید کی جھلکیاں موجود تھیں، لیکن پانچویں صدی عیسوئی کے بعد سے عیسائیت اپنے حقیقی وجود سے پوری طرح محروم ہوتی گئی اور بالآخر ایک ایسا معجون مرکب بن گئی جس میں رومی بت پرستی، یونانی خرافات اور مصری افلاطونیت کے اجزاء شامل تھے۔ اس طرح حضرت عیسیٰؑ کی جانب منسوب مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گئی، جو نہ روح میں گداز پیدا کرسکتی تھی اور نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتی تھی، اس پر تحریفات وتاویلات کی بھرمار مستزاد تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ مسیحیت علم وفکر کے دروازے کھولنے اور انسانیت کی رہنمائی کرنے کے بجائے اس کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہوگئی۔ اور مسیحیت کی دعوت وتبلیغ اور انسانی ہمدردی کے عنوان سے قائم ہونے والے کلیسا انسانی خون کو چوسنے اور اپنی تجوریوں کو بھرنے کے اڈے بن گئے۔

پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک کا دور کلیسا کے دینی ودنیوی اقتدار کا دور کمال ہے، ظاہری طور پر یہ مسیحیت کے عروج کا ''سنہرا دور'' ہے، لیکن یہی وہ دور ہے جسے خود مغربی مؤرخین بالاتفاق ''قرون مظلمہ'' (Dark Ages) کے نام سے یاد کرتے ہیں، کیونکہ مسیحیت کا یہ عروج حقیقت میں کلیسا اور پاپائیت کا عروج تھا۔

یہی وجہ ہے کہ کلیسا کے اس ''سنہرے دور'' پر ولیم لیکی (W.Lecky) جیسا مسیحیت نواز بھی یہ کہنے پر مجبور ہے:

"..... the period in which they were so supreme should have been one of the most contemptible in history."(1)

(وہ دور جس میں انھیں عروج حاصل تھا تاریخ کے انتہائی قابل نفرت ادوار میں سے ہے)

توجہ طلب

عمومی طور پر پانچویں صدی سے دسویں صدی تک کے دور کو ہی ''تاریک دور'' شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ اس دور کی تاریکی نہایت خوفناک تھی، اور اس کے بعد کے دور کو ''قرون وسطی'' کہا جاتا ہے، ''آکسفرڈ ڈکشنری'' (Oxford Dictionary) کے مطابق:

"Dark Ages: 5th-10th-c., unenlightened period."

(تاریک دور: پانچویں صدی سے دسویں تک، روشنی سے محرومی کا دور ہے)

"Middle Ages: period of European history from c.1000 to 1453."(2)

(قرون وسطی: تاریخ یورپ میں دسویں صدی سے 1453ء تک کا دور ہے)

---

(1) History Of European Morals.V.2,P.12

(2) Oxford Dictionary & Theasurus (2001 A.D.)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریکی اس قدر بھیانک اور اس کے منفی اثرات اس قدر سنگین تھے کہ پورا "قرون وسطیٰ" اس کی لپیٹ میں تھا، اس لیے متعدد مغربی مصنفین نے پورے قرون وسطیٰ کو بھی "قرون مظلمہ" سے تعبیر کیا ہے، جس کا اعتراف "آکسفرڈ ڈکشنری" کو بھی ہے، نیز مجموعہ لغات میں مشہور امریکی "ویبسٹر ڈکشنری" (Webster's Dictonary) نے بھی یہ وضاحت کی ہے:

"Dark Ages: the period from about A.D. 476 to about 1000. broadly: MIDDLE AGES.(1)

(قرون مظلمہ: تقریباً 476 سے تقریباً 1000 تک کا دور ہے، وسعت کے ساتھ: قرون وسطیٰ بھی شامل ہے۔)

اسی بنیاد پر بہت سے مغربی مؤرخین و مفکرین نے پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی کے دور تک پورے عہد کو "تاریک دور" (Dark Ages) سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ مشہور مغربی مؤرخ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) کہتا ہے:

"From the fifth to the tenth century Europe lay sunk in a night of barbarism which grew darker and darker. It was a barbarism far more awful and horrible than that of the primitive savage, for it was the decomposing body of what had been a great civilization. The features and impress of that civilization were all but completely effaced. Where its development had been fullest, in Italy and in Gaul, all was ruin, squalor, desolation."(2)

(پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی، اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی، کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کے لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو، اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے، اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی، وہ ممالک جہاں تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، و فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا)(۳)

عہد وسطیٰ۔قرون مظلمہ

مستند لغت "آکسفرڈ ڈکشنری" (Oxford Dictionary) کے مطابق:

"عہد وسطیٰ یا قرون وسطیٰ سے مراد تاریخ یورپ کا وہ دور ہے جو پانچویں صدی میں مغربی رومی سلطنت کے زوال

---

(1) Webster's New Collegiate Dictonary (London,1975)

(2) The Making of Humanity by Robert Briffault,p.164

(۳) ترجمانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

سے شروع ہو کر 1453ء میں قسطنطنیہ کی فتح پر ختم ہوتا ہے۔"(1)

"Middle Ages: the period of European from about A.D. 500 to about 1500."(2)

اسے دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ رومن امپائر کی تقسیم کے بعد مغربی سلطنت روم کے زوال سے مشرقی سلطنت روم (بازنطینی حکومت) کے زوال تک کا دور "عہد وسطی" (Middle Ages / Medieval Period) کہلاتا ہے(۳) چنانچہ 476ء کو مغربی روم کے زوال سے یہ دور شروع ہوتا ہے اور 1453ء میں "بازنطینی حکومت" کے زوال پر ختم ہوتا ہے۔

مسیحیت کی تاریخ میں قرون وسطی سیاسی، اخلاقی اور علمی وفکری زوال وانحطاط کا بدترین دور ہے، مسیحیت میں افتراق وانتشار کی وبائیں پھوٹ رہی تھیں، مشرقی ومغربی کلیسا کے کے مابین رقابتیں اپنے عروج پر تھیں جو بالآخر دائمی افتراق کا شکار ہوئیں، ارباب کلیسا تعیش پسندی اور اخلاق باختگی کا شکار تھے، کلیسائی نظام داخلی انتشار، ہوس پرستی اور اقربا پروری کا شکار تھا، عوام کا کمزور وناتواں طبقہ کلیسا کے ظلم کی چکی میں پس رہا تھا، ان کی عقلوں اور ان کے جسموں پر کلیسا کی سخت پہرے داری تھی، کلیسائیت اور شہنشائیت کے درمیان کشمکش قائم تھی، اس کے علاوہ رہبانیت نے بھی اس دور میں جنم لیا جو درحقیقت ارباب کلیسا کی مادہ پرستی وجاہ طلبی کا ردعمل تھی، الغرض سیاسی، فکری، اخلاقی زوال کی ایک طویل داستاں ہے قرون وسطی!

قرون وسطی کی ایک مختصر سی جھلک ذیل کی عبارت میں ملاحظہ کریں:

"یورپی اقوام زمانہ وسطی میں مذہبی نظریے کی گرفت میں آگئی تھیں، یہ نظریاتی گرفت ان کی اجتماعی زندگی میں سرایت کر گئی تھی، معاشرہ پر بوجھل نظریہ پرستی طاری تھی، فلسفیانہ تصورات جو کبھی یونان والوں اور یہودیوں کے ذہنوں کو منور کر رہے تھے اب وہی تصورات منجمد ہو چکے تھے، مسیحیت کی لابدی صداقتیں جنھیں استدلال سے چیلنج نہیں کیا جا سکتا

---

(1) The Oxford English Urdu Dictionary

(2) Webster's New Collegiate Dictonary.

(۳) یورپ کی تاریخ عام طور پر تین حصوں میں منقسم کی جاتی ہے:۱-عہد قدیم (Ancient Era) ۲-عہد وسطی (Middle Ages) ۳-عہد جدید (Renaissance)۔

عہد قدیم: یہ یورپ کے تہذیبی وتمدنی غلبہ کا دور ہے، اس دور میں روم کا شمار عظیم عالمی سلطنتوں میں کیا جاتا ہے، ایک اندازہ کے مطابق اس کی آبادی 50 سے 90 ملین افراد پر مشتمل تھی، جبکہ اس کا رقبہ تقریبا 6.5 ملین مربع کلو میٹر (2.5 ملین مربع میل) تھا۔ (اردو وکی پیڈیا)

عہد جدید: پندرہویں صدی میں یورپی معاشرہ مذہبی اجارہ داری کے خلاف صف آرا ہوا اور مکمل بغاوت کے بعد اس نے کلیسا کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا، اس طرح یورپ میں بیداری وتوانائی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے جسے "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تھا اب ان پر عقیدے کی ایک تہہ چڑھادی گئی تھی۔"(۱)

اس کے علاوہ قرون وسطی کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی تھا کہ اسی دور میں عرب کے صحراؤں سے اسلام کا آوازہ بلند ہوا جس کی بازگشت رفتہ رفتہ نصف دنیا میں گونجنے لگی اور مغرب میں مصر، افریقہ، اندلس وصقلیہ اور مشرق میں شام اور ایران کی عظیم سلطنتیں اس کی صداؤں پر سر تسلیم خم کرنے لگیں۔

مغربی معاشرہ (Western Society)

مغرب سے مراد وہ علاقے ہیں جو کیتھولک مسیحیت پر مشتمل تھے، دوسرے الفاظ میں وہ علاقے جو پاپائیت کے زیر اقتدار تھے، مغرب کا یہ معاشرہ جن ممالک پر مشتمل تھا وہ تمام کے تمام بحر روم کے شمال میں واقع ہیں، ان میں پرتگال، اسپین، فرانس، اطالیہ، جرمنی اور ان سے ملحق چھوٹے چھوٹے ممالک نیز جزائر برطانیہ شامل تھے۔

کلیسا نے اپنے زیر اقتدار علاقوں میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل نو کی جو پوری طرح مسیحی تھا، اور دینی ودنیوی معاملات میں کلیسا کے فرمان کا سختی سے پابند تھا، اس معاشرہ میں کلیسا ہی مسیحی قانون واخلاقی نظام نافذ کرنے کا ذمہ دار تھا، تہذیب وثقافت کا وہی پاسباں اور اس میں ترمیم وتنسیخ کا وہی مختار کل تھا، اگر معاشرتی امن وسکون کسی غیر مسیحی کی آواز سے ذرا سا مرتعش ہوتا تو کلیسا کے اشارہ پر مغرب کی ساری قوتیں اس کے خلاف صف آراء ہو جاتیں۔

مغربی معاشرہ کا شجرۂ نسب

کلیسا نے جو معاشرہ پیش کیا تھا اس کا تعلق یونانی اور رومی تہذیب سے تھا، ان دونوں تہذیبوں نے اپنے ترکہ میں جو سیاسی نظام، اجتماعی فلسفہ، اور عقلی وعلمی سرمایہ چھوڑا تھا وہی کلیسا کے حصہ میں آیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول یونانی ورومی تہذیب وتمدن کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:

۱- غیر محسوسات کی بے وقعتی اور ان میں اشتباہ۔

۲- خشوع وخضوع اور روحانیت کی کمی۔

۳- دنیاوی زندگی کی پرستش اور دنیاوی فوائد ولذائذ کا اہتمام شدید۔

۴- حب وطن میں افراط وغلو۔

ہم ان منفرد اجزاء اور پہلوؤں کو اگر ایک مفرد لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو اس کے لیے تنہا "مادیت" کا لفظ کافی ہے۔"(۲)

---

(۱) انسانی تہذیب کے پانچ دور (مترجم) از:- ولیم میک گاگی/۲۶۴

(۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر/۲۳۶

کلیسا نے یونان وروم کی ''مادیت پرست تہذیب'' کی ساری خصوصیات ورجحانات کو مسیحیت کے سانچہ میں ڈھال کر اپنی جانب منسوب کیا اور پھر پوری شدت کے ساتھ اس طور پر پیش کیا کہ اس میں اقتدار کا غرہ اور احساس کبریائی پوری طرح نمایاں تھا، اور اس میں وہ تمام خرابیاں بھی شامل تھیں جس نے پہلے یونان اور پھر روم کو زوال کی دہلیز تک پہنچایا تھا۔

چنانچہ مغربی معاشرہ کی بنیادی صفات میں مادیت پرستی کے بعد احساس برتری کا عنصر سب سے غالب تھا، اور یہ غلو اس کی رگ وپے میں گردش کر رہا تھا، جس کی بنیاد پر وہ خود کو ایک جداگانہ اور نوع انسانی کا ممتاز ترین معاشرہ تصور کرتا تھا، اس کا دعوی تھا کہ وہ دنیا کے سبھی معاشروں سے افضل وممتاز ہے، وہ خود کو مسیحی دنیا کا ایک حصہ ضرور مانتا تھا لیکن اس کی نظروں میں باقی سب کم تر تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو ''متمدن آقائے عالم'' (Civilized Lord of the World) کہتا تھا۔

مغربی معاشرہ کی نگاہ میں غیر مغربی کے لیے کوئی احترام نہیں تھا، رنگ ونسل کا غیر مثالی تفاخر انتہائی شکل میں موجود تھا، اور اگر وہ غیر مغربی غیر مسیحی بھی ہوتا تو اس کی حیثیت بے زبان جانور یا جمادات سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔

غرور وتکبر کا یہ احساس اس کی قوتِ فکر کے ساتھ اس کے قوتِ عمل میں بھی سرایت کر چکا تھا جو کہ ظلم تعدی کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، چنانچہ جس قوم سے بھی اس کا سابقہ پڑا اس نے کشت وخون، تباہی وغارت گری، مکر وفریب غرض کسی نہ کسی طریقہ پر اس کو اپنا محکوم بنایا اور پھر لوٹ کھسوٹ کے بعد تباہی تک پہنچا کر ہی دم لیا، اور دنیا کے جس علاقہ میں پہنچی وہاں کے باشندوں کی زندگی اجیرن کر دی۔

مغربی معاشرہ میں احساس برتری کا ایک بنیادی عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا، قرون وسطی میں مغرب کی اہم ترین قدر اس کا اپنا مذہب ہی تھا، وحشی وبربر اقوام کی یلغار کے سامنے کلیسا مضبوطی سے کھڑا رہا اور پھر رفتہ رفتہ وہ قومیں کلیسا کے سامنے سرنگوں ہو کر مسیحیت میں ضم ہو گئیں، اور پوری طرح مغربی معاشرہ میں رچ بس گئیں، مغربی امتیازات کے حصول کے لیے مسیحی عقیدہ ہی شرط اولین تھا، اور جو اس عقیدہ سے محروم تھا اس کے لیے مغربی معاشرہ میں کوئی جگہ نہ تھی۔

مغرب صرف چند ملکوں پر مشتمل ایک مملکت کا نام نہیں تھا بلکہ مغرب ایک تہذیب وتمدن اور ایک نظام حیات کا نام تھا، جسے دنیا کی سب سے قدیم تہذیب ہونے پر ناز اور دائمی ولافانی ہونے کا احساس بھی تھا، جس کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھوں میں تھی جس کا فرمان پتھر کی لکیر تھا، یہ ایک ایسا ضابطۂ حیات تھا جو صدیوں تک انسانوں کے جسم وروح پر پوری طرح حاوی اور ان کے غور وفکر کی صلاحیتوں کا محور تھا، الغرض دنیا میں کوئی انسانی یا آسمانی نظام ایسا نہیں تھا جو مغرب کو چیلنج کر سکے۔

CamScanner

لیکن جب چھٹی صدی عیسوئی میں فاران کی چوٹیوں سے اسلام کا آفتاب ہدایت طلوع ہوا تو اس کے جلو میں ایک ایسا نظام حیات اور اس کے پہلو میں ایک ایسا بلند و برتر تمدن تھا جس کی بنیادیں غیر متزلزل تھیں، اور جس کے اصول میں کسی پوپ کی دہشت کے بجائے خوف خدا کی روح جاری تھی، اور جو ظاہری شور و تلاطم اور اندرونی کھوکھلے پن سے آزاد ایک مضبوط و مستحکم تہذیب تھی، اور جس کے بڑھتے ہوئے تیز قدموں کے سامنے مغرب کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اسلام کا سورج نصف النہار کو پہنچا اور مغرب اپنی تاریخ کے ''دور ظلمات'' میں ڈوب گیا۔

آگے کے صفحات میں یورپ کے دور ظلمات کی تہہ بہ تہہ تاریکیاں ملاحظہ ہوں:

مسیحیت۔تلوار کے زور پر

سترہویں صدی کے مسیحی فلسفی جان لاک (John Locke) نے مسیحیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"A sanguinary, murderous religion...putting to the sword anything that offered resistance to it." (1)

(یہ ایک خونخوار اور قاتل مذہب ہے جو ہر اس چیز کو تلوار کے حوالہ کر دیتا ہے جو اس کے مقابلہ میں آتی ہے)

ابتدائی دور میں مسیحی نہایت مظلومیت و کسمپرسی کی حالت میں تھے، یہودیوں اور رومی بادشاہوں کے تشدد نے انھیں پامال کر رکھا تھا یہاں تک کہ 313ء میں قسطنطین کا عہد آیا اور مسیحیت کو قانونی تحفظ حاصل ہوا، شہنشاہ نے مسیحیوں کے ساتھ رواداری کی پالیسی اختیار کی اور بالآخر خود بھی مسیحیت اختیار کر لی، اور اس طرح رومی حکومت خود مسیحیت کی مضبوط پشت پناہ بن گئی۔

ایک لمبے عرصہ تک مذہبی تعصب و تشدد کا شکار رہنے کے بعد مسیحیوں سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اب وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں گے، سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کے ساتھ حسن سلوک اختیار کریں گے اور خاص کر اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے پختہ دلائل اور اور پر امن تبلیغ کا سہارا لیں گے۔

لیکن دوسروں کو اور خاص کر مسلمانوں کو ''تلوار کے زور پر مذہب کی اشاعت'' کا طعنہ دینے والوں کی تاریخ خود مذہبی بربریت اور تشدد سے بھری ہوئی ہے، اور یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن کا انکار طلوع شمس کا انکار ہے۔

شہنشاہ قسطنطین کے وقت سے ہی مسیحیت کو دنیوی سلطنت کے حصول کی فکر دامن گیر ہوئی، اور اس نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کیا، چنانچہ شہنشاہ کی موت کے بعد ارباب کلیسا نے اپنا روحانی اقتدار اور دنیوی دبدبہ بڑھانے کے لیے جھوٹ اور فریب کا سہارا لیا، نیز جعل سازیوں کے ذریعہ رومی معاشرہ پر اپنا تسلط بھی

---

(1) Concise Oxford Dictionary of the Church, PP.306-307

قائم کیا، ان جعل سازیوں میں سب اہم اور مشہور قسطنطین کے حوالہ سے وہ مشہور دستاویز ہے جسے "Forged Persecution Decree" کہا جاتا ہے، اس دستاویز میں خاص کر مشرکوں (Pagans) اور ملحدوں (Heretics) پر تشدد کی کھلی اجازت ہے، چنانچہ راسی دستاویز کی بنیاد پر آئندہ ایک صدی کے عرصہ میں سلطنت روم سے عملاً دوسرے مذاہب اور کلیسا سے اختلاف رکھنے والوں کو ختم کر دیا گیا۔

390ء میں تھیوڈیوسیس اول (Theodosius I) روم کا شہنشاہ ہوا، یہ اپنے پیش رو سے بالکل مختلف تھا، یہ نہ صرف پکا مسیحی تھا بلکہ غیر مسیحیوں کا سخت مخالف بھی تھا، جس کے بارے میں شبہ بھی ہو جاتا کہ مسیحیت کے سلسلہ میں اس کا عقیدہ پختہ نہیں ہے اس کے خلاف سختی سے کام لیتا، اس نے دوسرے مذاہب کی عبادت گاہیں حکماً بند کرا دیں اور کیتھولک مسیحیت کو ملک کا واحد سرکاری مذہب قرار دیا، نیز جو کیتھولک مسیحیت سے متفق نہیں تھے انھیں قانونی طور پر مجنون (Madmen) قرار دے کر ان سے ہر قسم کے شہری حقوق سلب کر لیے (1) اس طرح تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی ملک میں رہنے کی قیمت مذہب قرار پائی:

"When Theodosius deprived heretics of civil rights, religious orthodoxy became the price of citizenship for the first time in history."(2)

(جب تھیوڈیوسیس نے ملحدین کو شہری حقوق سے محروم کیا تو مذہبی عقیدہ کی درستی تاریخ میں پہلی بار شہریت کی قیمت قرار پائی)

تھیوڈیوسیس دوم (Theodosius II) نے غیر مسیحیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کر دیا۔ شہنشاہ لیو (Leo) نے غیر عیسائیوں کے لیے قانون کا پیشہ ممنوع قرار دیا۔ شہنشاہ جسٹی نین (Justinen) نے تعلیم کے عہدے صرف عیسائیوں کے لیے مختص کر دیے، اور آخرش 529ء میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مشرک یا تو مسیحیت کو قبول کرے یا اس کا مال و متاع ضبط کر کے اسے ملک بدر کر دیا جائے۔ قسطنطین کے جانشینوں میں شہنشاہ جولین (Julian) نے مسیحیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اسے ملحد کہا جانے لگا، اور اسی نام سے وہ تاریخ میں مشہور ہے۔

رومن شہنشاہوں کے بعد مغربی عہد میں اس جبری تبدیلی مذہب میں مزید شدت نظر آتی ہے، شارلیمن کے دور میں غیر مسیحیوں کے لیے دو ہی راستے تھے: مسیحیت یا موت۔ اور یہ سارا جبر و اکراہ کلیسا کے اشاروں اور اس کی مرضی کے مطابق تھا۔

---

(1) The Uses of the Past By H.Muller, P.186

(2) Cambridge Modern History V.10, P.152

CamScanner

کلیسا کے دور اقتدار میں کسی فرد کے لیے مسیحیت سے انکار یا تجسمہ لینے کے بعد کلیسائی قوانین سے گریز ممکن نہ تھا، ایسا کرنا نہ صرف کلیسا بلکہ حکومت اور معاشرت سے بھی بغاوت کے مترادف تھا، کلیسا سے سرکشی کا نام "بدعت" (Heresy) تھا اور بدعت اس دور کا سب سے سنگین جرم تھا، بدعت کا دائرہ نہایت وسیع تھا جس کا اطلاق مذہب، افکار رسم ورواج، علم وعمل ہر شے پر تھا۔ بدعت کے نام پر کلیسا نے انسانی معاشرے پر جو مظالم کیے ہیں وہ عدم رواداری کی بدترین مثالیں ہیں، جن وحشی اقوام نے مسیحیت کو قبول کیا انھیں مغربی معاشرہ میں سارے حقوق ملے، لیکن سیکسن (Sexon) قوم نے مسیحیت کو قبول نہیں کیا جس کی پاداش میں پوری قوم کا صفایا ہی کر دیا گیا۔

میکسیکو کے باشندے تلوار اور طاقت کے زور پر مسیحی بنائے گئے، اور اس کا اعتراف خود مسیحیت کا حامی مصنف ٹائن بی نے بھی کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں:

"In Mexico...they had been converted to Christianity by force and had never been given freedom to reject it."(1)

(میکسکو کے باشندے زبردستی مسیحی بنائے گئے، اور انھیں کبھی بھی اسے مسترد کرنے کی آزادی نہیں دی گئی)

اسپین میں ایک ایسی قوم کا قتل عام کیا گیا جو وہاں آٹھ سو سال سے آباد تھی اور جو عہد حاضر کی اولین معمار تھی، اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسیحی نہیں تھی۔ پھر اسپین کے انہیں مسیحیوں نے امریکہ میں مقامی باشندوں کو زبردستی مسیحی بنایا، انھیں مجبور کر کے ان سے کلیسا اور خانقاہیں تعمیر کروائیں۔

اسی طرح جرمنی میں کسانوں کا، اٹلی میں کتھارس (Cathars) کا اور پھر تحریک اصلاح کے پروٹسٹنٹ (Protestant) اور اناباپٹسٹ (Anababtist) فرقوں کا قتل عام، نیز فرانس میں فرانسس اول کے دور سے آنے چہارم کے دور تک ہونے والی چالیس سالہ خونریزی، یہ سب جبری تبدیلی مذہب کا شاخسانہ ہیں۔

الغرض پانچویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک مسیحی عقائد کی ترویج اور حفاظت دونوں کے لیے قوت اور جبر کا بے دریغ استعمال کیا گیا، یہاں تک کہ مغرب میں سوائے رومن کیتھولک کے کوئی اور عقیدہ باقی نہ بچا۔

مسیحیت میں بت پرستی کی آمیزش

قرون وسطی کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہے کہ مسیحیت گرچہ طاقت وحکومت کے ذریعہ پورے مغرب میں نافذ کر دی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادیان ومذاہب کے اس خونیں معرکہ میں وہ بری طرح شکست سے دوچار ہوئی، مسیحیت کی ہمہ گیری وہمہ جہتی کو ثابت کرنے اور اس کو ہر حال میں نافذ ورائج کرنے کی کوششوں نے مسیحیت کو

---

(1) An Historian's Approach to Religion, P.159

پوری طرح مسخ کر دیا، اور المیہ یہ ہے کہ اس میں سب سے بڑا ہاتھ خود مسیحیت کے محافظوں اور علمبرداروں کا ہے۔

مسیحیت کو مسخ کرنے کی شروعات سب سے پہلے سینٹ پال نے کی، اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو پس پشت ڈالتے ہوئے عقیدۂ توحید میں تحریف کی اور مختلف عقائد ونظریات کے ساتھ سب سے پہلے ''عقیدۂ تثلیث'' کو پیش کیا جس پر 324ء میں نیقیہ کی کونسل نے مہر تصدیق ثبت کردی اور کونسل کے شرکاء نے شہنشاہ قسطنطین کی خوشنودی کے لیے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھالیا۔

نیقیہ کی شریعت ساز کونسل کے بعد ایسی متعدد کونسلیں منعقد ہوئیں جن کے توسط سے پادریوں، مذہبی رہنماؤں اور بادشاہوں نے مسیحیت کو رفتہ رفتہ تثلیث کے عنوان سے شرک کے گڑھے میں ڈال دیا، پھر اس گڑھے میں وہ خود بھی اتنا گرے کہ مزعومہ تین خداؤں کے علاوہ فرشتے اور اولیاء کی عبادت یا کم از کم عابدانہ تعظیم کو ضروری سمجھنے لگے، حتی کہ 787ء میں نیقیہ کی دوسری کونسل منعقد ہوئی اور اس میں فرشتوں واولیاء ومقدسین کی تصاویر اور مجسمے بنانے، ان کی تعظیم کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کو باقاعدہ جائز قرار دیا گیا۔ (۱)

نیقیہ کی کونسل میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی خدا تسلیم کرتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ باپ کے پہلو میں ایک نہیں دو خدا تھے، حضرت عیسیٰ اور کنواری مریم۔ اس عقیدہ کے ماننے والے ''مریمی'' (Mariamites) کہلاتے ہیں، اس بات کی وضاحت مشہور مترجم قرآن ''سیل'' (Sale) نے ان الفاظ میں کی ہے:

"This notion of the divinity of the virgin Mary was also believed bysome at the council of Nicea, who said there were two gods besides the Father, viz. Christ and the virgin Mary, and were hence named Mariamites." (2)

428ء میں قسطنطنیہ کا بطریک نسطور نے حضرت مریم علیہا السلام کی ذات کو موضوع بحث بنایا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ''انسان کی طبیعت حضرت مریم سے پیدا ہوئی ہے اس طرح مریم انسانوں کی ماں ہیں خداوند یسوع کی ماں نہیں ہیں۔''

نسطوری کے اس نظریہ کے رد میں 431ء میں افسس (Ephasus) کی کونسل منعقد ہوئی جس میں نسطور کے نظریہ کو رد کیا گیا اور حضرت مریم علیہا السلام کو باقاعدہ ''خداوند کی ماں'' تسلیم کیا گیا۔ (۳)

لیکن اس نظریہ اور اس مباحثہ کے بعد سے حضرت مریم علیہا السلام کے سلسلہ میں سخت غلو سے کام لیا جانے

---

(1)The New Catholic Dictionary , P.44

(1) The Koran Or Alcoran Of Mohammed By G. Sale, P.25

(2) Encyclo. of Religion and Ethics V.9, P.908

گیااوران کو بندوں اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ''شافع'' (Mediator) تسلیم کرلیا گیا، کلیسا میں ان کی حمد وثنا کے نغمے گونجنے لگے، اور نجات ومعافی کے حصول، خطرات وخدشات سے تحفظ اور غم والم کے موقعوں پر ان سے باقاعدہ دعائیں کی جانے لگیں۔ (۱)

نیز نسطور کی بحثوں کے بعد سے ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی بھی پرستش کی جانے لگی:

"....The worship of Mary was greatly emphasized after the Nestorian controversy."(2)

(نسطورین کی چھیڑی ہوئی بحث کے بعد سے مریم کی عبادت پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا)

شریعت ساز کونسلوں اور پادریوں کے علاوہ وحشی وبربر اقوام کے قائدین اور عوام نے بھی مسیحیت میں بت پرستی کی خوب آمیزش کی، مسیحیت قبول کرنے والوں کو کلیسا کی جانب سے بے تحاشا انعامات ومراعات سے نوازا جاتا تھا، اور چونکہ مسیحیت ایک غیر مدون وغیر منظم مذہب کا نام تھا جس میں کسی بھی طرح کی حد بندی نہیں تھی، اس لیے مسیحیت کے دائرہ میں داخل ہونے والے اپنی سابقہ بت پرستانہ ومشرکانہ افکار واقدار کے ساتھ داخل ہوئے، کیونکہ انھیں مسیحیت سے زیادہ عہدوں اور دنیوی عیش وعشرت سے دلچسپی تھی، اور یہ مسیحیت کا نہایت کمزور اور تاریک پہلو تھا جس کے سامنے مسیحیت اور کلیسا سب بے دست وپا تھے۔

''معرکۂ مذہب وسائنس'' کا مصنف ڈریپر (J. W.Draper) لکھتا ہے:

"Place, profit, power- these were in view of whoever now joined the conquering sect. Crowds of worldly persons, who cared nothing about its religious ideas, became its warmest supporters. Pagans at heart, their influence was soon manifested in the paganization of Christianity that forthwith ensued"(3)

(فاتح اور کامیاب جماعت کے ساتھ جو کوئی شریک ہوا اسے بڑے بڑے عہدے اور مرتبے ملنے لگے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیادار لوگ جنھیں مذہب کی خس برابر پروا نہ تھی مسیحیت کے سب سے زیادہ جوشیلے حامی ہوگئے، چنانچہ وہ بظاہر عیسائی لیکن بباطن مشرک وبت پرست تھے، لہٰذا ان کے اثر کی وجہ سے عیسائیت میں بت پرستی وشرک کے عناصر کی آمیزش شروع ہوگئی) (۴)

---

(1) Encyclo. Brit. 14th Edition v.14 P.1000

(2) Islam and Christian Theology by J.W. Sweetman, P.32

(3) A History Of The Conflict Between Religion And Science By John William Draper,P.39

(۴) ترجمانی: مولانا ظفر علی خاں: - معرکۂ مذہب وسائنس

رفتہ رفتہ مسیحیت نے ہر طرح کے شرک کو اپنے اندر سمولیا، گو اس نے یہی دعوی برقرار رکھا کہ وہ توحید کی داعی اور آسمانی مذہب ہے، لیکن بت پرستی کے تمام رسم ورواج اس میں سرایت کرتے چلے گئے اور بقول ولیم ڈیپر (William Draper):

''شادیوں میں عشق ومحبت کی دیوی وینس (Venus) کے بھجن گائے جانے لگے۔ پرستش کے نمائشی اور بھڑک دار طریقے جاری ہوگئے، پادریوں نے پرتکلف لباس اور ٹوپیاں اور تاج پہننے شروع کردیے، کافوری شمعیں، سونے چاندی کے گلدان مراسم مذہبی کے لوازم میں داخل ہوگئے، عبادت میں راتوں کے جلوس کی سی دھوم دھام نظر آنے لگی، قربانی کے ذریعہ سے طہارت ہونے لگی، گرجا شہداء کے مزاروں پر بنائے جانے لگے اور ان کی تطہیر وتقدیس ان رسموں کے ذریعہ ہونے لگی جو سلف میں بت پرست پجاریوں کے یہاں رائج تھیں..... مورتیں اور تبرکات گرجاؤں کے ضروری لوازم تھے، اور خوش عقیدہ لوگ بتوں کی طرح ان کو پوجتے تھے..... مندروں اور قربان گاہوں کی تعداد از حد بیان تھی..... مرور قرون نے عیسائی اور بت پرستی کے اس الحاق کو اور زیادہ کامل ومکمل بنادیا۔''(۱)

بالآخر کلیسا کے دور اقتدار میں اس کے مظالم اور اس کی بے جا نوازشوں کے ذریعہ مسیحیت پوری طرح مسخ ہوکر ایک بت پرست مذہب بن گئی۔

"Christianity - assumed a form that was quite as polytheistic and quite as idolatrous as the ancient paganism."(2)

(مسیحیت نے ایک ایسی شکل اختیار کرلی جو قدیم مذاہب کی طرح بالکل مشرکانہ وبت پرستانہ تھی)

دنیادار نو مسیحیوں کی تالیف قلوب کا یہ طریقہ جس کے ذریعہ ان کے مشرکانہ عقائد ومراسم کو بھی اختیار کرلیا گیا اصحاب بصیرت کے اعتراض سے نہ بچ سکا چنانچہ فاسٹس نے قیصر آگسٹائن سے برملا ان ملامت آمیز الفاظ میں خطاب کیا:

"You have," says Faustus to Augustine," substituted your agape for the sacrifices of the pagans : for their idols your martyrs, whom you serve with the very same honors. You appease the shades of the dead with wine and feasts. Nothing distinguishes you from the pagans, except that you hold your assemblies apart from them."(3)

(تم میں اور بت پرستوں میں کیا فرق باقی رہا! اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ تمہاری جماعت علیحدہ ہے اور ان کی جماعت علیحدہ، ورنہ افعال دونوں کے ایک ہی سے ہیں، ان کے قربانیاں ہوتی ہیں جن میں بدمستیوں کا زور ہوتا

---

(۱) ایضاً/۱۴۶، ۱۴۷

(2) History of European Morals, Vol.2, P.97

(3) A History Of The Conflict Between Religion And Science By John William Draper, P.48

ہے، تمہارے بزم محبت ترتیب دی جاتی ہے جو مذہبی شکل میں ہوسنا کی اور عیش پرستی کا دوسرا نام ہے، ان کے یہاں بت پوجتے ہیں تمہارے یہاں شہداء واولیاء کی پرستش ہوتی ہے، تم ان کی طرح مردوں کی روحوں کی تواضع شراب وکباب اور چنگ ورباب سے کرتے ہو، بت پرستوں کے تمام مذہبی تہوار تمہارے یہاں اسی ذوق وشوق سے منائے جاتے ہیں..... طرز ماندو بود اور عادات واطوار کے لحاظ سے تو تم میں اور ان میں مطلق فرق نہیں)(۱)

آٹھویں صدی میں شہنشاہ لیو(Leo) نے چاہا کہ کلیسا سے سارے بتوں کا صفایا کر دیا جائے تو اس کی پرزور مخالفت ہوئی، لیکن جب بادشاہ اپنی ضد پر قائم رہا اور اس کا ارادہ نہ بدلا تو پاپائے روم نے اس کے خلاف سخت نوٹس لیتے ہوئے اس کے ارتداد کا فتویٰ دے دیا جس کے نتیجہ میں شہنشاہ کو سخت ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔(۲)

کلیسا کی مذہبی اجارہ داری

رومن باشندوں کی زندگی کا محور رومی ریاست تھی، وہ ریاست ہی کے لیے جیتے تھے اور اسی کے لیے مرتے تھے، ریاست کے لیے مرمٹنا، اسے عظیم تر بنانا، اس کی عظمت ووقار کو قائم رکھنا ہی ان کا مقصد حیات تھا، لیکن رومی سلطنت پر جب کلیسا کا اقتدار مضبوط ہوا تو رومی باشندوں کی وہ تمام وفاداریاں اور جاں نثاریاں جو شہنشاہ کے ساتھ خاص تھیں کلیسا کی جانب منتقل ہوگئیں، اور جو تقدس واحترام شہنشاہ کے لیے خاص تھا وہ سب پوپ کے لیے مخصوص ہوگیا، شمس پرستی کے عقیدہ نے شہنشاہ کو خدا کا نائب بنایا تھا اور اسے حکومت کا آسمانی استحقاق عطا کیا تھا، شمس پرستی کی جگہ جب مسیحیت نے لے لی تو شہنشاہ کی جگہ پوپ نے سنبھال لی، اور وہ روئے زمین پر ''خداوند یسوع'' کا نائب قرار پایا اور حکومت کا استحقاق خداوند کے نائب کو حاصل ہوا۔

اس طرح مغربی معاشرہ کا ہر شعبۂ حیات کلیسا کے ماتحت آگیا اور مذہبی طور پر پوری مسیحی قوم کلیسا کے احکام وفرامین کے تابع ہوگئی۔ اور یہ عقیدہ عام ہوگیا کہ پادری حضرت عیسیٰ کا نائب وقائم مقام ہونے کی وجہ سے سارے اختیارات کا مالک ہے، نہ اس کا کوئی فیصلہ غلط ہوسکتا ہے، نہ اس کے کسی فیصلہ پر تنقید کی جاسکتی ہے، وہ گناہوں کو معاف بھی کرسکتا ہے، اور سزا بھی دے سکتا ہے، اس کا معمولی سا حکم بھی بارگاہ خداوندی میں رد نہیں ہوسکتا۔

اعتراف گناہ

کلیسائی عروج کے وقت لوگوں کی ذہنی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ ہر مسیحی یہ یقین رکھتا تھا کہ گناہوں پر سزا دینا یا معاف کرنے کا اختیار کلیسا کو ہے، اور کسی گناہ پر کلیسا کا سزا یافتہ ہمیشہ جہنم میں جلایا جائے گا، اور اسے ہر طرح کے

---

(۱) ترجمانی: مولانا ظفر علی خاں:۔ معرکۂ مذہب وسائنس

(2) History of European Morals, Vol.2, P.266

عذاب کا سامنا کرنا ہوگا، گناہ کے اس بوجھ سے صرف کلیسا ہی نجات دلا سکتا ہے اور اسی کی مرضی سے جنت کا استحقاق ہوسکتا ہے، اور چونکہ پادری ہمیشہ لوگوں کو جہنم کے گوناگوں عذاب سے ڈراتے تھے اس لیے عوام جہنم کے عذاب سے بری طرح خوف زدہ تھے، اور پادریوں کے نہایت شکر گذار اور ان کے احسان مند تھے کہ وہ انھیں دائمی عذاب سے بچالیں گے۔ عوام کی اس ذہنی مرعوبیت اور مذہبی دہشت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر مسیحی کے لیے کلیسا میں حاضر ہوکر پادری کے سامنے "اعتراف گناہ" (Confession) لازم ہوگیا۔ اس طرح ہر بالغ مرد وعورت ہفتہ میں ایک مرتبہ پادری کے سامنے اپنے تمام گناہ کا اعتراف اور توبہ کرنے لگے۔

ابتدائی دنوں میں گناہوں کا اعتراف کرنا ایک اختیاری امر تھا، خاص کر جس شخص کو اپنے گناہوں پر ندامت اور اپنی سیاہ بختیوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا وہی کلیسا میں حاضر ہوکر اپنے گناہوں سے توبہ کرتا تھا، لیکن پوپ انوسینٹ سوم نے اپنے دور پاپائیت میں اسے لازم قرار دے دیا اور ہر مسیحی شخص کے لیے سال میں کم از کم ایک بار کلیسا میں حاضر ہوکر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا اور اس پر پادری کے فیصلہ کو قبول کرنا لازم ہوگیا:

".....but afterwards sanctioned by the ordinance of Innocent III, that every one should confess to a priest at least once in every year."(1)

(لیکن اس کے بعد انوسینٹ سوم کے فرمان کے ذریعہ یہ قانون نافذ ہوا کہ کم از کم سال میں ایک بار ہر کسی کے لیے پادری کے سامنے اعتراف گناہ کرنا لازم ہے)

اعتراف گناہ کی یہ رسم آج بھی جاری ہے، اور کیتھولک کلیسا کے مطابق سال میں کم از کم ایک مرتبہ اقرار گناہ وتوبہ کرنا ضروری ہے، اس عمل میں مسیحی شخص کلیسا میں پادری (جسے فادر (Father) کہا جاتا ہے) کے سامنے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتا ہے نیز اپنے دل کی سبھی اچھی بری باتیں بھی اس سے بیان کرتا ہے، اس دوران عام طور پر دونوں کے درمیان کوئی ہلکا سا پردہ یا کوئی دوسری چیز حائل رہتی ہے، پھر فادر اس کے لیے دعائیں کرتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نمائندہ کے طور پر اس کے گناہوں پر جزا وسزا کا حکم صادر کرتا ہے، اس طرح پادری کے سامنے اعتراف گناہ کرنے والوں کے تقریباً سبھی راز عیاں ہوتے ہیں؛ جو برائیاں اب تک دنیا بھر سے مخفی ہیں وہ فادر کے سامنے بالکل وا ہوجاتی ہیں، اور پھر ارباب کلیسا ان پوشیدہ عیوب وجرائم سے مالی وجسمانی فائدے اٹھاتے ہیں۔

معافی نامے

اعتراف گناہ پر پادری کی جانب سے ملنے والی سزا یا معافی نے رفتہ رفتہ باقاعدہ "معافی نامہ"

---

(1) Popery:Its Character And Its Crimes by William Elfe, P.83

(Indulgences) کی شکل اختیار کر لی، اور تحریری طور پر معافی نامے یا بالفاظ دیگر "جنت کے پروانے" ملنے لگے جو درحقیقت دولت جمع کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا، چنانچہ مختلف گناہوں کے لیے مختلف جرمانے اور تاوان مقرر ہوئے جن کی ادائیگی پر گناہ گار کو معافی کی سند (Indulgences) مل جایا کرتی تھی۔

معافی نامہ کا باقاعدہ آغاز گیارہویں صدی میں صلیبی جنگوں (Crusades) کے موقع پر ہوا جب پادری اربن دوم (UrbanII) نے یہ اعلان کیا کہ جو جو لوگ بذات خود "ارض مقدس" کی بازیابی میں شریک نہیں ہو سکتے وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیں، اس کے بدلہ میں اسے "معافی نامہ" دیا جائے گا جو اس کی نجات کا ذریعہ ہوگا، اس لالچ میں لاکھوں مسیحی صلیبی جنگ میں شریک ہوئے تھے:

"Such indulgences were first invented in the eleventh century, by Urban II. as a recompence for those who went in person upon the glorious enterprise of conquering the Holy Land. They were afterwards granted to those who hired a soldier for that purpose."(1)

1513ء میں پوپ لیو دہم (Leo X) نے جب روم میں قدیس پطرس کا کلیسا تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے رقم کی فراہمی ایک اہم مسئلہ تھا چنانچہ لیو اور اس کے نمائندوں نے بڑے پیمانہ پر "معافی ناموں" کو فروخت کیا اور ضرورت سے زائد رقم اکٹھا کی، اس طرح ارباب کلیسا کو کمائی کا ایک بہترین ذریعہ مل گیا، چنانچہ معافی ناموں کی فروخت کا عام چلن ہو گیا، شہر شہر، قریہ قریہ، کو بہ کو، ہر جگہ معافی ناموں کی ایجنسیاں قائم ہو گئیں، ہر گناہ کی الگ قیمت اور ہر قیمت کا الگ معافی نامہ سر بازار دستیاب ہونے لگا، یہ معافی نامے گناہوں کی بخشش اور جنت کے حصول کی سند ہوا کرتے تھے، اور ان کی عبارت کچھ اس طرح ہوا کرتی تھی:

"تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور اپنے مقدس رحم و کرم کے ذریعہ تمھیں معاف کرے، میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس، پولس اور مقدس پوپ کی اس سند کے توسط سے جو انھوں نے مجھے عطا کی ہے تمھیں آزاد کرتا ہوں؛ سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں، پھر تمھارے ہر ایک حدود شکنی اور تجاوز سے خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور سنگین کیوں نہ ہوں، اور میں تم سے تمھاری اس سزا کو رفع کرتا ہوں جو تمہارے گناہوں کی پاداش میں تمھیں جہنم میں ملنے والی تھی، تاکہ جب تم مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ ہوں۔ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔"(۲)

ہر ایجنٹ کے پاس معافی ناموں ایک فہرست ہوا کرتی تھی جس میں مختلف گناہ کی قیمتیں درج تھیں، لوگ اپنے گناہوں کی قیمت ادا کر کے معافی نامے خرید لیا کرتے تھے، ذیل میں چند گناہ اور ان کی متعینہ قیمتیں ملاحظہ ہوں:

S.D/7.6 ..... (Procuring Abortion) اسقاط حمل

(1,2) Buck's Theological Dictionary (Indulgences)

ہتک عزت (Sacrilege) ..... S.D./ 10.6

جھوٹی گواہی (False Oath) S.D./9.0

ڈکیتی (Robbing) ..... S.D./ 12.0

پاکدامن کی عصمت دری (Defiling a Virgin) S.D./9.0

حرمت کی پامالی (Lying with a Mother,Sister) S.D./7.6

پادری پر دست درازی (Violent Hands on a Clergy) .. S.D./ 10.6

قتل ناحق (Murdering a Layman) S.D./7.6

داشتہ گری (Keeping a Concubine) ..... S.D./ 10.6 (1)

یہ معافی نامے صرف اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے ہی خاص نہ تھے بلکہ اس کے ذریعہ مردوں کے گناہ بھی بخشوائے جاسکتے تھے، اور انھیں جہنم سے نکلوا کر جنت تک بھی پہنچایا جاسکتا تھا، چنانچہ معافی نامے فروخت کرنے والے ایجنٹ گلی گلی، محلہ محلہ اس طرح کی صدا لگایا کرتے تھے:

''آؤ-بڑھو! جنت کے دروازے کھلے ہیں، اگر تم اب بھی داخل نہ ہوگے تو کب ہوگے؟ تم صرف بارہ پنس (Pence) کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو، کیا تم ایسے ناہنجار ہو کہ اپنے ماں باپ کے لیے اتنی سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے ؟! اگر تمہارے پاس کچھ نہیں سوائے ایک کوٹ کے، تو تم اسی کو اتار کر اس متاع گراں بہا کو خرید لو۔''

"Lo," said they, "the heavens are open: if you enter not now, when will you enter? For twelve pence you may redeem the soul of your father out of purgatory; and are you so ungrateful that you will not rescue the soul of your parent from torment? If you had but one coat, you ought to strip yourself instantly, and sell it, in order to purchase such benefit."(2)

معافی ناموں کی تجارت نے جرائم و گناہوں کی سنگینی کو بالکل ختم کر دیا، فحاشی و بے حیائی عام ہوگئی، مجرموں کے حوصلے بڑھ گئے، جرائم کا گراف اونچا ہوتا گیا اور پورا مسیحی معاشرہ اخلاقی بحران کی لپیٹ میں آگیا، گناہوں پر جرأت و حوصلہ مندی اور دیدہ دلیری و دریدہ دہنی کا اندازہ درج ذیل عبارت سے لگایا جاسکتا ہے:

1450ء میں آکسفرڈ کا چانسلر تھامس (Thomas Gascoigne) لکھتا ہے:

"Sinners say nowdays: "I care not what or how many evils I do before

---

(1)S.:shilling (شلنگ) and D.:Penny(a former abbreviation) (پنی)

(2) Buck's Theological Dictionary (Indulgences)

God, for I can get at once, without the last difficulty, plenary remission of any guilt or sin whatever through an indulgence granted me by the Pope, whose written grant I have bought for four pence, or for the stake of a game of a ball": for indeed these sellers of indulgences run about from place to place, and sometimes sell one two pence, or a drink of wine or beer, or enough to pay their losses at gaming, or the hair of a harlot."(1)

(آج کل مجرم یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں کہ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں خدا کے حضور کتنے گناہ کرتا ہوں، کیونکہ میں ہر وقت اور ہر جگہ ہر گناہ اور ہر جرم کے لیے معافی نامہ خرید سکتا ہوں، کبھی چار پنس میں تو کبھی جوئے کے ایک داؤ کی قیمت کے بدلہ، اس لیے کہ ان معافی ناموں کے بیچنے والے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں، اور وہ انھیں کبھی دو پنس میں کبھی ایک جام شراب کے بدلہ یا جوئے میں ہاری ہوئی رقم کے عوض میں اور گاہے کسی فاحشہ کی اجرت کے عوض میں بیچ دیتے ہیں)

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے عظیم قائد مارٹن لوتھر (Martin Luther) کی بغاوت اور تحریک اصلاح کے ابتدائی موضوعات ومحرکات میں یہی قابل نفریں کاروبار شامل تھا۔ (۲)

کلیسا کا نفاق عظیم (Great Schism)

مشرقی ومغربی کلیساؤں کے مابین چوتھی صدی سے ہی نظری وفکری چشمک قائم تھی، قرون وسطی میں یہ چشمک سنگین اختلافات میں تبدیل ہوگئی، جس کے بعد سے مشرقی کلیسا نے مغربی کلیسا سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی اختیار کرلی، مشرقی ومغربی کلیسا کے مابین اسی علیحدگی کو مسیحیت کی تاریخ میں ''نفاق عظیم'' (Great Schism) کے عنوان سے ذکر کیا جاتا ہے:

"The "SCHISM" lies primarily in the acceptance of the estrangement."(3).

(بنیادی طور پر افتراق کو تسلیم کرنا ہی ''نفاق'' ہے)

اس علیحدگی کے بعد مشرقی کلیسا نے اپنا نام بھی تبدیل کرلیا اور وہ تاریخ میں ''دی ہولی آرتھوڈکس چرچ'' (The Holy Orthodox Church) کے نام سے مشہور ہوا، اور اس کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بطریرک (Patriarch) کہا جانے لگا۔

علیحدگی کے اسباب

مشرقی ومغربی کلیسا کی علیحدگی (Schism) کے اسباب متنوع وعمیق اور کئی صدیوں پر محیط ہیں، تاہم چند

---

(1) Treatise on Right and Wrong by Mencken, PP.187,188

(1) Oxford Dictionary of the Church (Luther)

(2) After Nine Hundred years, by yves Congar, P.75

بنیادی اسباب کا ذکر حسب ذیل ہے:

نظریاتی اختلاف

مشرقی کلیسا کا عقیدہ تھا کہ روح القدس کا صدور صرف باپ سے ہے اور بیٹے کا رتبہ باپ سے کم ہے۔ جبکہ مغربی کلیسا کا عقیدہ تھا کہ روح القدس کا صدور باپ اور بیٹے دونوں سے ہے، اور رتبہ میں دونوں برابر و یکساں ہیں۔ یہ عقائد کا پہلا اختلاف تھا جو کئی صدیوں سے جاری تھا اور اس کے حل کے لیے دونوں کلیسا کے مابین زبردست مباحثے ہوئے اور متعدد کونسلیں بھی منعقد ہوئیں۔

381ء میں قسطنطنیہ کی پہلی کونسل منعقد ہوئی اور اس میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ روح القدس کا صدور صرف باپ سے ہوا ہے جیسا کہ مشرقی کلیسا کا عقدہ تھا۔

شہنشاہ شارلیمن کے عہد میں مغربی کلیسا کو قوت و استحکام حاصل تھا اور شہنشاہ بھی پوپ کی مرضیات کو اہمیت دیتا تھا چنانچہ شہنشاہ نے مشرق و مغرب کی اس بحث میں خاصی دلچسپی دکھائی اور آخرش حکم دیا کہ قسطنطنیہ کے منظور شدہ عقیدہ میں جہاں یہ لکھا ہے: ''روح القدس کا صدور باپ سے ہوا ہے'' وہاں پر ''اور بیٹے سے'' کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔ شہنشاہ کا یہ حکم مشرقی کلیسا کی مرضی کے بالکل خلاف تھا، چنانچہ اختلافات میں شدت بڑھتی ہی گئی جو بالآخر دونوں کی تفریق پر تمام ہوئی:

"The objection of the Eastern Church to this insertion caused the final rupture between the two Churches in 1054."(1)

(مشرقی کلیسا کی جانب سے اس اضافہ پر اعتراض، دونوں کلیساؤں کی ۱۰۵۴ء میں مکمل علیحدگی کا باعث بنا)

اس کے علاوہ دوسرا اہم مسئلہ مذہبی اقتدار کا تھا، مغربی کلیسا کا اصرار تھا کہ عالم مسیحیت مغربی کلیسا کے ماتحت ہونا چاہیے جبکہ مشرقی کلیسا کو اس سے سخت اختلاف تھا، ان بنیادی اختلافات کو لے کر 869ء کو قسطنطنیہ کی چوتھی کونسل منعقد ہوئی جس میں مغربی کلیسا کے نظریات کو منظوری حاصل ہوئی اور درج ذیل قرارداد منظور ہوئی:

۱- روح القدس کا صدور باپ اور بیٹے دونوں سے ہوا ہے۔

۲- مسیحیت سے متعلق ہر چیز کے بارے میں کلیسائے روم ذمہ دار اور مستند ہے

۳- پوری دنیا کے مسیحی تمام رسوم رواج میں پاپائے روم کے ماتحت ہوں گے۔

۴- بطریق نوسیوس (کلیسائے مشرق کا سربراہ) اور اس کے ماننے والے ملعون اور محروم ہیں۔ (۲)

---

(1) A Short History of our Religion, by D.C.Somervell, P.161

(۲) مسیحیت۔ علمی و تاریخی حقائق کی روشنی میں/ ۱۳۵

اس قرارداد کے بعد مشرقی ومغربی کلیساؤں کے مابین مذہبی دوریاں بڑھنے لگیں، جس نے رفتہ رفتہ خلیج کی شکل اختیار کرلی۔

مذکورہ بنیادی عقیدہ ونظریہ کے علاوہ دونوں کے مابین دیگر مذہبی ونظریاتی اختلافات بھی تھے جیسے:

مغربی کلیسا یہودیوں کے سبت کو روزہ کا دن قرار دینے کی ہمت افزائی کرتا تھا، اور پادریوں کو شادی سے منع کرتا تھا جبکہ مشرقی کلیسا کا نظریہ اس کے برخلاف تھا۔

مشرقی افراد غوطہ کے ذریعہ بپتسمہ کرتے تھے جبکہ مغرب میں یہی کام پانی چھڑکنے سے کیا جاتا تھا۔

مشرق میں اجتماعی کھانے پر لوگوں کو روٹی اور شراب دونوں پیش کی جاتی تھی جبکہ مغربی کلیسا کے لوگ صرف روٹی پر اکتفا کرتے تھے۔

مشرقی کلیسا عبادت کے لیے یونانی زبان استعمال کرتی تھی جبکہ مغربی کلیسا میں لاطینی زبان کا استعمال ہوتا تھا۔

سیاسی اختلاف

مشرقی ومغربی کلیسا کی تقسیم میں سیاسی وجغرافیائی اختلاف کو بھی بنیادی دخل ہے، مشرق میں ایشائی اور یونانی نسل آباد تھی اور مغرب میں اطالوی اور جرمنی لوگ آباد تھے، اور ان کے مابین نسلی امتیازات کی جڑیں خاصی گہری تھیں۔

مشرقی تہذیب وثقافت یونان کا ورثہ تھی اور اسے سکندر اعظم کی نسبت پر فخر تھا جبکہ مغرب اپنے فاتح ہونے پر نازاں تھا اور مشرق کو مفتوح قوم ہونے کی بنیاد پر اپنے سے کمتر سمجھتا تھا۔

رومن امپائر کا دارالخلافہ مشرق کا قسطنطنیہ تھا جس کی وجہ سے مشرق کو سیاسی برتری کا دعویٰ تھا جبکہ مغربی کلیسا اپنی نسبت قدیس پطرس اور سینٹ پال کی جانب کرتا تھا اور اسے ہر طرح کی نسبت پر فوقیت دیتا تھا۔

730ء میں مشرقی رومی شہنشاہ لیوا سورین (Leo the Isaurian) کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی پے در پے شکست مسیحیوں کے اس گناہ کی پاداش میں ہے کہ انھوں نے بزرگوں کے مجسموں اور ان کی یادگاروں کی پرستش شروع کر رکھی ہے، چنانچہ اس نے بت شکنی کا حکم (Edict of Iconoclasm) دیا اور کلیساؤں سے بھی بت تڑوانے شروع کیے، اس پر کلیسائے روم کے پوپ گریگوری سوم (Gregory III) نے سختی سے مخالفت کی اور شہنشاہ کو "مستوجب لعنت" (Anathematised) قرار دے دیا۔ بعدازاں گرچہ کلیساؤں سے بت شکنی روک دی گئی لیکن حالات ناگفتہ بہ ہوتے گئے۔ (1)

1054ء میں پوپ لیونہم (Leo IX) نے مغربی عقائد ونظریات کو مشرق پر تھوپنے کی کوشش کی، قسطنطنیہ کے

---

(1) A Short History of our Religion, P.157,158

بطریک میکائل (Michael) نے اسے سختی سے رد کر دیا، جس کے بعد یورپ کے سفراء نے کلیسائے سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر لعنت کے کلمات لکھ دیے، جس سے کہرام مچ گیا، گویا اس واقعہ نے گرم لوہے پر آخری ضرب لگادی اور اس طرح 16-جولائی 1054ء کو "نفاق عظیم" (Great Schism) مکمل ہو گیا۔

لعنت کے الفاظ حسب ذیل تھے:

"Let them be Anathema Maranatha, with Simoniacs, Valerians, Arians, Donatists, Nicholaitans, Severians, Pneumatomaohi, Manichees, and Nazarenes, andwith all heretics; yea, with the devil and his angels. Amen. Amen. Amen."(1)

قرون وسطیٰ کی سیاہ تاریخ میں مشرقی و مغربی کلیسا کی تقسیم ایک ایسا ناسور ہے جس کا مداوا کئی صدیاں گذرنے کے بعد بھی ممکن نہ ہو سکا، اور آج پورا یورپ بلکہ پورا عالم مسیحیت مشرق و مغرب کی الگ الگ بنیادوں پر قائم ہے، اور ان بنیادوں سے آپسی رقابتیں اور دشمنیاں بھی رس رہی ہیں جو لاکھ پردہ داری اور لیپا پوتی کے باوجود دنیا کے سامنے عیاں ہے۔

مشرق و مغرب کے مابین اختلافات کی سنگینی اور اس کے تسلسل کو سمجھنے کے لیے یہی ایک مثال کافی ہے کہ 2/مئی 1949ء کو پوپ نے یہ فرمان جاری کیا:

"کیتھولک خاتون کا آرتھوڈکس یا پروٹسٹنٹ مرد سے نکاح حرام ہے۔"(۲)

کلیسائیت و شہنشاہیت کی کشمکش

قرون وسطیٰ کے نمایاں موضوعات میں اہم ترین موضوع حکومت و کلیسا کے مابین کشمکش بھی ہے جس میں ان کی ساری صلاحیتیں اور ساری توانائیاں اپنی برتری کو ثابت کرنے میں ضائع ہوتی رہیں، اور عوام مذہب و سیاست اور کلیسا و حکومت کی دہری غلامی میں گرفتار رہے، ذیل میں اسی کشمکش کی صورت اور اس کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے:

کلیسا کا سیاسی نظریہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین سے آسمانی بادشاہت کا وعدہ کیا تھا، جس کی بنیاد پر بائبل کی تعلیمات کا محور اور توجہات کا مرکز یہی ٹھہرا کہ انسان کس طرح آسمانی بادشاہت میں داخل ہو، چنانچہ بائبل کہتی ہے:

"اگر تجھ کو کامل و پورا ہونا ہو تو اپنی جائداد کو بیچ دے اور اس سے ملنے والی رقم کو غریبوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم

---

(1) The Greek And Eastern Churches By W.F.Adeney, P.241

(۲) دلیل الزواج المسیحی بحوالہ: مسیحیت علمی اور تاریخی حقائق کی روشنی میں: ۱۴۷

کردے، تب تیرے لیے جنت میں نیکیوں کا ایک خزانہ ملے گا، پھر اس کے بعد میرے پیچھے ہولے۔"(۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ مالدار لوگوں کے لیے آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا بہت مشکل ہے۔ اور میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے پار ہونا آسان ہو سکے گا اس کے مقابل کہ کسی مالدار کا خدائی بادشاہت میں داخل ہونا"۔ (۲)

ان ہدایات کی روشنی میں مسیحیوں نے آسمانی بادشاہت یا اخروی لذتِ جاودانی کے حصول کے لیے سخت سے سخت قدم اٹھائے، غیر فطری طریقے اپنائے اور حضرت عیسیٰ کی وہ تعلیمات جن کا تعلق بنی اسرائیل کی دنیا طلبی وہوس پرستی کے خاتمہ سے تھا اسی کو اپنا نصب العین بنالیا، اور اس میں اس حد تک افراط وغلو سے کام لیا کہ جسمانی طہارت ونظافت اور فطرت کے بنیادی تقاضوں کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

ابتدائی تین صدیوں تک مسیحی افراد فکرِ معاش وملک گیری سے دور عاجزی وانکساری پر عمل پیرا رہے، ان پر مظالم ڈھائے گئے، ان کا قتل عام ہوا، ان کی زندگیاں پامال کردی گئیں لیکن وہ ایک گال کے بدلے دوسرا گال پیش کرتے رہے، اور سماجی وسیاسی زندگی کے خاردار درخت سے اپنے دامن کو بچائے رہے، لیکن جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے مسیحیوں کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیا اور کلیسا کے ذمہ داروں کو جاگیریں دیں اور انھیں کاروبار سیاست میں شریک کیا تو ارباب کلیسا کے سیاسی نظریات بھی تبدیل ہونے لگے۔ اور مسیحیت کے سرکاری مذہب بننے کے بعد ارباب کلیسا کی ملک گیری میں دلچسپیاں بڑھنے لگیں۔

کلیسا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جیسے مذہب اور دنیوی زندگی دو الگ الگ چیزیں ہیں اسی طرح کلیسا اور حکومت دونوں الگ الگ خود مختار ادارے ہیں، گیارہویں صدی تک کلیسائی سردار یہی تعلیم دیتے رہے کہ خدا کے حقوق کے ساتھ قیصر کے حقوق بھی ادا کرتے رہنا چاہیے، اور جس طرح خدا کی اطاعت کے سامنے سر تسلیم خم کیا جاتا ہے اسی طرح قیصر کی فرمانبرداری بھی ضروری ہے۔

چوتھی صدی میں بربر وحشی اقوام کے سیل رواں کے سامنے روم کی مغربی سلطنت بھی بہہ گئی تو مشرکین وغیر مسیحی اس تباہی کا الزام مسیحی مذہب پر رکھنے لگے:

"Superstition non-Christian enemies of the Church began to attribute the fall of Rome to the establishment of Christianity there."(3)

(کلیسا کے توہم پرست وغیر مسیحی دشمن روم کی تباہی میں مسیحیت کے فروغ کو ذمہ دار قرار دینے لگے)

---

(۱) متی: ۱۹/۲۱ (۲) متی: ۱۹/۲۳،۲۴

(3) History of European Political Philosphy by R.Bhandari, P.88

مشہور پوپ سینٹ آگسٹائین (St.Augustine) نے ان نظریات کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ روم کی بداخلاقیاں اور بداعمالیاں ہی اس کے زوال کا سبب ہیں، اس کی نظر میں وہ حکومت عزت واحترام اور دائمی عروج کی مستحق نہیں ہوسکتی جس کا تعلق صرف دنیوی زندگی سے ہو:

"The Sack of Rome was a divine dispensation calculated to pave the way for the establishment of a real "De Civitate Dei" i.e The City of God."(1)

(روم کی تباہی ایک قدرتی تقسیم تھی جو وجود پذیر ہوئی تاکہ حقیقی ''شہر خداوندی'' کے قیام کی راہ ہموار ہوسکے)

سینٹ آگسٹائن (St.Augustine) نے روبزوال رومی سلطنت کے مقابل ایک نئی ریاست کا تصور بھی پیش کیا تھا جسے وہ زیادہ پائدار اور نوع انسانی کے لیے زیادہ کارآمد کہتے ہوئے ''شہر خداوندی'' (The City of God) سے تعبیر کرتا تھا، اس نے خدائی ریاست کا جو خاکہ پیش کیا اس میں امن اور انصاف کو بنیادی مقام دیا گیا، اور اس کے بقول امن وانصاف کا حقیقی تصور کلیسا ہی ہے، اس طرح اس نے کھلے لفظوں میں یہ نہیں کہا کہ کلیسا ہی ''شہر خداوندی'' ہے البتہ کلیسا کے اختیارات کو بادشاہ کے اختیارات سے بالاتر قرار دے کر یہی نظریہ پیش کیا جو قرون وسطی کے مفکرین وارباب کلیسا کی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ (۲)

آگسٹائین کا بنیادی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سیاست کے اندر مسیحی فلسفۂ حیات کو بھی شامل کردیا جس سے مسیحیت کی مقبولیت بڑھتی گئی، اور جب روم انتشار وزوال کے دور سے گذر رہا تھا کلیسا ایک مضبوط ومستحکم اور خود مختار ادارہ بن چکا تھا۔

کلیسا کا سیاسی غلبہ

مغربی روم کے استحکام وانتشار کے ساتھ کلیسا کا اقتدار بھی ڈگمگاتا رہا، لیکن آٹھویں صدی میں جب شہنشاہ پے پن (Pepin) نے پوپ کے ''آشرواد'' سے اپنی حکومت قائم کی، تو کلیسا کا سیاسی اقتدار بھی مستحکم ہوگیا، چونکہ شہنشاہ کلیسا کا مرہون منت اور اس کا احسان مند تھا، اس لیے اس نے حکومت میں نہ صرف کلیسا کو بنیادی مقام دیا بلکہ اپنی اور وفاداریاں اور حکومت کی سرگرمیاں کلیسا کی منشا سے وابستہ کردیں۔

پے پن کے جانشیں بھی کلیسا کے احسان مند اور اس کے وفادار رہے اور کلیسا کی روحانی سرپرستی کو اپنے لیے باعث سعادت وصد افتخار سمجھتے رہے، اسی کا فیض تھا کہ شہنشاہ شارلیمن کی حکومت کو روم کی تاریخ میں ''مقدس رومی سلطنت'' کا مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔ لیکن جب مقدس رومی سلطنت انتشار کا شکار ہوکر بکھر گئی تو کلیسا نے عملی طور پر

---

(1)History of European Political Philosphy, P.88

(۲) دیکھیں سینٹ آگسٹائین کی کتاب: "De Civitate Dei" (The City of God)

سیاست کو اپنی گرفت میں لے لیا، اور اس کا فرمان ہر شاہی فرمان سے بھی بلند و بالا ہو گیا، چنانچہ قرون وسطی کا آغاز اس طور پر ہوا کہ پوری مغربی و مسیحی دنیا کلیسا کی مرہون منت اور اس کی خوشہ چیں ہو چکی تھی:

"The medieval world was Christian and Catholic; and all emperors and kings were subject to the laws of the Church."(1)

(قرون وسطی کی دنیا تمام تر مسیحی کیتھولک دنیا تھی، اور تمام بادشاہ و شہنشاہ کلیسائی قوانین و ضوابط کے پابند تھے)

قرون وسطی میں مسیحی دنیا کیتھولک چرچ سے وابستہ تھی، اور چرچ کا فرمان عوام کے ساتھ شاہی گھرانوں پر بھی یکساں طور پر نافذ تھا، حتی کہ شاہوں کے انتخاب میں بھی کلیسا کی مرضی اور اس کے استصواب کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، اس اعتبار سے کلیسا کا مقام شہنشائیت سے بھی اونچا تھا، اور جو مقام و عظمت پوپ کو میسر تھی وہ کسی شہنشاہ کو بھی حاصل نہ تھی کیونکہ مسیحیوں کے نزدیک شہنشاہ ایک فانی گنہگار تھا، اس کا حکم انسانی حکم تھا، جبکہ پوپ خداوند کا نمائندہ اور اس کا نائب تھا اور اس کا حکم آسمانی حکم تھا، اس لیے حکمراں کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ کلیسا کی حفاظت کرے اور کلیسا کا کام عوام پر آسمانی برکتوں کو نازل کرنا تھا، چنانچہ نویں صدی کا پوپ ہی روحانی و مادی حکمراں تھا، اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گناہ تھا، کسی حکمراں میں اتنی سکت نہ تھی کہ سرتابی کر سکے۔

پوپ کے پاس گرچہ اپنی فوجی طاقت نہیں تھی لیکن اس کے جنبش ابرو سے عظیم الشان لشکر میں بھی تموج پیدا ہو جاتا تھا، پوپ کی منشا کے خلاف جانا خودکشی کے مرادف تھا، وہ جس کے سر پر تاج رکھ دیتا وہی شہنشاہ کہلاتا، اس طرح وہ شہنشاہ بھی تھا اور شہنشاہ گر بھی، یہ کیفیت نویں صدی کے اختتام تک قائم رہی۔

کشمکش کا آغاز

دسویں صدی میں کچھ جیالے پیدا ہوئے جنھوں نے بزور شمشیر تاج شاہی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش ضرور کی، تاہم یورپ کو حقیقی سنبھالا اس وقت ملا جب دسویں صدی کے وسط میں سیکسن قوم (Sexon) کا اقتدار قائم ہوا، اور تخت شاہی پر "اوٹو" (Otto) شاہی جرمنی کی حیثیت سے متمکن ہوا، اس نے دشمنوں کا اس طور پر صفایا کیا کہ کوئی مدمقابل باقی نہ بچا، اس طرح جلد ہی اقتدار کو مستحکم کر کے وہ تاریخ میں عظیم ہیرو بن گیا۔

اوٹو سے پیشتر شہنشاہ شارلیمن کے جانشینوں کی حکمرانی تھی، جس میں کلیسا اور پوپ کو بنیادی مقام حاصل تھا، لیکن جب اوٹو نے اس شہنشائیت کو ناپید کر ڈالا تو اس کے ساتھ ہی کلیسا کا زور بھی خاک میں مل گیا، جس کے بعد اسے کلیسا اور اس کے نظام کی بالکل پرواہ نہ تھی، تاہم کلیسا کا اثر و رسوخ باقی تھا اور عوام الناس مذہبی و روحانی طور پر اسی سے وابستہ تھے اس لیے اس کی طرف سے کسی بھی بغاوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا، اس صورتحال سے اوٹو پوری

---

(1)A Short History Of The Catholic Church P.89

طرح واقف تھا چنانچہ پوپ کی ریشہ دوانیوں اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اس نے اپنے رشتہ داروں کو کلیسا میں بشپ بنایا اور انھیں بڑی بڑی جاگیریں دے کر اپنا ہمنوا بنائے رکھا، اس طرح اس کی بالا دستی کلیسا پر بھی قائم ہوگئی، اور اس کا حکم پوپ کے احکامات پر راجح ہوگیا۔

کلیسا پر اوٹو کی بالا دستی کے ساتھ ہی شہنشائیت وکلیسائیت کی کشمکش کا آغاز بھی ہوگیا، اوٹو کے جانشیں شہنشائیت کے وقار کو بحال نہ رکھ سکے، کلیسا پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوئی، وفاداریاں خودغرضیوں میں بدل گئیں اور پاپائیت کا منصب سنگین بحران کا شکار ہوا، خرید وفروخت کا سلسلہ شروع ہوا، رشوتیں عام ہوئیں، با اقتدار طبقہ کی مرضی نافذ ہوتی، پوپ مسند نشیں ہوتے، معزول ہوتے، قتل کیے جاتے یا کال کوٹھریوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے۔

گیارہویں صدی میں کلیسا نے ایک زبردست تحریک چلائی جس کے ذریعہ عام لوگوں میں مسیحی جذبات کو بیدار کیا گیا، لوگوں کو کلیسا کا والہ وشیدا بنایا گیا، کلیسا کو از سر نو منظم کیا گیا، مناصب کے لیے ضابطۂ اخلاق مرتب کیا گیا، تجرد کو لازم قرار دیا گیا، درویش صفت راہبوں کو کلیسا کے بست وکشاد میں زیادہ سے زیادہ حصہ دیا گیا، اس تحریک کو "کلونیک" (Cluniac) کہا جاتا ہے، اور اس سے وابستہ افراد کے جوش وجذبہ کو دیکھتے ہوئے انھیں پاپائی (Papist) کہا جانے لگا۔ اس تحریک کے ذریعہ کلیسا پھر سے مضبوط ہوگیا اور اسے کھویا ہوا مقام دوربارہ حاصل ہوا۔ (۱)

1016ء میں مغربی شہنشائیت کا تاج ہنری سوم (HenryIII) کے سر پر رکھا گیا، ہنری کے عہد تک کلیسا کی ساکھ بحال ہوچکی تھی، اور بڑی حد تک وہ خودمختار اور شاہی احکام سے آزاد ادارہ بن چکا تھا لیکن قدیم روم سے جاری ضابطہ کے تحت پوپ کے انتخاب کی توثیق کا حق ابھی بھی شہنشاہ کو ہی حاصل تھا، جس کے تحت ہنری نے یکے بعد دیگرے کئی پوپ منتخب بھی کروائے، اس کی بنیادی کوشش یہی تھی کہ پوپ کی تقرری وبرطرفی کا اختیار شہنشاہ کو ہی حاصل رہے تاکہ کوئی پوپ اس کے خلاف جانے کی جرأت نہ کرسکے، جبکہ کلیسا اس بات کا کوشاں تھا کہ منصب پاپائیت پر تقرر کرنے یا نا کرنے کا حق شہنشاہ کے بجائے کلیسا کو حاصل ہو بلکہ خود شہنشاہ کا تقرر اور اس کی برطرفی پوپ کے حکم سے ہونی چاہیے، اس اختیار کے حصول کو لے کر شہنشاہ اور کلیسا کے درمیان زبردست نزاع قائم رہا حتی کہ نوبت خونیں جھڑپوں تک بھی جا پہنچی، کلیسا وشہنشاہ کے یہ جھگڑے "نزاع حق تقرر" (Investiture Controversy) کے نام سے مشہور ہیں۔ (۲)

---

(1) A History of Europe by Henri Pirenne, P.165

(۱) تاریخ فلسفۂ سیاسیات/۹۹

1056ء سے ہنری چہارم (HenryIV) کی شہنشائیت کا آغاز ہوتا ہے، ہنری کا دور حکومت تاریخ یورپ میں اس اعتبار سے بھی موضوع گفتگو رہا ہے کہ اس میں شہنشائیت اور کلیسائیت کی کشمش اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، اور عموی اقتدار ہونے کے باوجود ہنری کو پوپ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے تھے۔

ہنری چہارم کے عہد میں گریگوری ہفتم (Gregory VII) پاپائیت کے منصب پر فائز تھا، وہ حکومت پر کلیسا کی حاکمیت کا موید تھا، اس کا کہنا تھا کہ حقیقی سلامتی ایمان کی طاقت کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے جو صرف مذہب سے وابستہ ہے، نیز حکومت کا تعلق جسم سے ہے جبکہ مذہب کا تعلق روح سے ہے اس اعتبار سے کلیسا کو حکومت پر وہی فوقیت و برتری حاصل ہے جو جسم پر روح کو حاصل ہے، پس اس نے شہنشاہ کی جانب سے پوپ کی نامزدگی کو کالعدم قرار دیا۔

انگریز مؤرخ کولن ولسن (Colin Wilson) کہتا ہے:

"A century later, a pope named Hildebrand- Gregory VII - came to the throne with the conviction that the pope should be the temporal as well as the spiritual head of Christendom, and that he ought to choose emperors rather than vice versa. He could, said Gregory, interfere as he liked with the laws of any Catholic country, and his papal decrees should automatically overrule any decree of king or emperor. He sent messengers to all the European courts informing the kings and emperors of these new rules."(1)

(سو سال بعد ہلڈر برانڈ یعنی گریگوری ہفتم نامی ایک پوپ تخت نشین ہوا، اس کا کہنا تھا کہ پوپ کو نہ صرف عیسائیوں کا روحانی بلکہ دنیاوی رہنما بھی ہونا چاہیے اور اسے شہنشاہ کے تقرر کا اختیار ہونا چاہیے بجائے اس کے کہ شہنشاہ کسی پوپ کو مقرر کرے، وہ کسی بھی کیتھولک ملک کے قوانین میں مداخلت کر سکے، اور اس کا حکم ہر بادشاہ یا شہنشاہ کا حکم منسوخ کر سکے، اس نے تمام یورپی درباروں میں قاصد بھیج کر انھیں اس نئے قانون سے آگاہ کیا)

اس نئے قانون کی آگاہی پر شہنشاہ جرمنی ہنری چہارم (Henry IV) سخت برہم ہوا، وہ کھل کر پوپ کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خود اس کے امراء اس کے خلاف کھڑے ہو جاتے، اس لیے صرف یہی چارۂ کار رہ گیا کہ وہ کلیسائی انتظامیہ میں اپنے ہمنواؤں اور پوپ مخالفین سے کام لے چنانچہ اس نے ایسے بشپوں کو جمع کیا اور انھیں یہ اعلان کرنے پر آمادہ کیا کہ پوپ گریگوری منصب پاپائیت کا اہل نہیں ہے:

---

(1) A Criminal History of Mankind, P.175

"He assembled them at Worms, and on January 24th,1076, he induced them to declare that Gregory was unworthy of the Papacy." (1)

(۲۴/جنوری ۱۰۷۶ء کو اس نے انھیں وارم میں جمع کیا، اور انھیں گریگوری کو نااہل قرار دینے پر آمادہ کیا)

شہنشاہ نے گریگوری کو برطرفی کا حکم نامہ بھیج دیا، جس پر گریگوری تلملا اٹھا، اور انتقامی کارروائی کرتے ہوئے اپنے وقت کا سب سے مؤثر حربہ کا استعمال کیا اور کلیسا کی جانب سے شہنشاہ کے "مکمل بائیکاٹ" (Excommunication) کا اعلان کر دیا:

"The Pope Excommunicated Henry."(2)

گریگوری کے اس اعلان نے پورے ملک میں اضطراب و بے چینی پیدا کر دی، افواہیں پھیلنے لگیں اور عمومی بغاوت کے حالات پیدا ہونے لگے، اس نے یہ فرمان بھی جاری کر دیا کہ چونکہ اب ہنری مذہب سے خارج ہے، وہ مسیحی نہیں ہے اس لیے وہ تمام افراد اور قوتیں جو ہنری کی وفاداری کی پابند تھیں، اب اپنے حلف اور ہنری کی اتباع سے آزاد ہیں، اس نے حکومت سے کلیسائی کارکن بھی واپس لے لیے:

"No ecclesiastic should be invested with the symbols of office by a secular ruler under penalty of excommunication."(3)

(کسی بھی کلیسائی کو کوئی بھی سرکاری عہدہ ایسے حکمراں کی طرف سے نہیں دیا جا سکتا جو لامذہبی ہو اور کلیسا کی جانب سے ملعون ہو)

کلیسا کا کسی کے مکمل بائیکاٹ کا حکم دینا اس دور کی سب سے بدترین سزا کے مرادف تھا، اس اعلان کے بعد کسی کے لیے ایسے شہنشاہ کی ماتحتی میں رہنا گویا شیطان کے زیر حکومت زندگی گذارنا تھا، چنانچہ امراء نے ہنری کا تختہ پلٹنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی، ہنری حالات کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور اب اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پوپ سے معافی مانگ کر اپنے اقتدار کو بحال رکھے، پس وہ معافی کا طلبگار ہو کر ننگے پاؤں ایک زائر کی صورت میں پوپ گریگوری کے قلعہ تک پہنچا، سخت سردی کے ایام تھے، پھر بھی پوپ نے اسے تین دن تک برف میں انتظار کروایا اس کے بعد اسے اندر آنے کی اجازت ملی اور پوپ کے دربار سے معافی نصیب ہوئی۔ (۴)

بعض سیاسی وجوہات اور موقع پرستی کے پیش نظر امرائے سلطنت نے ہنری سے بغاوت کر دی اور ایک شخص "روڈولف" (Rodolph) کو تخت شاہی کے لیے پیش کر دیا، ہنری نے محسوس کیا کہ اس قدر بے عزتی اور جبہ سائی

---

(1) History of European Political Philosphy, P.185
(2) The New Catholic Dictionary P.438
(3) istory of European Political Philosphy, P.102
(4) A History of Europe by Henri Pirenne, P.185

کے باجود اقتدار ہاتھ سے جارہا ہے تو اس نے پوپ گریگوری کے خلاف دوبارہ کارروائی کا فیصلہ کرلیا اور چرچ کونسل (Synod) کے ذریعہ پوپ کو بے دخل کر کے ''راوینا'' (Ravenna) کے آرچ بشپ کو منتخب کرادیا، جواب میں گریگوری نے دوسرے سخت فتویٰ کے ذریعہ ہنری کو ایک بار پھر مذہب سے خارج کردیا۔

ہنری نے اپنے حریف روڈولف کو شکست دی اور گریگوری کے خلاف روم پر چڑھائی کردی، پوپ حفاظت کے پیش نظر ایک قلعہ میں محصور ہوگیا جو ہنری کے لیے ناقابل شکست ثابت ہوا، اس دوران ہنری کے خلاف بغاوت شروع ہوگئی، نیز سسلی کی رومن افواج نے بھی روم کی جانب پیش قدمی شروع کردی، مجبوراً ہنری کو ہتھیار ڈالنے پڑے، اس دوران حالات کی سنگینی اور عدم استحکام کو دیکھتے ہوئے گریگوری نے روم کی سلطنت ترک کر کے سسلی میں پناہ گزینی اختیار کرلی۔

اب مسیحی دنیا میں دو پوپ تھے، ایک خانہ بدوش گریگوری اور دوسرا جسے شہنشاہ نے منتخب کروایا تھا، شاہی پوپ روم میں متمکن تھا جبکہ کلیسا کا آئینی پوپ خانہ بدوش تھا، گریگوری کے بعد پوپ اربن دوم (Urban II) خانہ بدوش پوپ بنا جس کی آواز پر پورا یورپ صلیبی جنگوں کے لیے ایشیا پر چڑھ دوڑا تھا، ہنری کے بعد بھی نام نہاد پوپ منتخب ہوتے رہے، لیکن صلیبی جنگوں میں ابتدائی کامیابی نے ایک بار پھر پوپ کی عظمت کو بحال کردیا اور پوری مسیحی دنیا میں اسی کا سکہ رائج ہوا، اور یہ طے ہوا کہ کلیسائی عہدوں کی تقرری میں حکومت کا کوئی کردار نہیں رہے گا:

'The emperor cannot interfere in Papal election'(1)

(شہنشاہ پاپائیت کے انتخاب میں مداخلت نہیں کرسکتا)

اس فیصلے کے بعد جرمنی و فرانس کے دس سے زائد بادشاہوں اور سیاسی لیڈروں پر پوپ کی جانب سے کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا، کچھ کی توبہ قبول ہوئی اور کچھ کو معزول ہونا پڑا، الغرض جب تک کلیسائیت کا شہنشاہیت سے مقابلہ رہا تب تک بہرصورت کلیسا کا ہی پلڑا بھاری رہا، حتی کہ پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) کا عہد پاپائیت شروع ہوا اور اس نے 1300ء میں فخریہ اعلان کیا:

''میں قیصر (Caesar) بھی ہوں، میں پوپ بھی (Pope) ہوں''۔ (۲)

اور اس اعلان کے ساتھ ہی دنیوی اقتدار کا دعویٰ جو گیارہویں صدی سے کیا جارہا تھا اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

آٹھویں صدی سے بارہویں صدی کے اختتام تک پوپ نے ہر شہنشاہ کو تاج پہنایا اور اسی نے شہنشائیت کو پارہ پارہ بھی کیا، تاہم پوپ کی ''شہنشایت کلیسا'' بلاشرکت غیرے قائم رہی، تیرہویں صدی میں پوپ مغرب کا

---

(1) History of European Political Philosphy, P.120

(۲) تاریخ فلسفۂ سیاسیات از محمد مجیب صفحہ:۱۰۶

مقتدر ترین شخص بن گیا، اور سارے بشپ پوپ کے وفادار ہو گئے، کوئی نیا مذہبی مسئلہ پوپ کی مرضی کے بغیر حل نہیں ہو سکتا تھا، تمام فیصلے پوپ کی عدالت کرتی، اس کے نمائندے پورے ملک میں نگرانی کرتے، اور پوپ کے احکام کو بعینہ نافذ کرتے۔

ارباب کلیسا نے اپنے اقتدار اور عوام میں مقبولیت کا ہر ناجیہ سے غلط فائدہ اٹھایا اور دنیا و جاہ طلبی اور زر و زن پرستی میں انھوں نے وہ ساری حدیں پار کر دیں جن پر تاریخ انسانیت بھی شرم سار ہے، اور ایک حقیقت و انصاف پسند مؤرخ ان کے اس پورے دورانیہ کو "تاریک دور" (Dark Ages) کہنے پر مجبور ہے!!

CamScanner

کلیسا کی اخلاقی صورتحال

ارباب کلیسا حقیقت میں پوری مسیحی قوم کے مذہبی پیشوا تھے، ان کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مخلص حواریوں کی جانب تھی، لیکن جب کلیسا کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ارباب کلیسا کو دربار شاہی میں رسوخ واعتبار نصیب ہوا تو دنیا کی لالچ میں وہ اوندھے منھ جا گرے، اور جاہ ومال کی لالچ میں انھوں نے ایسے ایسے ہتھکنڈے اختیار کیے جو حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کی تعلیمات سے کسی طرح میل نہیں کھاتے تھے، ہر طرح کی اخلاقی ومعاملگی برائی میں وہ اس حد تک ملوث ہوئے کہ کسی بھی سطح پر اور کسی بھی زوایہ سے وہ دینی ومذہبی رہنما کہلانے کے حقدار نہیں بچے۔

ان مذہبی پیشواؤں کی بداخلاقیاں و بدقماشیاں اگر محدود اور انفرادی پیمانہ پر ہوتیں تو انھیں نظرانداز کیا جاسکتا تھا لیکن جب یہ خرابیاں ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہوں تو لازمی طور پر اسے عقیدہ اور مذہب کی بنیادی خرابی ہی قرار دیا جائے گا۔ اسی لیے ناقدین یہ کہنے پر مجبور اور حق بجانب ہیں کہ جو مسیحیت آج دنیا کے وسیع خطہ میں رائج ہے اس کا حضرت عیسیٰ کی عیسائیت سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہ شرک وبت پرستی کی وہ مہذب اور ترقی یافتہ شکل ہے جسے تلوار کے زور پر اور اقتدار کے نشہ میں عوام پر مسلط کیا گیا ہے۔

ذیل میں انہیں مسیحی مذہب کے پیشواؤں کی مذہبی خرابی واخلاقی بے راہ روی کو انھیں کے "گھر کی شہادتوں" کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے تاکہ مذہبی تاریخ کے اس سیاہ باب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور انصاف کے ترازو میں جانچا جاسکے۔

پاپائیت کا آغاز

رسولی دور کے بعد صورتحال ایسی نہ تھی کہ پوری مسیحیت کا کوئی ایک مسلمہ مرکزی نگراں ہو، البتہ بعض نمایاں مراکز وکلیسا کے بڑے پادری اپنے اپنے علاقہ میں اثر ورسوخ کے مالک تھے، لیکن قسطنطین کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد سربراہی کا شاہی نظریہ (Imperial Theory) وجود میں آیا، اور عملی طور پر روم کے شہنشاہ کو مرکزی مسیحی رہنما (Head of The Church) تسلیم کرلیا گیا، جس کے تحت روم، قسطنطنیہ، اسکندریہ، انطاکیہ، اور

یروشلم کے کلیسا اور ان کے بڑے پادری کم وبیش یکساں اہمیت کے حامل بزرگ (Patriarchs) سمجھے جاتے تھے، رفتہ رفتہ ان میں رومی کلیسا اور اس کے سربراہ کو زیادہ اہمیت اور زیادہ رسوخ حاصل ہونا شروع ہوا، اس کی سیاسی وجوہات میں شہنشاہ کا روم سے دارالخلافہ کا منتقل کرنا تھا کیونکہ روم کو سیاسی اور مذہبی دونوں طرح کی مرکزیت حاصل تھی اور اس منتقلی کے بعد کلیسائے روم کی مذہبی طاقت مزید مستحکم ہوگئی، اس کے علاوہ اس کلیسا کی نسبت حواری پطرس اور رسول پولس کی جانب ہونے کی وجہ سے اسے عظمت وبڑائی حاصل تھی۔

کلیسائے قسطنطنیہ کو دیگر کلیساؤں پر قدرے فوقیت حاصل تھی کیونکہ قسطنطنیہ رومن امپائر کا نیا دارالحکومت تھا، اس بنیاد پر ابتداء میں کلیسائے روم وکلیسائے قسطنطنیہ کو مساوی درجہ حاصل تھا، اور خلقیدون کی کونسل (451ء) میں اسی پر اتفاق بھی ہوا تھا، لیکن جب اس کونسل کی کارروائی پوری ہوئی اور کونسل کی رپورٹ تیار کرائی گئی تو کلیسائے روم کے پوپ لیواول (Pop Leo I) کے اشارہ پر اس میں جعل سازی اور تحریف سے کام لیا گیا، اور مختلف کلیساؤں کو کارروائی کی جو نقل بھیجی گئی اس میں یہ صراحت کردی گئی کہ قسطنطنیہ کے پادریوں نے کلیسائے روم کے پادری کو "عالمی کلیسا کا سربراہ" (Head of the Universal Church) منتخب کرلیا ہے۔ (۱)

کلیسائے اسکندریہ، انطاکیہ اور قسطنطنیہ کا سربراہ اسقف اعظم (Patriarch) کہلاتا تھا، ان کا تقرر شہنشاہ روم کرتا تھا، جبکہ کلیسائے روم کو افضلیت حاصل ہونے کی بنا پر اس کے سربراہ کو "پاپا یا پوپ" (بمعنی اب=باپ) کہا جاتا تھا، پوپ کا تقرر انتخاب کے ذریعہ خود کلیسائے روم ہی کرتا تھا، اور تقرری کو شہنشاہ رسمی منظوری دیتا تھا، اب تک پوپ کو دیگر اساقفہ پر کوئی برتری حاصل نہیں تھی، لیکن خلقیدون کی کونسل کے بعد جو فریب کاری ہوئی اور پوپ لیو کی جانب سے جو پروپیگنڈہ کیا گیا اس سے پاپائے روم کا رتبہ سب پر حاوی ہوگیا، اور کلیسائے روم کا پوپ پوری عالم مسیحیت کا روحانی پیشوا تسلیم کرلیا گیا۔

جعل سازی

کلیسائے روم مرکزیت وافضلیت میں مذکورہ وجوہات کے علاوہ سب سے مؤثر اور کارگر حربہ کلیسائے روم کے پادریوں کی جعل سازیاں بھی تھیں، قسطنطین کی موت کے بعد رومی کلیسا کے کارپردازوں نے شہنشاہ سے متعلق ایک جعلی دستاویز تیار کرکے پیش کی جسے "عطائے قسطنطین" (Donation of Constantine) کہا جاتا ہے، اس دستاویز میں یہ وضاحت تھی کہ شہنشاہ نے مبینہ طور پر کلیسائے روم کو اپنی تمام تر یورپ کی مقبوضات کا دینی ودنیوی سربراہ اعلیٰ مقرر کیا ہے۔ (۲)

---

(1) The Popes and Their Church, P.20

(2) The Decline and fall of roman Empire, V.6 P.161-162. & The Popes and Their Church, P.28 By Joseph McCabe

CamScanner

ایک مدت کے بعد ایک اور جعلی دستاویز سامنے آئی جو "اسیڈور کے جعلی فتاویٰ" (False Decretals of Isidore) کہلاتی ہے، قدیس ایسی ڈور (St. Isidore) سے منسوب اس مجموعہ میں جعلی فتاویٰ، خطوط و فرامین کے علاوہ اس بات کی صراحت موجود تھی کہ رومی پادریوں کو دنیاوی حکمرانوں اور ان کی عدالتوں سے ہر قسم کے مؤاخذہ سے بالاتر قرار دیا گیا ہے، اور بالخصوص انھیں اعلیٰ اختیارات سے نوازا گیا ہے۔ ان اختیارات کی بدولت پاپائے روم کو دیگر کلیساؤں پر تفوق و امتیاز حاصل رہا جس کا دورانیہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ (1)

ان جعلی دستاویزات کو صدیوں تک اصلی تصور کیا گیا، اور ان کی وجہ سے رومی کلیسا کے وقار و اقتدار میں بے پناہ اضافہ ہوا، مدت دراز کے بعد جب کلیسا کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں تو محققین نے انھیں جعلی قرار دینے کی جرأت کی، اور اس ضمن میں ٹھوس دلائل دیے مثلاً یہ کہ ان دستاویز میں مستعمل لاطینی الفاظ آٹھویں اور نویں صدی کے مروج الفاظ ہیں جبکہ دستاویز دوسرے سے چوتھی صدی کے درمیان کے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال پاپائے روم کے روحانی اقتدار کی بنیاد دھوکہ و جعل سازی پر پڑی، اور بعد کی صدیوں میں مسلسل دھوکہ و فریب کے ذریعہ ہی اس اقتدار کو بحال رکھا گیا، اور اس کے ذریعہ دنیا بھر کا تعیش حاصل کیا گیا۔

اعلان رفعت

کلیسا میں پوپ کا ابتدائی تصور ایک مذہبی رہنما کا تھا لیکن جب کلیسا نے مذہبی رنگ چھوڑ کر سیاسی رنگ اختیار کر لیا تو پوپ کا مقام و مرتبہ بھی حد سے اونچا ہو گیا، اور رفتہ رفتہ یہ بلندی اس اونچائی تک پہنچی کہ پوپ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں سے افضل ترین رتبہ کا حقدار قرار دیا جانے لگا۔ پوپ انوسینٹ سوم (Innocent III) پاپائیت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد افتتاحی تقریر میں کہتا ہے:

"The succesor of Saint Peter stands midway between God and man, below God, above man, judge of all, judged of none."(2)

(مقدس پطرس کے جانشین (پوپ) کا مقام خدا اور انسان کے درمیان ہے، یعنی خدا سے نیچے اور آدمی سے اوپر، وہ سب کا حاکم ہے مگر اس کا کوئی حاکم نہیں)

دھوکہ بازی

پاپائیت جس نے روحانیت کا لباس اتار کر مادیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اس کی ابتداء فریب کاری اور دھوکہ دہی سے ہوئی تھی، اس کے بعد مسلسل جعلسازیوں اور فریب کاریوں کے بعد وہ اپنے آپ میں ایک عظیم الشان منصب

---

(1) The Popes and Their Church, P.30 By Joseph McCabe. For More Details: History of European Morals V.I

(2) Concise Oxford Dictionary of the Church, PP.223,261

بن چکا تھا، جس کے حصول کی لالچ میں سطحی حربے اور گھٹیا ہتھکنڈے اپنائے جانے لگے، اور انسانی اقدار اور مسیحی تعلیمات کو بالکل فراموش کیا جانے لگا۔

کلیسائے روم کا دعویٰ تھا اور ہے کہ پوپ کے انتخاب میں "روح القدس کا نور" (Light of the Holy Ghost) کارڈینلوں کی رہنمائی کرتا ہے،(1) مگر تاریخ میں متعدد دفعہ ایسا ہوا ہے کہ کارڈینلوں نے اس نور پر سونے کی چمک کو ترجیح دی، اور نقد روپیہ یا نئے پوپ سے منفعت بخش عہدوں کی لالچ میں پوپ کا انتخاب کیا۔

پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) نے پاپائیت کا منصب حاصل کرنے کے لیے بدترین دھوکہ دہی سے کام لیا، اس کا پیش رو ایک سادہ لوح پوپ سلسطائن پنجم (Celestine V) تھا، بونی فیس اس وقت کارڈینل تھا، اس نے سلسطائن کے کمرہ میں ایک خفیہ ٹیوب نصب کرائی جس کے ذریعہ بغل والے کمرہ سے اس کو مسلسل ایک "آسمانی آواز" سنائی جاتی، جو سلسطائن کو پاپائیت سے دستبرداری کی مسلسل ترغیب کرتی، بالآخر اس نے اس آواز کو "ندائے غیبی" سمجھ کر پاپائیت کا عہدہ چھوڑ دیا اور اس طرح بونی فیس پوپ بن گیا۔(2)

رشوت ستانی

دھوکہ اور فریب کے علاوہ رشوت کے ذریعہ سے بھی پاپائیت کے منصب کو خریدا گیا، پوپ جان نوزدہم (John XIX) جو کہ ایک عام پادری بھی نہیں تھا، وہ اپنے بھائی بنی ڈکٹ ہشتم (Benedict VIII) کی موت کے بعد صرف رشوت کے ذریعہ پوپ بنا، اور نو سال تک اس منصب سے فیض یاب ہوتا رہا، اس کے بعد بنی ڈکٹ نہم (Benedict IX) کے لیے بھی رشوت ہی کے بل پر پاپائیت خریدی گئی:

> *"At his death his brother purchased the votes of the electors, and succeeded him. John XIX soberly enjoyed his purchase for nine years. Then a member of the family, by the customary bribery, bought the tiara for his own son, a boy of eleven, and the Papal record is stained with the fifteen years' pontificate of Benedict IX."(3)*

اسی طرح انوسینٹ ہشتم (Innocent VIII) کی موت کے بعد پاپائیت کے منصب کے لیے اسپینی کارڈینل بورجیا (Borgia) کی کامیابی کے امکانات حد سے زیادہ کم تھے، کیونکہ وہ غیر اطالوی تھا اور اکثر کارڈینل (Cardinals) اطالوی ہونے کی وجہ سے کسی غیر کو منتخب کرنے کے حق میں نہیں تھے، اس کے ساتھ ہی بورجیا کا کردار بھی اس قدر بدنام تھا کہ کلیسا میں کسی عام عہدہ کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا مگر اس نے ہزاروں طلائی سکے

---

(1) The Popes and Their Church, P.26
(2) The Popes and Their Church, P.53
(3) The Popes and Their Church, P.38

(Gold Ducts) اور جاگیروں کے وعدے دے کر اکثر کارڈینلوں کے ووٹ حاصل کر لیے، اور کلیسا کی تاریخ میں الیگزنڈر ششم (Alexander VI) کے نام سے پوپ بن گیا۔

الیگزنڈر ششم کی یہ جعل سازی بدنامی کی حد تک مشہور ہو چکی تھی حتی کہ کلیسا کے دیگر عہدوں میں بھی یہ ایک نظیر بن چکا تھا، اور معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ بعد میں جب پیرس دی گریسس (Paris de Grassis) پوپ بنا تو اس نے اپنے عہد پاپائیت میں اس طریقہ کی روک تھام اور اس پر قدغن لگانے کے لیے ایک سرکاری فرمان جاری کیا اور اس میں خاص کر الیگزنڈر ششم کا ہی حوالہ دیا:

"Amongst them one that specially deserves mention is his severe Bull against simony in Papal elections, designed to prevent the repetition of the disgraceful practices which were resorted to at the election of Alexander VI. This document is dated the 14th January, 1505."(1)

عیش پسندی

عالم مسیحیت کے مذہبی علماء اور دینی پیشوا کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے جانشین ہیں حالانکہ وہی پیشوا کلیسائی عہدوں کی خرید وفروخت ضمیر کی خلش اور روح کی ملامت کے بغیر کرتے تھے، ایسے میں ان سے روحانیت اور اخلاقیت کے کس معیار کی توقع کی جاسکتی تھی؟ ان کا مقصود نظر تو صرف دنیا طلبی اور عیش پرستی تھا، ان کی زندگیوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا پرستی اور عیش پسندی میں قدیم رومی بادشاہوں اور شہزادوں سے کچھ کم نہ تھے، دنیا کے ہر تعیش میں وہ گلے گلے ڈوبے ہوئے تھے، حتی کہ ان میں ایک بڑی تعداد پرلے درجے کے جواریوں کی بھی تھی، اور سیکڑوں نہیں ہزاروں طلائی سکے ایک ایک رات میں ہار جایا کرتے تھے، اور ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں پڑتی تھی۔

انوسینٹ ششم کے کارڈینلوں کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ کلیسا کا مستند مؤرخ پاسٹر (Dr. Ludwig Pastor) لکھتا ہے:

"The Cardinals lived lives of luxury, ill-befitting the princes of the Church."(2)

(کارڈینل عیش وعشرت کی ایسی زندگی بسر کرتے تھے جو کلیسائی امراء کے اصولوں کے مطابق نہ تھی)

سولہویں صدی کا پوپ لیو دہم (Lio X) روحانیت سے کوسوں دور اور انتہائی دنیادار انسان تھا، وہ ہر قیمت پر

---

(1) History of The Popes By Dr.Ludwig Pastor V.6, P.440

(2) The History Of The Popes, V.4, P.139

خوش وخرم اور مست ومگن رہنا پسند کرتا تھا، اس لیے ہر طرح کے کھیل تماشہ سے جی بہلاتا تھا، چنانچہ اس کی تفریح طبع کی خاطر ویٹی کن (Vatican) میں اکثر موسیقی کی محفلیں (Concerts) اور مزاحیہ ڈرامے (Comedies) منعقد ہوتے رہتے تھے۔ (۱)

پندرہویں صدی میں اعلیٰ وشاندار دعوتوں، گھٹیا قسم کے ڈراموں، جوئے کی محفلوں اور جانوروں کی لڑائیوں کا انتہائی شوقین ایک اور پوپ جولیس سوم (Julius) تھا، وہ بڑے دھوم سے اپنے برسر اقتدار آنے کی سالگرہ مناتا تھا، شہر میں جلوس نکلتا جس میں ہر طرح کی تفریح کا سامان ہوتا حتی کہ رومیوں کے قدیم دیوتاؤں کی مورتیاں بھی سجائی جاتیں۔ (۲)

یہی حال کارڈینلوں کا بھی تھا، ڈاکٹر پاسٹر پندرہویں صدی کے کارڈینلوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ کارڈینل شاندار محلوں میں رہتے، شکار اور جوا کھیلتے، اور ان سارے مشاغل میں مصروف رہتے جو عام دنیوی حکمرانوں کے سے ہوتے تھے، ان کے مال وزر کی بہتات کا کچھ اندازہ نہ تھا، ان میں سے بعض تو ایسی پر تکلف دعوتوں کا اہتمام کرتے کہ ان کو دیکھنے والا ایک تذکرہ نگار ایسی دعوت کی تفصیل بیان کرنے سے اس لیے انکار کر دیتا ہے:

"Lest he should be mocked as teller of fairy tales."(3)

(مبادا اسے پریوں کی کہانی سنانے والا قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا جائے)

ہر کارڈینل کے سیکڑوں اور بعض اوقات ہزاروں نوکر تھے، وہ دعوتوں یا اہم موقعوں پر خالص ریشم کا لباس پہنتے، غرضیکہ ان کارڈینلوں کی زندگیاں ان کے روحانی منصب سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتی تھیں۔

پوپ سکسٹس (Sixtus) نے اپنے نالائق بھتیجے کو کارڈینل بنایا، وہ ایک نمبر کا عیاش تھا، ہمیشہ زریں لباس پہنتا، اس کی چہیتی محبوبہ کی جوتی پر قیمتی ہیرے ٹنکے ہوتے، اس کی آئے دن کی پارٹیوں اور عیش مستیوں پر بے تحاشا خرچ ہوتا تھا، سکسٹس نے اس کے لیے سالانہ ایک لاکھ پونڈ کی آمدنی کا بندوبست کر دیا تھا، لیکن دو سال بعد کثرت عیش پرستی میں جب وہ مرا تو اس کے ذمہ پانچ لاکھ پونڈ کا قرض تھا۔ (۴)

دنیا طلبی

مسیحیت کے ٹھیکیداروں کے لیے عیش پرست زندگی کا حصول آسان نہ تھا، زندگی کے اس معیار کو قائم رکھنے کے لیے انھوں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور سب سے بڑھ کر کلیسائی عہدوں کی خرید وفروخت شروع

---

(1) The History Of The Popes, V.6, PP.194,195

(2) The History Of The Popes, V.13, PP.62-65

(3) The History Of The Popes, V.5, PP.362-370

(4) Economic and Social History of the Middle Ages, by J.W. Thompson, PP.69-70

CamScanner

کی، کارڈینل اسی کا پوپ منتخب کرتے تھے جو بھاری رقمیں اور جائدادیں دیتا تھا، اور پوپ اپنے معاون کارڈینلوں میں انہیں پادریوں کو شامل کرتا جو اسے بھاری رشوتیں دیتے، ان کی یہ حرص ولالچ اس قدر بڑھ چکی تھی کہ کوئی پوپ اس پر قدغن لگانا چاہتا بھی تو ناممکن تھا کیونکہ وہ پوری طرح اس کے عادی بن چکے تھے:

"The Power and greed of the Cardinals and the Curia developed with great rapidity under the rule of Sixtus, and the new Pope was helpless, even if he had wished, to put any barrier to their damands."(1)

(کارڈینلوں اور پوپ کے درباریوں کی طاقت اور لالچ سکسٹس کے زمانہ میں بڑی تیزی سے بڑھی، اور نیا پوپ (یعنی انوسینٹ ہشتم) اس قدر لاچار تھا کہ اگر وہ چاہتا بھی تو ان کے مطالبات پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا تھا)

سوال یہ ہے کہ کوئی نیا پوپ قدغن لگانے کی سوچتا بھی کیوں؟ جبکہ اسے خود زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی فکر لاحق تھی، یہی وجہ ہے کہ انوسینٹ ہشتم نے قدغن لگانے کے بجائے کارڈینلوں کو کھلی چھوٹ دے دی، اور خود اس نے بھی جائز وناجائز طریقے سے بے تحاشا دولت اکٹھا کی، اپنے مقصد کی باریابی کے لیے اس نے متعدد نئے عہدے بھی قائم کیے، اور اپنے معاون کی حیثیت سے ایک دو نہیں بلکہ پورے چھبیس سکریٹری منتخب کیے، اور ان عہدوں کے لیے ہر ایک سے ہزاروں ہزار پونڈ وصول کیے۔ (۲)

بنی ڈکٹ نہم (Benidect IX) بھی عیش پسندی اور دولت کی حرص میں مشہور تھا، عہدوں کی خرید وفرخت میں اس نے اس طور پر امتیاز حاصل کیا کہ اس نے پاپائیت کے منصب کو ہی فرخت کر دیا، اس کی ایک محبوبہ تھی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن پاپائیت کے منصب پر ہوتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا، چنانچہ پہلے اس نے اپنے منصب کے دام کھرے کر لیے اور پھر اپنے ہی خاندان کے ایک فرد کے ہاتھ اسے فروخت کر دیا، فیصلہ خداوندی کہ اس کی یہ شادی کامیاب نہ ہوئی اور کچھ وقفہ بعد وہ اپنی بیوی سے علیحدہ ہو کر کلیسا واپس آ گیا۔ (۳)

پوپ الیگزینڈر ششم (AlexanderVI) نے برسر اقتدار آنے سے قبل اپنے انتخابی ادارہ سے پختہ وعدہ کیا کہ وہ عہدے فروخت نہیں کرے گا، مگر برسر اقتدار آتے ہی اس نے ہزاروں پونڈ کے عوض نئے کارڈینل بنائے، یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے دو کارڈینلوں کو زہر دے کر مروا دیا تھا تا کہ ان کی دولت پر قبضہ کر سکے۔ (۴)

پوپ بونی فیس نہم (Boniface IX) نے کارڈینل کوسا (Cossa)- جو بعد میں خود پوپ بھی بنا- کے

---

(1) The History Of The Popes, V.4, P.168
(2) The History Of The Popes, V.4, P.169
(3) The Historian's history of the world, V.8, P.590
(4) The Story of Civilisation, V.6 PP.9-10

مشورہ سے نہ صرف عہدے فروخت کیے بلکہ ان کی توقعات (Expectations) اور ترجیحات (Preferences) بھی فروخت کیں۔

یہ کوسا (Cossa) کی اپنی اصطلاحات تھیں؛ توقعات سے مراد مستقبل کے عہدے تھے: جب کوئی اعلیٰ کلیسائی عہدیدار بیمار ہوتا تو متوقع امیدواروں میں اس عہدے کو بڑی بڑی بولیوں میں نیلام کیا جاتا، لیکن اگر بعد میں کسی عہدہ کے لیے کوئی دوسرا شخص زیادہ رقم دے دیتا تو پہلے کو بتائے بغیر اس کی بولی منسوخ ہو جاتی اور اس کی رقم بھی ضبط ہو جاتی، اسی کو "ترجیح" کہا جاتا، اور اس کا پتہ اس وقت چلتا جب متعلقہ بیمار عہدیدار مر کر اپنا عہدہ خالی کر جاتا، اور وہ عہدہ پہلی بولی دینے والے کے بجائے بعد میں زیادہ رقم دینے والے کو مل جاتا۔

توقعات و ترجیحات کی فروخت کے علاوہ کوسا نے کسبیوں، جواریوں اور سود خوروں کی اصلاح کے بجائے ان پر ٹیکس عائد کیے تا کہ اس طریقہ پر زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھا کی جا سکے۔ (1)

کریٹن (Creighton) تاریخ پاپائیت کا ہمدرد و مستند مؤرخ مانا جاتا ہے، وہ پاپاؤں اور کارڈینلوں کی ہوس زر، دنیا طلبی اور عیش پرستیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بونی فیس نہم کے بارے میں لکھتا ہے:

"His ends were purely temporal, and he had no care for the higher intrests of the Church."(2)

(اس کے مقاصد سراسر دنیوی تھے، اور اسے کلیسا کے اعلیٰ مفادات کی کوئی پروا نہ تھی)

پوپ بنی فیس (Boniface) کی ہوس زر و دولت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ جب اس کی موت کا وقت قریب ہوا اور اس کے آخری وقت (Last Hour) میں پوچھا گیا کہ وہ کیسا ہے؟ تو اس نے جواب دیا:

"If I had more money, I should be well enough."(3)

(اگر مجھے مزید دولت مل جائے تو میں (اب بھی) ٹھیک ٹھاک ہو سکتا ہوں)

بہت سے پوپ اپنی اور اپنے کارڈینلوں و دیگر عہدیداروں کی عیش و عشرت کے لیے عوام پر بے پناہ ٹیکس عائد کرتے تھے، یہی کریٹن ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"Europe groaned under the exaction of Papal tax-gatherers."(4)

(پاپاؤں کے ٹیکس جمع کرنے والوں کی جبری وصولیوں کے (بوجھ) تلے سارا یورپ کراہ رہا تھا)

اسی صورتحال سے تنگ آ کر اسپین کا ایک پادری چلا اٹھا:

---

(1) The Popes and Their Church, PP.63,64,74,77

(2) History of the Papacy by M.Creighton, V.1, P.182-183

(3) History of the Papacy by M.Creighton, V.1, P.182-183

(4) History of the Papacy by M.Creighton, V.1, P.26

"Wolves are in control of the Church and feed on the blood of the Christian flock."(1)

(کلیسا پر بھیڑیوں کا قبضہ ہے، اور ان کی خوراک مسیحی بھیڑوں کا خون ہے)

کلیسائی عہدیداروں کے پاس "مسیحی بھیڑوں" کا خون چوس کر دولت اکٹھا کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سے طریقے تھے، پوپ گریگوری اعظم نے دولت اکٹھا کرنے کا عجیب وانوکھا طریقہ ایجاد کیا، وہ امراء سے کہتا کہ دنیا کا انجام بہت ہی قریب ہے، اور تمہاری جائداد تمہاری آئندہ نسل تک پہنچنا بالکل محال ہے، لہٰذا تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم اپنی جائداد کلیسا (مراد خود کی ذات) کے ہاتھ سستے داموں میں بیچ دو۔ اس طریقہ سے وہ یورپ کا امیر ترین فرد اور غلاموں کا سب سے بڑا مالک بن گیا۔

اسی حقیقت کو مؤرخ اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

"Gregory the Great, who believed that the end of the world was at hand, had induced large numbers of nobles to leave their estates to the Church, since their sons would have no use for them, and he farmed and ruled immense territories. He became the richest man and largest slave-holder in Europe."(2)

معافی نامے اور تبرکات

دولت کمانے کے مختلف مؤثر طریقوں میں ایک نہایت مؤثر اور تیر بہدف طریقہ "معافی ناموں" (Indulgences) کی خرید وفروخت بھی تھی۔ کلیسا کی جانب سے مختلف گناہوں کی معافی کے لیے مختلف جرمانے اور تاوان مقرر تھے، جن کی ادائیگی پر گنہگار کو معافی کی سند مل جاتی تھی۔

چنانچہ پوپ بنی فیس ہشتم (Boniface VIII) نے 1300ء کو جشن کا سال قرار دیا اور اعلان کیا کہ اس سال جو بھی زیارت کی غرض سے روم آئے گا وہ خصوصی مغفرت اور معافی (Indulgence) کا حقدار ہوگا:

"In 1300 the Pope had announced a "Jubilee" a special year of indulgences and pardons for all who came to Rome"(3)

کلیسائی فرمان یہ بھی تھا کہ یہ مغفرت نامہ کوئی عام سا مغفرت نامہ نہ ہوگا بلکہ اس میں ہر طرح کے اور سب کے سب گناہوں کی معافی ہوگی:

"Boniface VIII promised in his Bull "not only full and larger, but also the

---

(1) The History Of The Popes, V.1, P.71

(2)The Popes and Their Church, P.24

(3) Ibid, P.54. & Rome and the Popes, P.164

fullest pardon of ALL SINS."(1)

(بونی فیس ہشتم نے اپنے فرمان میں یہ وعدہ بھی کیا کہ نہ صرف مکمل اور وسیع بلکہ ہر ایک گناہ سے مکمل معافی ہوگی)

اس جشن میں جاہل عوام اتنی بڑی تعداد میں آئے اور انھوں نے اس کثرت سے نذرانے پیش کیے کہ کلیسائی عہدیدار بیلچوں (Shovels) اور گھاس جمع کرنے والے آلوں (Rakes) سے دولت گھسیٹتے رہے۔

پوپ کی طرف سے یہ بھی اعلان ہوا کہ دور دراز کے وہ لوگ جو سفر کی صعوبتوں اور راستہ کی ناہمواری یا دیگر پریشانیوں کی وجہ سے روم تک نہیں آسکتے تو وہ پوپ کے نمائندوں (Papal Agents) کے پاس روم کی آمد و رفت کا کرایہ جمع کر دیں، اس طرح انھیں گھر بیٹھے معافی نامے اور تبرکات حاصل ہو جائیں گی:

"It was decreed that any who paid to Papal agents the price of a journey to Rome should obtain the same pardons as if he visited Rome."(2)

معافی ناموں پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے پوپ کی ہدایات میں مذہبی تبرکات اور یادگاروں (Relics) کی فروخت کا سلسلہ بھی شروع ہوا، حضرت عیسیٰؑ کے جعلی خون کے قطرے، ان کی مزعومہ صلیب کی لکڑی اور اس کی کیلیں، ان کے جعلی دودھ کے دانت، ان کے کپڑے، حضرت مریم کے کپڑے اور ان کے بال، ان کی شادی کی انگوٹھی، ان کے دودھ سے بھری ہوئی چھوٹی چھوٹی شیشیاں اور مختلف مقدسین کی یادگاریں وغیرہ، اور یہ سب تبرکات ایک بار نہیں کئی کئی بار بکیں اور ان کے ذریعہ بے تحاشا دولت اکٹھا کی گئی، اور کسی نے یہ بھی نہ سوچا کہ کس سنگدلی کے ساتھ عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے:

"There was the pillar to which Christ had been tied, the nails and wood of his cross (all the material of which had been sold, in grains a dozen times over), drops of his blood, the napkin in short, every thing down to his milk -teeth and his navel-cord. There was all the linen of Mary, and her wedding ring, and so on. There were locks of her hair, and little phials of her milk."(3)

نوٹ

عہدوں کی خرید و فروخت، رشوت ستانی اور مذہب فروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب کلیسا بھرپور خزانوں اور وسیع جاگیروں کے مالک بن گئے، انھوں نے دولت کے حصول بلکہ دولت کی ہوس میں مختلف ظالمانہ اور پرفریب

---

(1)Popery:Its Character & Its Crimes by William Elfe, P.178

(2) The Popes and Their Church, P.64

(3) The Popes and Their Church, P.64

CamScanner

ہتھکنڈوں کا بھی استعمال کیا، جن کے ذریعہ مذہبی تقدس کو پامال اور انسانی قدریں خوار ہوتی رہیں، اور ایسے گھٹیا طریقے اختیار کیے جن سے ان کی دولت میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا، چنانچہ 1200ء میں ایک اندازہ لگایا گیا کہ جرمنی کی ایک تہائی زمین اور انگلستان کی کل زمین کا پانچواں حصہ کلیسا کی ملکیت میں تھا۔ 1250ء میں کلیسائے روم کی ٹیکسوں کے ذریعہ آمدنی سارے یورپ کے بادشاہوں کی آمدنی سے زیادہ تھی، جبکہ صرف انگلستان سے پوپ کو حاصل ہونے والی رقم اس رقم سے تین گنا زیادہ تھی جو شاہ انگلستان کو حاصل ہوتی تھی۔ اسی طرح سولہویں صدی میں جرمنی کے نورمبرگ (Nuremberg) میں منعقدہ ایک مجلس اعلیٰ (Diet) نے اندازہ لگایا کہ جرمنی کی آدھی دولت کا مالک کلیسا ہے۔ (1)

کنبہ پروری

کلیسائی ذمہ داروں کی ایک عمومی کمزوری ان کی بدترین کنبہ پروری بھی تھی، دھوکہ بازی، رشوت ستانی اور جعلسازی کے ذریعہ ارباب کلیسا نے خوب دولت و اقتدار حاصل کیا اور بددیانتی و خودغرضی کے ذریعہ اسے وسعت دی، وہ خود عیش و تنعم کی زندگی گذارتے اور ان کے خاندان کے افراد بھی پوری طرح نہال رہتے، ہر مقام اور ہر سطح پر ان کو ترجیحات حاصل رہتیں۔

ارباب کلیسا عام دنیاوی حکمرانوں کی طرح اہم عہدے اور مفادات اپنے نااہل و غیر مستحق خویش و اقرباء کو بھی عنایت کرتے تھے اور بسا اوقات یہ طرفداری اور ترجیحی اقدام بالکل عیاں ہوتا تھا، پوپ لیو دہم (Lio X) نے اپنے ایک دوست کو صرف اس لیے کارڈینل بنا دیا تھا کہ وہ اپنے مزاحیہ ڈراموں سے پوپ کو خوش رکھتا تھا اور اس کی دل بستگی کا سامان کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اسی پوپ نے اپنے ایک ناجائز عم زاد اور ایک بدنام زمانہ بھتیجے کو بھی کارڈینل کا عہدہ تفویض کیا تھا۔

ان کے علاوہ بہت سے دوسرے پوپ مثلاً اربن ششم، بونی فیس نہم، مارٹن پنجم (Martin V) کیلکسٹس سوم (Calixtus) اور پائیس دوم (Pius II) بھی خویش پروری میں خاصے مشہور تھے، کیلکسٹس سوم نے اپنے بیس سال کی عمر کے دو نوجوان بھتیجوں کو کارڈینل بنایا، حالانکہ وہ کسی بھی لحاظ سے اس کے مستحق نہ تھے۔ (2)

پوپ جولیس سوم (Julius III) نے ایک معمولی سی گلی سے ایک نوجوان لڑکے کو اٹھا کر کارڈینل بنایا، اس پر اتنی عنایات کیں کہ لوگوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ یہ ضرور پوپ کا اپنا ناجائز بیٹا ہے یا پھر اس نے اپنی ناجائز

---

(1) The Story of Civilisation by Will Durant, V.4, P.766. & Economic and Social History of the Middle Ages, by J.W. Thompson, P.692.

(2) History of the papacy. V.4, P.139

"Julius III. who cared for nothing but pleasure and gluttony. He took an ugly Italian boy from the gutter and made a cardinal of him; and nearly all Rome was convinced that the boy was either his natural son or the instrument of his unnatural vices."(1)

خواہشات کی تکمیل کے لیے اسے رکھا ہے:

الیگزنڈر ششم نے اپنی ایک محبوبہ کے بھائی کو کارڈینل بنایا، وہ کسی بھی لحاظ سے اس منصب کا اہل نہ تھا، رومی اسے کھلے لفظوں میں "زیر جامہ کا مرہون منت کارڈینل" کہتے تھے، یہی کارڈینل بعد میں پوپ پال سوم (Paul III) بنا۔

"one was the immoral and scapegrace brother of his pretty young mistress whom Rome promptly called the "Petticoat-Cardinal".(2)

مؤرخ پاسٹر اسی پوپ کی کھلم کھلا خویش پروری کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Alexander, like any secular prince, cared for nothing but the advancement of his family."(3)

(الیگزینڈر کو ایک عام دنیوی حکمراں کی طرح سوائے اپنے خاندان کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کے کسی چیز کی پرواہ نہ تھی)

پوپ کیلیکسٹس سوم (Calixtus III) بدنامی کی حد تک خویش پرور تھا، مؤرخ کریٹن کہتا ہے کہ یوں تو بہت سے پوپ ناجائز و ناروا اقرباء پروری میں مبتلا تھے، مگر:

"His (Sixtus') nephotism was unblushing."(4)

(وہ (سکسٹس) بے حیائی کی حد تک خویش پرور تھا) کیونکہ وہ

"disregarded all considerations of decorum."(5)

(تہذیب و تمیز کی تمام بندشوں کو نظر انداز کر چکا تھا)

اس نے کلیسائے روم کے سارے وسائل اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے حوالے کر دیے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر اپنی شہرت اور خاندان کی عظمت بڑھانے کی بڑی خواہش تھی:

"Sixtus had an upstart's desire to raise his family and spread the glory of his name."(6)

---

(1) The Popes and Their Church, P.80
(2) The Popes and Their Church, P.74
(3) The History Of The Popes, V.6, P.139
(4-5) History of the papacy, V.6, PP.72,123
(6) History of the papacy, V.4, P.177

CamScanner

اینٹی پوپ (Anti-Pope)

متعدد پاپاؤں کے انتخاب میں رشوت ستانی، دھوکہ دہی اور جعلسازی کے نتیجہ میں زبردست تنازعات نے جنم لیا، اور بارہا ایسا ہوا کہ منتخب پوپ کو فریق نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا، ایسے انتخابات کے لیے "Disputed Elections" (متنازع انتخابات) اور انتخاب کو تسلیم نہ کرنے والے کے لیے "Anti-Pope" (مخالف پوپ) کی اصطلاح وضع ہوئی، چنانچہ جو پوپ جائز یا ناجائز طریقہ سے انتخاب میں کامیابی حاصل کرلیتا اور پاپائیت کے منصب پر عملاً قائم ہوجاتا تو وہ پوپ کہلاتا اور اور جو انتخابی یا دیگر تنازعات کی وجہ سے پوپ نہ بن پاتا یا کچھ لوگوں یا کچھ ہتھکنڈوں کی وجہ سے پوپ بن جاتا لیکن پھر اس منصب سے ہٹا دیا جاتا تو وہ ''اینٹی پوپ'' کہلاتا۔ چنانچہ تیسری لیٹیرن کونسل (Leteran Concil) (1179ء) سے پہلے کی صدی میں ایسے اینٹی پوپ دس بیس سال نہیں بلکہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک پاپائیت کے منصب پر فائز رہے اور پھر معزول ہوکر ''اینٹی پوپ'' کہلائے۔ خاص کر وہ پوپ جو کلیسائیت و شہنشاہیت کی کشمکش اور اس کے بعد کے دور انتشار میں اس منصب پر فائز ہوئے، کسی پوپ کو شہنشاہ کی حمایت حاصل تھی تو کسی کو کلیسا کی۔ پھر کسی پوپ کو عوام چنتے تو کسی کو کارڈینلو اور کسی پوپ کو مذہبی کونسل منتخب کرتی، اس طرح منصب پاپائیت کے بیک وقت کئی کئی دعویدار آمنے سامنے ہوتے۔

ظلم وشقاوت

ارباب کلیسا کی اخلاقی صورت حال دیکھ کر ان کی روحانیت اور مذہبیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، یہ وہ مسیحی علماء ہیں جو خدا و آخرت کے خوف سے بالکل آزاد ہیں، عام دنیادار اور بے خوف حکمرانوں کی طرح ان کی زندگیاں عیش وطرب میں غرق ہیں، اور مال و دولت کی ہوس میں وہ سبھی اخلاقی قدروں کو پھلانگ چکے ہیں، اور تعجب خیز یہ کہ عام بھولے بھالے انسانوں کے ساتھ انھوں نے اپنی جماعت کے کمزوروں کو بھی نہیں بخشا، منصب واقتدار کے حصول میں بڑی بے دردی کے ساتھ زندگیوں کو تباہ و برباد کیا گیا، جسے موقع ملا اس نے طاقت کا استعمال کیا اور شدت کے ساتھ اپنے مخالف کو راستہ سے ہٹا دیا، چنانچہ کئی پوپ ایسے بھی گذرے ہیں جو قتل وخونریزی کے بعد ہی اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں، اور بارہا کلیساؤں کے فرش پر لاشوں کے ڈھیر بھی لگے ہیں، اور پاپائیت کے کامیاب امیدوار نے اپنے مخالف اور اس کے حامیوں کے ساتھ ہر قسم کی غیر شریفانہ زیادتیاں روا رکھیں۔ کلیسائی تاریخ کے ایک مستند مؤرخ ''ملمین'' (Dean Milman) کے الفاظ ہیں:

"The Papacy was won by crime and vacated by murder time after time."(1)

(پاپائیت کا منصب متعدد بار جرم کے ذریعہ حاصل کیا گیا اور قتل کے ذریعہ خالی کیا گیا)

پوپ جان چہاردہم (John XIV) بادشاہ اوٹو دوم (Otto II) کے رحم وکرم پر تھا، بادشاہ اس کا حامی اور مضبوط پشت پناہ تھا، جب بادشاہ کا انتقال ہوا تو پوپ بے سہارا ہوگیا، اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف سخت کارروائی کی، اسے پاپائیت کے منصب سے ہٹا کر بونی فیس ہفتم کا پوپ بنادیا اور اسے قید میں ڈال دیا، جہاں وہ بھوک کی شدت میں تڑپتا رہا اور پھر شدت بھوک یا زہر خورانی کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔

"He died from either hunger or poison."(2)

اس سے قبل جان سیزدہم (John XIII) کو شاہ اوٹو اول (Ottol) کی عنایتیں ونوازشیں حاصل تھیں، اسی کی حمایت سے پوپ جان نے پاپائیت کا منصب حاصل کیا تھا، بعض سیاسی اسباب اور بداخلاقی کی بنا پر جان کے خلاف بغاوت ہوئی، مخالفین نے اسے قید کرلیا اور روم سے باہر کردیا، لیکن شاہ وقت کی حمایت اور اس کی مدد سے جان نے پھر سے اپنا مقام ومنصب حاصل کرلیا، اور ایک بار پھر وہ اقتدار پر قابض ہوا، اس کے بعد اس نے اپنے مخالفین کے خلاف سخت کارروائی کی، مخالفین کا ایک سرغنہ شہر کا حاکم تھا جو مرچکا تھا، جان نے اس کی قبر کھودوائی، اس کی لاش کو باہر نکلوایا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروادیے، اس کے علاوہ حاکم کا جو جانشین زندہ تھا اسے اس کے بالوں کے بل لٹکایا گیا، اور پھر اتار کر بالکل عریاں کیا گیا، اور گدھے پر سوار کر کے پورا شہر گھمایا گیا۔ (۳)

مردہ دشمن کے ساتھ سنگدلی اور شقاوت کی یہ کوئی انوکھی مثال نہ تھی، کلیسا کی تاریخ میں اس طرح کی متعدد دلخراش مثالیں موجود ہیں، پوپ اسٹیفن ششم (Stephen VI) نے مذکورہ شقاوت سے زیادہ سنگدلی کا معاملہ کیا، پوپ فارموسس (Formosus) اس کا ایک پیشرو تھا، اسے جرمن امراء کی حمایت حاصل تھی، انہیں کی مدد سے وہ پاپائیت کے منصب پر فائز ہوکر برسر اقتدار رہا تھا، اسٹیفن کا تعلق اطالوی طبقہ سے تھا جو جرمن مخالف تھا، فارموسس کے بعد اطالویوں کی مدد سے اسٹیفن پوپ بنا، پوپ بننے کے بعد اس کے حکم پر فارموسس کی قبر کھودی گئی اور اس کی سڑی گلی لاش (Putrid Body) کو باہر نکالا گیا، اس لاش کو پاپائیت کے تخت (Pontifical Throne) پر بٹھایا گیا اور اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا، اس کے بعد سزا کے طور پر اس لاش کی قطع وبرید کی گئی، پھر ہجوم کے حوالہ کردیا گیا کہ اسے گلیوں اور سڑکوں پر کھینچتے ہوئے دریا میں پھینک دیا جائے۔ (۴)

---

(1) History of Latin Christianity by Dean Milman

(2) The catholoic Encyclopaediav.7 P.1012

(3) Rationalist Encyclopaedia, P.338

(4) The Popes and Their Church, P.32

CamScanner

پوپ اسٹیفن سوم (Stephen III) کے پاپائیت کے منصب پر فائز ہونے سے قبل امراء اور پادریوں کی ایک جماعت نے قسطنطین (Constantine) نامی ایک بشپ کو اپنا پوپ (Anti-Pope) تسلیم کرلیا تھا، پوپ اسٹیفن نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد قسطنطین کے خلاف سخت کارروائی کی، پہلے اسے عورتوں کا لباس پہنایا گیا پھر اس کے پاؤں میں بھاری بوجھ باندھا گیا اس کے بعد اسے گھوڑے پر بٹھا کر شہر بھر میں گھمایا گیا اور پھر قید خانہ میں ڈال دیا گیا، قید خانہ میں اسٹیفن کے دوسر کردہ حامی کرسٹوفر (Christopher) اور اس کے بیٹے سرجیس (Sergius) نے قسطنطین کی آنکھیں نکال دیں، شدت کرب و درد کی اسی حالت میں اسے پوپ کے محل میں پادریوں کی ایک مجلس (Synod) کے سامنے پیش کیا گیا، وہاں پادریوں نے اسے مار مار کر باہر پھینک دیا:

The infuriated priests thrashed the wretch with their own hands, and "threw him out."(1)

اس کے بعد اس بیچارہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس کی تفصیلات' تذکرہ نگاروں نے قارئین کے تصور پر چھوڑ دی ہیں۔

اس کارروائی میں پوپ اسٹیفن کے سرگرم حامی کرسٹوفر اور اس کے بیٹے سرجیس کا بنیادی کردار تھا، جس کے بعد سے کلیسائی نظام میں ان کا رسوخ بڑھنے لگا اور دھیرے دھیرے وہ پوپ پر بھی حاوی ہونے لگے، اس لیے پوپ نے ان کے خلاف سازشیں شروع کردیں، انھیں پتہ چلا تو انھوں نے بھی جوابی سازشوں کا سلسلہ چلایا جس پر پوپ کو ان کے خلاف کھل کر اقدام کرنے کا موقع مل گیا، اس نے ان کے خلاف سخت فیصلہ لیا اور سزا کے طور پر دونوں کی آنکھیں نکلوادیں، کرسٹوفر کی آنکھیں نکالتے ہوئے اس پر اتنا تشدد ہوا کہ وہ تاب نہ لاسکا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا:

"Christopher was mutilated so brutally that he died."(2)

پوپ گریگوری پنجم کو "اچھے اور نیک" پاپاؤں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی، اور اسے روم سے جلاوطن کردیا گیا، اس کے بعد رومیوں کی ایک جماعت نے جان شانزدہم (John XVI) کو پوپ (Anti-Pope) بنالیا، لیکن گریگوری نے شاہی فوج کی مدد سے جلد ہی بغاوت پر قابو پالیا، اس کے بعد پوپ جان کا حشر کچھ اس طرح ہوا کہ اس کی آنکھیں نکال لی گئیں، ناک، کان اور زبان کاٹ دیے گئے، اسے گدھے پر بیٹھا کر اس کا منہ گدھے کی پشت کی طرف کیا گیا، اور پھر پورے شہر میں اسے گھمایا گیا:

"John XVI, that unhappy intruder lost his eyes, his nose, his ears, and his

---

(1) The Popes and Their Church, P.25

(2) The Popes and Their Church, P.26

tongue, and was driven through Rome with his face to his ass's tail."(1)

پوپ اربن ششم (Urban VI) اور پوپ کلیمنٹ ہفتم (Clement VII) کے درمیان سخت کشمکش تھی، دونوں کے پاس فوجی طاقت تھی، ان کے مابین اس طرح خونیں جنگیں ہوئیں جس طرح خدا اور آخرت سے بے نیاز دو ظالم وسفاک بادشاہوں کے درمیان ہوتی ہیں، ان جنگوں میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، ان کے اعضاء کاٹے گئے، لوٹ مار کی گئی اور مظلوم عورتوں کی عصمتوں کو بے دردی سے تار تار کیا گیا:

"Both Popes had armies, and they raped, stole and ,murdered and mutilated civilians without restraint."(2)

(دونوں پوپ کے پاس فوجیں تھیں، انھوں نے زنا کاری کی، چوری کی اور قتل کیا، اور بغیر کسی روک ٹوک کے شہریوں پر ستم ڈھائے)

اگر یہ مثالیں دنیادار بادشاہوں کی ہوتیں تو معاملہ بالکل مختلف تھا، مگر یہ ساری رسہ کشی، اعلیٰ سطح پر فریب وجعل سازی اور رشوت ستانی اس عہدہ کے لیے ہیں جس کے بارے میں دعویٰ ہے کہ اس انتخاب میں "روح القدس کا نور" رہنمائی کرتا ہے! اور اس منصب کا حامل خدا اور انسانوں کے درمیان ایک نمائندہ ہوتا ہے۔!!

حاصل کلام

گزشتہ صفحات میں ارباب کلیسا کے انہیں اخلاقی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے جو بالکل نمایاں اور طشت از بام تھے، ورنہ اخلاقیات کے باب میں کوئی ایسی بداخلاقی نہیں جس میں وہ ملوث نہ تھے؛ جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی، بے ایمانی، چالاکی، بددیانتی وغیرہ ساری خرابیاں ان میں موجود تھیں اور اس کی بے شمار مثالیں خود مسیحی مؤرخین نے بھی بیان کی ہیں، کلیسا کی انہیں بداخلاقیوں کی وجہ سے کلیسا کے دور اقتدار کو "تاریک دور" (Dark Ages) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس صورتحال پر مؤرخ مینکن (Mencken) کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

"The great days of the Universal Church were days of unparalleled crime and disorder, injustice and oppression, outrage and atrocity."(3)

(عالمی کلیسا کے اقتدار کا زمانہ درحقیقت بے مثال جرائم، بدنظمی، ظلم وتعدی، فسادات اور بدکاریوں کا زمانہ تھا)

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ارباب کلیسا میں بعض پادری واقعی نیک طینت ونیک فطرت تھے اور کلیسا کی اصلاح

---

(1) The Popes and Their Church, P.37
(2)The Popes and Their Church, P.62
(3) Treatise on Right and Wrong by Mencken, P.105

بھی چاہتے تھے لیکن وہ اُس اکثریت کے درمیان دبے کچلے ہوئے تھے جو دنیا دار اور عیش پسند تھے، اور جو جاہ ومنصب کے حصول میں کسی بھی اخلاقی حد کو پھلانگ سکتے تھے، خود عیسائی مؤرخ پاسٹر (Dr. Ludwig Pastor) نے اس کی وضاحت کی ہے:

"But they were borne down by the wordly majority"(1)

(مگر وہ دنیا پرستوں کی اکثریت میں دبے ہوئے تھے)

ارباب کلیسا کا یہ اخلاقی بیان دراصل آئینہ ہے ان متعصب نقادوں کے لیے جو اسلام کی شفاف وپاکیزہ تعلیمات کو پراگندہ کر کے پیش کرتے ہیں اور حقیقت میں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو چھپانے کی خاطر اسلام کے روشن چہرہ کو داغدار کرتے ہیں۔

---

(1) The History Of The Popes, V.5, P.362

عورت-کلیسا کی نظر میں

اگر کارگاہ حیات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم انسانی کی تمام رونق اور دنیا کا سارا ہنگامہ منحصر ہے انسانی خواہشات پر، اوران خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان اپنی تمام جسمانی و دماغی قوتیں صرف کردیتا ہے، جب وہ بھوکا ہوتا ہے تو حصول غذا کے لیے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا، جب اسے پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے تو پانی کے لیے وہ دیوانہ وار دوڑتا ہے، اسی طرح سردی گرمی سے حفاظت کے لیے محنت سے بھی کوئی دریغ نہیں کرتا، منجملہ انہیں فطری خواہشات کے ایک اہم خواہش وہ بھی ہے جو "تعلق جنسی" یا "جذبۂ شہوانی" سے وابستہ ہے، اوراس کے لیے بھی تگ ودو کرنا اس کی عادت ہے، لیکن جس طرح انسان غذا کی فراہمی کے سلسلہ میں نان جویں سے بڑھ کر مرغ وبریانی پر بھی بس نہیں کرتا، رفع تشنگی کے لیے سادہ پانی سے بنت العنب تک بڑھ جاتا ہے، تن کی حفاظت کے لیے کھدر سے گذر کر حریر وپرنیاں تک جا پہنچتا ہے، اسی طرح خواہش جنسی کو پورا کرنے میں وہ جائز حد سے گذر کر ان حدوں تک پہنچ جاتا ہے جو بڑی حد تک غیر فطری، غیر انسانی اور غیر تمدنی ہوتی ہیں اور انسان کی انہیں بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کو روکنا اور ان فطری خواہشات کی طبعی تکمیل کرنا مذہب کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ ہمیشہ سے مردوں نے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورت کا پوری شدت اور پورے تشدد کے ساتھ استعمال کیا ہے، عہد قدیم میں یہ نظریہ بالکل عام تھا کہ عورت صرف سامان تسکین اور افزائش نسل کا ذریعہ ہے، اوراس زاویہ سے اس پر ہر طرح کی زیادتی روا ہے، ہوس کے پجاریوں نے تسکین نفس کی خاطر پاک دامن خاتونِ خانہ کو بھی نہیں بخشا اور انھیں گھسیٹ کر نہ صرف بازاروں اور کوٹھوں تک پہنچایا بلکہ اپنی کمائی کا ذریعہ بھی بنایا۔

جب دین مسیحی کا دور آیا تو خیال تھا کہ فحاشی کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی، عفت وپاکدامنی کی راہیں ہموار ہوں گی اور عورتوں کو محفلوں کی زینت کے بجائے گھروں کی ملکہ بنایا جائے گا، نیز تجرد کی کا جو عام چلن ہو چلا تھا اس پر کراری ضرب لگے گی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسیحیت کے دور میں فحاشی وبے حیائی پر قدغن لگانے کے بجائے اسے

مزید رواج دیا گیا اور خود مذہب کے ٹھیکیداروں نے اس کی سرپرستی کی، کہنے کو تو ارباب کلیسا نے عورت پر ہو رہے سماجی مظالم کے خلاف آواز اٹھائی لیکن پس پردہ انھوں نے خود عورت کی عصمت و عظمت کے پردوں کو چاک چاک کیا، کیونکہ خود مسیحیت نے بھی عورت کو قدیم رواج کے مطابق منحوس اور دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا، اور مرد کی ساری ترقیات ایمانی و روحانی کے لیے اس سے کامل و مکمل احتراز کو لازم قرار دیا۔

عورت کی حیثیت

مسیحیت کا بانی پولس اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

''مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے وجود میں آئی ہے، عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔''(۱)

ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:

''عورت کو خاموشی سے پوری اطاعت گذاری کرنی چاہیے، میں کسی عورت کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی مرد کو سکھائے اور مرد پر اپنا اختیار چلائے، بلکہ اسے چپ چاپ ہی رہنا چاہیے، کیونکہ پہلے آدم کو تخلیق کیا گیا تھا اور پھر حوا کو، آدم کو بہکایا نہیں جا سکتا تھا مگر حوا کو بہکا لیا گیا اور وہ گناہ میں ملوث ہو گئی۔''(۲)

پولس کی ان تحریروں کے مطابق عورت اپنی ذات میں کچھ نہیں ہے بلکہ وہ انسان کے اس ازلی گناہ کا باعث ہے جس کی وجہ سے ''خداوند'' کو زمین پر آنا پڑا اور صلیب جیسی ملعون موت کے ذریعہ بنی آدم کا کفارہ بننا پڑا، اس لیے عورت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ چوں چرا کیے بغیر خاموشی سے صرف حکم بجا آوری کرتی رہے۔

عورت کی اس ناقدری کی وجہ سے اسے بنیادی طور پر ناپاک اور شیطان کا پھندا سمجھا گیا، یہی وجہ ہے کہ مسیحیت میں شادی بیاہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، اور اس کی اجازت بھی بہت مجبوری کے بعد دی گئی ہے۔ چنانچہ پولس نے حرام کاری کے اندیشہ سے شادی کی اجازت تو دی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

''مرد کے لیے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے۔''(۳)

پولس مزید لکھتا ہے:

''پس موجودہ مصیبت کے خیال سے میری رائے میں بہتر یہی ہے کہ آپ غیر شادی شدہ رہیں۔ اگر تو بیوی رکھتا ہے تو اس سے چھٹکارہ پانے کی کوشش نہ کر، اگر تو شادی شدہ نہیں ہے تو بیوی کی تلاش نہ کر، لیکن اگر تو بیاہ کرے گا تو بھی کچھ گناہ نہیں اور اگر کنواری بیاہی جائے تو اسے گناہ نہیں مگر ایسے لوگ جسمانی تکلیف پائیں گے، اور میں تمھیں اس سے بچانا چاہتا ہوں۔ بھائیو! اور بہنو! میرے کہنے کا مطلب ہے کہ وقت بہت کم ہے پس آگے کو چاہیے کہ بیوی والے ایسے ہوں کہ گویا ان کی بیویاں ہی نہیں۔''(۴)

---

(۱) کرنتھیوں کے نام خط/ ۱۱:۹، ۱۰ (۲) تیمتھیس ۱:۱۱-۱۴ (۳) کرنتھیوں ۱:۷ (۴) کرنتھیوں ۷:۲۵-۲۹

پولس کی ان ہدایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی معاشرہ میں عورت ''قابل نفریں'' ہوگئی اور ایک عرصہ تک مسیحی مفکرین اسی بحث میں الجھے رہے کہ عورت کے اندر روح بھی ہے یا نہیں؟ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ اس کے اندر روح تو ہے مگر ایسی روح جو بہت ہی خبیث ہے، اور وہ روح ہے جو نجات پانے والی نہیں ہے، اور اس میں کنواری مریم (والدہ حضرت مسیحؑ) کے سوا کسی کا استثناء نہیں۔ (۱)

مشہور عیسائی متکلم تھومس ایکویناس (Thomas Acquinas) نے عورت کو غلام سے بھی بدتر قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بقول غلام کی غلامی اور اس کی محکومی قدرتی نہیں ہے، جبکہ عورت فطری اور قدرتی طور پر غلام ہے، اسے باپ، بیٹے اور خاوند کا محکوم بنایا گیا ہے، اس لیے اس کا مرتبہ غلاموں سے بھی کمتر اور بدتر ہے۔

پادریوں کی تصانیف کی ورق گردانی سے عورت کے باب میں عجیب عجیب تعلیمات آشکارا ہوتی ہیں جیسا کہ اخلاق یورپ کا مصنف لیکی لکھتا ہے:

"Woman was represented as the door of hell, as the mother of all human ills. She should be ashamed at the very thought that she is a woman. She should live in continual penance, on account of the curses she has brought upon the world. She should be ashamed of her dress, for it is the memorial of her fall. She should be especially ashamed of her beauty, for it is the most potent instrument of the demmon."(2)

(عورت کا وجود جہنم کا دروازہ اور تمام قبائح انسانی کی جڑ ہے، عورت کو ہمیشہ ذلیل اور شرمندہ رکھنے کے لیے اس کا یہی خیال کافی ہے کہ وہ عورت ہے، اس کا درجہ ایک دائمی محکومیت کا ہے اسے اپنے لباس وحسن سے خصوصیت کے ساتھ محجوب رہنا چاہیے کیونکہ صد معاصی کے لیے حسن ہی اس کے پاس سب سے قوی حربہ ہے) (۳)

مسیحی علماء ومفکرین کے منفی نظریات کا براہ راست اثر مسیحی معاشرہ پر پڑا، اور ابتدائی صدیوں میں شادی کے باوجود بیویوں کے حقوق کی ادائیگی کو غیر ضروری بلکہ بڑی حد تک نامناسب سمجھا جانے لگا۔

مسیحی معاشرہ کا عورت پر ایک ظلم یہ بھی تھا کہ مسیحی قانون نہ کسی مطلقہ کو نکاح ثانی کی اجازت دیتا ہے اور نہ کسی مرد کو طلاق دینے کا اختیار دیتا ہے، طلاق دینے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ عورت پر حرام کاری کا الزام ثابت ہو:

''جو کوئی اپنی بیوی کو کسی وجہ سے طلاق دیتا ہے سوائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے سے جنسی تعلقات رکھتی ہے تو اس کی حرام کاری کا سبب بنتا ہے، اگر اس کی بیوی کسی غیر مرد سے جنسی تعلق قائم کرے تو اس صورت میں اس کو چھوڑ دے، اس مطلقہ سے دوبارہ شادی کرنے والا آدمی حرام کاری کرنے کے مترادف ہے۔'' (۴)

---

(۱) المرأۃ فی الاسلام للاستاذ محمود العقاد: ۵۳، اسلام کا معاشرتی نظام، صفحہ ۹۷/ از ڈاکٹر خالد علوی

(2) History of European Morals Vol.2,P.338

(۳) ترجمانی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (تاریخ اخلاق یورپ) (۴) متی ۵/۳۲

عورت سے نفرت اور اس کے متعلق منفی نظریات کے ساتھ طلاق پر غیر ضروری و غیر فطری پابندیوں سے مسیحی معاشرہ پوری طرح چڑ مرا اٹھا اور پھر مختلف شکلوں میں اس کا ردعمل ظاہر ہوا جس نے عفت و پاکدامنی کے سارے تصورات کو مسخ کر دیا۔

کلیسا کی حیثیت چونکہ ایک مذہبی رہنما کی تھی اس لیے پولس کی ہدایات کے مطابق اس نے عورت کے سلسلہ میں سخت اور جارحانہ رویہ اختیار کیا اور عملاً یہ تسلیم کر لیا گیا کہ مذہبی پیشوائی اور رسولوں کی نیابت کے لیے ضروری ہے کہ عورت سے زیادہ سے زیادہ دوری اختیار کی جائے، اس نظریہ کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ عورت پادریوں کے لیے ایک ''شجر ممنوعہ'' بن گئی۔ چنانچہ ابتداء میں پادری بننے کے بعد حتی المقدور عورت سے اجتناب اس کی نیکی (Act of Virtue) سمجھی جاتی تھی لیکن بعد میں یہی اس کا فریضہ (Act of Duty) شمار کیا جانے لگا، اور کلیسا کی جانب سے یہ ہدایت جاری کر دی گئی کہ اگر پادری بننے سے پہلے کسی نے شادی کر لی ہے تو اب وہ اپنی بیوی کے پاس بھی نہ پھٹکے۔

کلیسا نے اس سلسلہ میں سخت قوانین بھی وضع کیے جن میں کچھ مضحکہ خیز بھی تھے مثال کے طور پر اگر کوئی پادری گھریلو مشورہ وغیرہ کے سلسلہ میں اپنی بیوی سے ملنا چاہے تو کھلی جگہ میں اور کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں ہی ملے۔

جن پادریوں نے اس سلسلہ میں تساہلی برتی یا کلیسا کے فرمان کو نظر انداز کیا ان کے سلسلہ میں پوپ ہائلڈ برینڈ (Hildebrand) نے سخت نوٹس لیا، اور عام مسیحیوں کو سختی سے حکم دیا کہ وہ ایسے شادی شدہ پادریوں کی سمع و طاعت سے بالکل دست بردار (Withdraw their obedience) ہو جائیں۔

کلیسا کے اس فرمان سے گھریلو عورتیں بری طرح متاثر ہوئیں، ان کی زندگیاں اجیرن بن گئیں، نہ جانے کتنی عورتیں بے گھر کر دی گئیں، ایک بڑی تعداد داشتگی کے پیشہ سے وابستہ ہو گئی اور ذلت و حقارت کے ساتھ زندگی گذارنا ان کا مقدر بن گیا۔

کلیسا کا فرمان یقیناً انسانی فطرت کے خلاف تھا، اس لیے بہت سے پادریوں نے اپنی بیویوں کی محبت اور اولاد کی چاہت میں اس کی خلاف ورزیاں بھی کیں، جس کی پاداش میں پوپ اربن دوم (Pope Urban II) نے مزید سخت احکامات جاری کیے جن کا براہ راست نتیجہ عورتوں پر مزید ظلم کی شکل میں ظاہر ہوا:

"Pope Urban II gave license to the nobles to reduce to slavery the wives whom priests had obstinatily refused to abandon." (1)

(پوپ اربن دوم نے امراء کو اجازت دے دی کہ وہ ان پادریوں کی بیویوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں جنھیں ان کے خاوندوں نے ضد سے کام لیتے ہوئے چھوڑنے سے انکار کر دیا ہے)

---

(1) An Historical Sketch of Sacredotal Celibacy, P.277

ارباب کلیسا دوہری زندگی جینے کے عادی تھے، ذاتی زندگی (Private Life) اور عوامی زندگی (Public Life)، اور ان کی ذاتی زندگی ان کی عوامی زندگی سے ہمیشہ مختلف رہی ہے، وہ فحاشی کے خلاف فتوے تو دھڑلے سے دیتے تھے لیکن خود اس فحاشی کے مرتکب ہوتے تھے، محل سے باہر وہ عورت سے نفرت اور اس سے کراہت کا درس دیتے تھے لیکن محل کے اندر ان کی شام اسی عورت کی مخمور زلفوں میں بسر ہوتی تھی اور اسی کے پہلو میں صبح کی کرنیں پھوٹتی تھیں، ان کا جسمانی لطف اندوزی کا ذوق (Sensuality) ان کے مذہبی و اخلاقی ذوق پر غالب تھا۔

اخلاق یورپ کا مصنف اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''اس زمانہ کے پادریوں کی عام بدچلنی و شہوت پرستی کے ثبوت میں مستند شواہد کے دفتر کے دفتر موجود ہیں، اچھوتیوں کی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں۔ بلکہ حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے،..... اغلام اور شاہد بازی کی گو مسیحیت نے بیخ کنی کی، لیکن خانقاہوں کی چہار دیواری کے اندر اس کی سرپرستی قائم رہی، خود ناصحین کی یہ حالت تھی کہ وہی سب سے زیادہ آلودۂ معاصی رہتے تھے، بارہا اخلاقی انحطاط پر انہوں نے شدومد سے وعظ کہا لیکن ابھی اس پر گو چند گھنٹہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ لوگوں نے دیکھا وہ اپنے خلوت کدہ میں ایک طوائف کے ساتھ لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے ہیں، یہ سب کیا تھا؟ وہی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال! ساری خرابیوں کی جڑ یہ تھی کہ شادی و نکاح کے پاک و فطری طریقہ کے انسداد کی کوشش کی جاتی تھی، پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستہ کو روکیے گا تو وہ حوض کے اندر لامحالہ گندگی و تعفن پیدا کر دے گا۔''(1)

کلیسا کے تاریخی امور کے فاضل لی (Lea) نے عام پادریوں اور کلیسائی عہدیداروں کی اخلاقی حالت اس طرح بیان کی ہے:

".....among the crowd of turbulent and worldly ecclesiastics, whose only aim was the gratification of the senses or the success of criminal ambition."(2)

(یہ دنیادار اور آمادۂ فساد پادریوں کا ہجوم تھا، جس کا واحد مقصد جسمانی حسیات کی تسکین اور مجرمانہ خواہشات کی تکمیل تھا)

تاریخ کلیسا میں پوپ اگسٹائین (Augustine) کی مسلمہ عظمت و مذہبیت کی وجہ سے Saint (قدیس) لفظ اس کے نام کا جزء بن گیا تھا، لیکن یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ کم از کم اس کی ایک داشتہ تھی اور وہ ایک ناجائز بچہ کا باپ تھا، اور اس ''قدیس'' نے اپنے اس ناجائز بچہ کا نام Adeodatus یعنی عطیۂ خداوندی رکھا تھا:

"St. Augustine had named his illegitimate son Adeodatus, or the Gift of God."(3)

---

(1) History of European Morals Vol.2, P.331

(2) History of Sacerdotal Celibacy in the Christian Church Vol.1, P.129

(3) History of European Morals Vol.2, P.332

CamScanner

"In 1171 was found, on investigation, to have seventeen illegitimate children in a single village."(1)

(1171ء میں کنٹربری (Cantarbury) کے اسقف کی صرف ایک موضع میں 17 ناجائز بچے تھے)

"Henry III, who was deposed in 1274 for having sixty-five illegitimate children."(2)

(1274ء میں ہنری سوم (Henry III) کی 65 ناجائز اولادیں تھیں جس کی وجہ سے اسے تخت سے معزول کیا گیا۔)

پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) زنا اور بدکاری کو نہایت معمولی درجہ کا عمل بتاتا تھا اور اس گناہ کی سنگینی کو اپنے ان الفاظ میں بے حیثیت کرتا تھا:

"No more harm in that rubbing your hands together."(3)

(یہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑنے کی طرح ہے، اس کا اس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں ہے)

پوپ جان دوازدہم (John XII) کی اخلاقی گراوٹ اس حد تک تھی کہ اس کے محل میں ہر طرح کی اخلاق سوزیاں و بے حیائیاں عام تھیں، اور بقول مؤرخ:

"He had turned the Lateran Palace into a brothel"(4)

(جان نے لیٹرن (پاپائی) محل کو طوائف کا اڈہ بنا دیا تھا)

اس کے اخلاق کی گراوٹ یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ قدیس پطرس کے گرجا گھر میں عبادت کے لیے آنے والی اکیلی ڈکیلی عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر بھی اس کے گناہوں میں شامل ہے:

".....raped girls and women who came to pray in St. Peter's gambled."(5)

(اس نے لڑکیوں اور قدیس پطرس کے کلیسا میں عبادت کے لیے آنے والی عورتوں کے ساتھ بھی زنا بالجبر کیا)

پوپ جان دوازدہم کے سنگین جرائم جب عام ہو گئے اور بے شمار عزتیں خاک میں مل گئیں تو جرمن بادشاہ اٹو اول (King Otto I) نے جو روم پر تسلط و اقتدار کا مالک تھا پوپ کے خلاف نوٹس لیا، تحقیقات کا حکم دیا اور پھر سبھی الزامات ثابت ہونے کے بعد اسے پاپائیت کے منصب سے بے دخل کر دیا، جان معزول ہو کر روم چلا گیا، روم پہنچ کر اس نے پھر جوڑ توڑ شروع کی، اپنے حامیوں اور مخالفوں میں کثرت سے روپے بانٹے، عہدوں اور جائدادوں کی بڑی بڑی رشوتیں دیں، اور ایک بڑی تعداد کو اپنا ہم نوا بنا کر دوبارہ پاپائیت کے منصب پر فائز ہو گیا۔

---

(1) History of Sacerdotal Celibacy Vol.1, P.342

(2)History of European Morals Vol.2, P.331

(3) Rationalist Encyclopaedia, P.64

(4,5) The Popes and their church,P.35

عالم مسیحیت کے مرکز روم کے باشندوں اور امراء و کارڈینلوں کے اخلاقی دیوالیہ پن کی یہ ایک مثال ہے کہ انھوں نے پھر سے اسی بداخلاق و بدکردار اور نہایت ہی واہیات شخص کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرلیا تھا۔ دوبارہ پوپ بننے کے بعد اس نے پھر سابقہ روش اختیار کی، لیکن تین ماہ سے زیادہ اس کی زندگی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور ایک رسوا کن حالت میں وہ مارا گیا:

"He was struck dead by the devil while he was paying his attentions to a married woman in an obscure part of Rome."(1)

(وہ روم کے ایک تاریک گوشہ میں ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا کہ اس کے کسی دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔)

عام طور پر سارے پوپ اور سارے کلیسائی عہدیدار بھیانک بداخلاقی و عیش پرستی میں مبتلا تھے لیکن مشہور پاپاؤں میں بنی ڈکٹ نہم (Benedict IX) اس طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنی عیاشی میں دیگر پاپاؤں سے فائق تھا، زنا کاری، جبری بدکاری اور قتل و غارت کے سنگین گناہوں میں وہ ملوث تھا، حتی کہ روایت یہ بھی ہے کہ یہ پوپ غیر فطری فعل کا بھی عادی تھا، اس کی عمومی بدکاریوں اور بداخلاقیوں کے سلسلہ میں اسی کا ایک جانشین وکٹر دوم (Victor II) کو یہ کہنا پڑا:

"They were so horrible that I shudder to tell them," says one of his successors; Victor II."(2)

(وہ اتنی وحشت ناک تھیں کہ ان کے بیان سے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے)

پوپ الیکزینڈر ششم (Alexander VI) کا شمار بھی بدکردار پاپاؤں میں ہوتا ہے، پاپائیت کا منصب سنبھالنے سے قبل وہ کارڈینل بورجیا کے نام سے جانا جاتا تھا، اپنے کارڈینل اور پھر پوپ دونوں ادوار میں وہ بدکاری و بدقماشی میں مصروف رہا، اور بقول مؤرخ:

".....to the end of his days he remained the slave of the demon of sensuality."(3)

(.....اپنی زندگی کے آخری دنوں تک وہ شہوانیت کے شیطان کا غلام رہا)

الیکزینڈر ششم کا پیش رو انوسینٹ ہشتم (Innocent VIII) بھی پوپ بننے سے قبل دو ناجائز بچوں کا باپ بن چکا تھا، جب وہ پوپ بنا تو خاصا بوڑھا ہو چکا تھا، اور اس کی عمر اور اس کی صحت بدکاری کا تحمل نہیں کر سکتی تھی، تاہم

---

(1) The Popes and their church, P.35,36
(2) The Popes and Their Church,P.38
(3) History of the Popes, vol.5, P.362

اس نے اپنے کارڈنیلوں اور اپنی اولاد کو بدکاری وفحاشی کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی، اس کا ایک بیٹا اعلیٰ درجہ کا عیاش اور شہوت پرست تھا، اس کے بارے میں مشہور تھا:

"When his eye fell upon a woman she was not safe in her house at night. His servants forced the doors for "the Pope's son."(1)

(جب اس کی نظر کسی عورت پر پڑ جاتی تھی تو وہ رات کے وقت اپنے گھر میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، اس کے نوکر "پوپ کے بیٹے" کے لیے زبردستی دروازہ کھلوالیا کرتے تھے)

پوپ اربن ششم (Urban VI) خود بھی بدکار وبدکردار تھا اور اس سے بڑھ کر بدکاروں کی سرپرستی اور ان کی حمایت کرتا تھا، اس کے متعلق مؤرخ کا بیان ہے:

"He said nothing when his favourite nephew tore nuns from their convents rather, he loaded the nephew with wealth and honours."(2)

(جب اس کا چہیتا بھتیجا رات میں زبردستی راہبات کو ان کے مراکز سے اٹھالے جایا کرتا تو وہ کچھ نہ بولتا تھا بلکہ وہ اپنے بھتیجے کو مال ودولت سے نوازتا تھا)

پانچویں صدی کے ایک خانقاہی سربراہ کی اخلاقی پستی کچھ اس طرح تھی:

"No one was safe from his lust."(3)

(اس کی ہوس سے (علاقہ کی) کوئی بھی عورت محفوظ نہ تھی)

داشتاؤں کا رواج

کہتے ہیں کہ ہوس کی آگ بھڑکتی ہے تو بجھائے نہیں بجھتی، اس کی لو تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے، بس کچھ یہی معاملہ ان پادریوں کا بھی تھا، ان کی ہوس کی لپٹیں بڑھتی ہی جارہی تھیں، رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کی عزتیں بھی غیر محفوظ ہوگئیں، پادریوں سے عزتوں کی حفاظت کرنا ایک سنجیدہ مسئلہ بن گیا، چنانچہ بہت سے علاقہ کے لوگوں نے ذمہ داران کلیسا سے اس بات پر اصرار کرنا شروع کیا کہ اگر کلیسا کی جانب سے پادریوں کو باقاعدہ شادی کی اجازت نہیں ہے تو انھیں اپنی جنسی ضروت کی تکمیل کی خاطر حسب ضروت داشتہ رکھنے کی اجازت دی جائے تاکہ ان کے گھر کی عزتیں محفوظ رہ سکیں۔

بھوکا چاہے دو روٹی، اندھا چاہے دو آنکھیں، حکومت کی جانب سے اس کی تائید ہوئی اور یہ "مخلصانہ تجویز" قبول کرلی گئی، اس طرح عام پادری کم از کم دو دو داشتہ کے مالک بن گئے، اور بعض پادریوں نے تو داشتائیں رکھنے

---

(1) The Popes and Their Church, P.71,72

(2) The Popes and their church, P.63

(3) Life in the Middle Ages, by G.G Coulton, V.4, P.377

CamScanner

میں رکارڈ قائم کر دیا، چنانچہ:

''1130ء میں اسپین کا ایک پادری پیلایو 70 داشتائیں رکھے ہوئے تھا۔''

(St Pelayo, in Spain, who in 1130 was proved to have kept no less than seventy concubines)(1)

کثرت سے داشتائیں رکھنے کا رواج اس قدر عام ہو چلا کہ حکومت کو اس کے لیے ضابطے متعین کرنے پڑے اور داشتہ رکھنے کا باقاعدہ لائسنس جاری کرنا پڑا، اور اس پر فیس بھی رکھی گئی جسے اصطلاحی طور پر ''کلاجیم'' (Culagium) کہا جاتا تھا۔

"A tax called "Culagium" which was in fact a licence to clergymen to keep concubines."(2)

پوپ الیگزینڈر سوم (Alexander III) نے پادریوں کی شادی کی ممانعت کے قانون کو سختی سے نافذ کیا تاہم اپنے نمائندوں کو یہ حکم بھی دیدیا کہ کسی بھی پادری کی ایک دو داشتہ رکھنے پر کوئی گرفت نہ کی جائے، تاکہ اس حلقہ کی باقی عورتیں محفوظ رہیں، مگر یہ طریقہ بھی بہت زیادہ مفید و کارگر ثابت نہ ہو سکا، اور عیسائی خواتین اپنے پادریوں کی ہوس سے محفوظ نہ رہ سکیں، اور ان کے پیروکاروں کی بہو بیٹیوں کی عصمتیں تار تار ہونے لگیں، کیونکہ عام پادری اس حد تک اخلاقی دیوالیہ کا شکار ہو چکے تھے متعدد داشتائیں رکھنے کے باوجود ان کی ہوس کی پیاس بجھتی نہ تھی۔ (۳)

پوپ الیگزینڈر ششم (Alexander VI) جب کارڈینل تھا تو اس کی ایک مسلمہ داشتہ (Acknowledged mistress) تھی جس سے اس کے تین بچے پیدا ہوئے، (Juan, Ceasar, Lucrezia) اس نے نہ صرف انھیں ایک ایک کر کے قانونی اولاد بنایا بلکہ ان کے لیے جاگیریں، نوابی عہدے، اور کلیسائی مراعات بھی حاصل کیں، اس کے ایک بیٹے سیزر کے لیے کلیسائی عہدوں کا دروازہ کھولا گیا اور اس کے جواز کی یہ مضحکہ خیز وجہ پیش کی گئی:

"because he was the son of a Cardinal and his mother is married woman."(4)

(کیونکہ وہ ایک کارڈینل کا بیٹا ہے اور اس کی ماں شادی شدہ ہے)

---

(1) History of European Morals Vol.2, P.331

(2) History of European Morals Vol.2, P.330

(3) History of Sacerdotal Celibacy Vol.1, P.320,388

(4) History of the Popes, V.5, P.365

پادریوں کی زندگیوں میں جب داشتہ کا چلن عام ہوا تو اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بھی اس پیشہ سے وابستہ ہو گئیں، اور کسی پادری سے منسوب ہونے کی وجہ سے معاشرہ میں اسے خاصی اہمیت دی جانے لگی، عوامی اجتماعات میں پادری کی داشتہ کو باقاعدہ بیوی کی طرح عزت کی جگہ (Place of Honour) ملتی تھی۔ چونکہ یہ داشتائیں خاص کر پوپ اور کارڈینل کے محل کی زینت بنا کرتی تھیں اس لیے انھیں ''کورٹ زن'' (Courtesan) بھی کہا جاتا تھا، یہ کلیسا کے دورارتقاء کی خاص پیداوار ہیں، ان کا عمومی قحبہ خانوں سے کوئی تعلق نہ تھا، لفظ ''کورٹ زن'' کے وہی معنی ہیں جو اس کے املاء سے ظاہر ہے، یعنی ''دربار کی عورت'' یا ''دربار کی محبوبہ''، یہ عورتیں شاہی حشم وخدم کے ساتھ رہتی تھیں اور پاپائیت کے دربار کی زینت بنتی تھیں۔

برچارڈ (John Burchard) نے جو اس زمانہ کے دربار پاپائیت کا مستند مؤرخ ہے اپنے روزنامچہ میں پوپ الیکزینڈر ششم کے دربار کا حال لکھتا ہے:

''ماہ اکتوبر 1501ء میں پاپائے اعظم نے حکم دیا کہ دربار میں پچاس ایسی عورتیں لائی جائیں، چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، عشاء کے بعد یہ عورتیں؛ قیصر بورجیا (Ceasar Borgia) اور اس کی بہن لقریزیہ (Lucrezia) کے سامنے پہلے تو پشوازیں پہن کر اہل دربار کے ساتھ خوب ناچیں بعد ازاں انھیں ننگا نچایا گیا، اس کے بعد شمعہائے کافوری کے جھاڑوں کی مختلف زوشیں بنائی گئیں، شمعیں روشن کردی گئیں اور فرش پر اخروٹ بکھیر کر ان عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان بلوریں جھاڑوں کے درمیان جانوروں کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلیں اور اخروٹ چنیں، اس سلسلہ میں انعامات بھی تجویز ہوئے اور ان کو دیے گئے جن کی بے حیائی اہل بزم کو زیادہ پسند آئی۔''(1)

پادریوں کی اخلاق باختگی اور ہوس پرستی کی سنگینی اس حد تک پہنچ گئی کہ پاپائے اعظم کو کھلے لفظوں میں اس سنگین بداخلاقی کا اعتراف کرنا پڑا چنانچہ پوپ الیکزینڈر چہارم (Alexander IV) نے اپنے ایک خط (Bull) میں یہ قبول کیا:

''پادری بجائے لوگوں کی اصلاح کے انھیں مزید خراب کر رہے ہیں''۔

(In his bull of 1259, Alexander IV does not hesitate to state that the people, instead of being reformed, are absolutely corrupted by their pastors.)(2)

اور گریگوری دہم کو ''لی اونس'' کی دوسری کونسل میں شریک ہونے والے معزز پادریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہنا پڑا:

''دنیا میں اخلاقی تباہی کے باعث وہ سردار تم ہو''۔

---

(1) The Popes and their Church, 72 (ترجمانی: نیاز فتح پوری/ترقیمات جنسی: IPA)

(2) History of Sacerdotal Celibacy Vol.I, P.143

(Gregory X, who, in dismissing the second Council of Lyons, in 1274, told his assembled dignitaries that they were the ruin of the world) (1)

ہوس کے ان پجاریوں نے عام لوگوں کی بہو بیٹیاں تو درکنار خود اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزتیں بھی نہیں بخشیں، کلیسا کی سیاہ تاریخ کے صفحات ان شرمناک واقعات کے گواہ ہیں کہ مسیحیت کے ان ٹھیکیداروں نے نہ صرف بھولے بھالے عوام کا استحصال کیا بلکہ اپنے گھر کی عزتوں کو بھی پامال کیا اور مقدس خونی رشتوں کو رسوا کیا:

"پاپائے اعظم جان بست دسوم (Pope John XXIII) زنا کاری اور خود اپنی ماں، بہن کے ساتھ زنا کاری کا مرتکب ثابت ہوا تھا۔" (۲)

"پاپائے اعظم جان دوازدہم نے اپنی بیوہ بھتیجی اور اپنی دو سگی بہنوں کے ساتھ زنا کیا۔" (۳)

"پاپائے اعظم الیگزنڈر ششم (Alexander VI) نے اپنے سگے بھتیجے کو عہدہ کالا لچ دے کر اس کی بیوی کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا۔" (۴)

تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف اس شرمناک اور وحشت ناک صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

".....that inveterate prevalence of incest among the clergy, which rendered it necessary again and again to issue the most stringent enactments that priests should not be permitted to live with their mothers or sisters."(5)

(اہل کلیسا میں حرام کاری و شہوت پرستی کے جوش میں محرمات و غیر محرمات کی تمیز اٹھ گئی تھی، چنانچہ بار بار اس طرح کے قوانین کے نفاذ کی ضرورت پیش آتی رہی کہ پادری اپنی ماؤں اور بہنوں سے الگ رہیں)

ایسے قانونی احکام بارہویں صدی عیسوی تک بکثرت جاری کیے گئے، مگر ان کو غیر مؤثر دیکھ کر کلیسائی حکام نے آہستہ آہستہ اپنے قدم پیچھے کر لیے اور اسے ایک ناقابل علاج مرض تسلیم کر لیا، اور ایسے گناہوں پر عائد جرمانے گھٹتے چلے گئے حتی کہ محرمات سے مباشرت کا جرمانہ صرف پانچ شلنگ رہ گیا۔

بالآخر 1431ء میں منعقد ہونے والی Bale کانفرنس کو یہ قرارداد منظور کرنا پڑا:

"سب کے سب پادری بدکار ہیں، دوسروں کی بیویوں کے ساتھ زنا کرتے ہیں، اپنی بیویاں بنا لیتے ہیں اور داشتائیں رکھتے ہیں۔"

(..that the clergy were all fornicators, committing adultery with men's wives, or having wives and "presbyterissae" of their own.)(6)

---

(1) History of Sacerdotal Celibacy Vol.1, P.436
(2) History of European Morals Vol.2, P.331
(3) The Popes and their church, P.35
(4) A Criminal History of Makind,Pp.212
(5) History of European Morals Vol.2, P.331
(6) History of Sacerdotal Celibacy Vol.1, P.480

قحبہ خانے

پادریوں کی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ قحبہ خانے (چکلے) بھی تھے، انسانی معاشرہ میں کسبیوں کا وجود بہت پرانا ہے اور اسے ہمیشہ بری نظر سے دیکھا گیا ہے، مختلف ادوار میں اس سلسلہ میں سخت قوانین بھی نافذ ہوتے رہے لیکن ہمیشہ الحاد پسند قائدین کی نرم مزاجی اور عیش پرست پیشواؤں کی حجت بازی کی وجہ سے سارے قوانین بے معنی ثابت ہوتے رہے، ارباب کلیسا نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اصلاحی کام بھی کیے تھے اس لیے ان سے قطعی طور پر یہ امید تھی کہ وہ قحبہ خانوں پر پابندیاں عائد کر کے معاشرہ کو اس لعنت سے پاک کریں گے یا کم از کم اس کی شناعت بیان کر کے اس کے بڑھتے زور کو کم کریں گے۔ لیکن عملی طور پر یہ طبقہ بھی بداخلاقی و فحاشی کا قائل تھا، اس کی متعدد مثالوں میں بہترین مثال ہمیں معروف و مشہور پوپ سینٹ آگسٹائین (St.Augustine) کی ذات میں ملتی ہے، جو پولس کے بعد تعمیر کلیسائیت کا سب سے بڑا ذمہ دار تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا کہنا تھا:

''جس طرح ایک جلاد خواہ اس کا پیشہ کتنا ہی قابل نفرت و حقارت ہو سوسائٹی کے لیے ناگزیر ہے اسی طرح کسبیاں جن کا پیشہ خواہ کتنا ہی ذلیل و نفرت انگیز ہو نظام معاشرت کے لیے ضروری ہیں، آج تم کسبیوں کو دور کر دو گے تو کل ہی تمام دنیا شہوات نفسانی سے پر ہو جائے گی۔''(۱)

تاریخ کلیسا کا یہ ایک تاریک باب ہے کہ ارباب کلیسا قحبہ خانوں میں نہ صرف داد عیش دیا کرتے تھے بلکہ مختلف قحبہ خانوں کی سرپرستی بھی کیا کرتے تھے، کلیسا کی آمدنی کے مختلف ذرائع میں قحبہ خانوں کا بھی ایک کردار تھا۔ چنانچہ ''سخت گیر مصلح'' کی حیثیت سے مشہور پوپ سکسٹس چہارم (Sixtus IV) کے عہد میں ایسے قحبہ خانوں سے سالانہ دس ہزار پونڈ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ (۲)

تقریباً 1500 عیسوی تک لندن میں پادریوں کی عیش پرستی کے لیے خصوصی قحبہ خانے (Special Brothels) بھی پائے جاتے تھے، جبکہ سولہویں صدی کے فرانس اور روم میں پادریوں کی خدمت کے لیے ہزاروں فاحشہ عورتیں اور بدکردار لڑکے موجود تھے۔ اس کے علاوہ پورے یورپ میں داشتائیں رکھنے اور کلیسائی عہدے فروخت کرنے کا رواج عام ہو چلا تھا۔ (۳)

ارباب کلیسا کے اخلاق سوز، حیا سوز بلکہ انسانیت سوز حالات بیان کرنے کے بعد تاریخ کلیسا کا مشہور و بالغ نظر مصنف ''ہنری لی'' (Henry Lea) یہ تسلیم کرتا ہے:

---

(۱) ترغیبات جنسی از نیاز فتح پوری: ۱۷۳ (۲) عیسائیت تجزیہ و مطالعہ از پروفیسر ساجد میر: ۴۴۶

(3) Civilisation in the West by Crane Brinton, P.179

"The records of the Middle Ages are accordingly full of the evidences that indiscriminate license of the worst kind prevailed throughout every rank of the hierarchy."(1)

(قرون وسطی کا تاریخی رکارڈ اس امر کی بھرپور شہادت دیتا ہے کہ کلیسائی حکام کے تمام درجوں کے افراد، بلا بندش بدترین قسم کی اخلاقی خرابیوں میں مبتلا تھے)

ارباب کلیسا کی بداخلاقی و بے راہ روی کے نتیجہ میں روم کا پورا معاشرہ جنسی تعفن کا شکار ہوگیا اور اس میں سڑاہن پیدا ہوگئی، ساری اخلاقی بندشیں ٹوٹ گئیں، عریانیت فیشن بن گئی، اور سماج کا ہر طبقہ ہوا و ہوس کی گرداب میں پھنس گیا۔

اہل کلیسا کی صدیوں پر محیط ہوس پرستی و اخلاق باختگی کا مختصر جائزہ لینے کے بعد کھلے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بدکاری اور داشتائیں رکھنے میں کوئی بھی مذہب مسیحیت کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس لیے نام نہاد روشن خیال مفکرین کو مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کو کثرت ازدواج کا طعنہ دیتے ہوئے شرم محسوس کرنی چاہیے۔

---

(1) History of Sacerdotal Celibacy V.1, P.423

رہبانیت اور مسیحی معاشرہ

رومی معاشرہ صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے سنگین اخلاقی وسماجی برائیوں کا شکار ہو چکا تھا، شہوانیت، بدکرداری اور دنیا پرستی اس معاشرہ کی نمایاں صفات بن چکی تھیں، اخلاقی قدریں مٹ چکی تھیں، رشتوں کا تقدس پامال ہو چکا تھا، خاندانوں کا شیرازہ منتشر تھا، اذیت رساں کھیل وتماشا محبوب مشغلہ بن چکا تھا، اور سب سے بڑھ کر پرتعیش زندگی کی ریس میں معاشرہ کا ہر فرد بس دوڑا چلا جا رہا تھا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رومی معاشرہ کی اخلاقی صورتحال اس طرح بیان کی ہے:

''اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا، تھیٹروں میں بے حیائی وعریانی کے مظاہرے ہونے لگے، ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہو گئیں، قحبہ گری کے کاروبار کو فروغ نصیب ہوا، قیصر ٹائبریس (37-14ء) کے عہد میں معزز خاندان کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آ گئی، فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی، عورتوں اور مردوں کے برسرعام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا، رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام وخواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ وکنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔''(۱)

رومی معاشرہ میں زندگی کا معیار اور اس کی موشگافیوں کی صورت حال کا نقشہ کچھ اس طرح تھا کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ:

''زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو غلام اور جانور نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس وپوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزء بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا، یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام وخاص اور امیر وغریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا، ہر شہری پر یہ پرتکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم

---

(۱) پردہ از مولانا مودودی: صفحہ:۱۹

وافکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔"(۱)

نفسانی خواہشات اور دنیوی بندشوں میں جکڑا ہوا یہ وہ معاشرہ تھا جسے حقیقی مسیحائی کی ضرورت تھی، اور حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں یقیناً معاشرہ کی ان تمام بیماریوں کا مداوا موجود تھا لیکن پولس اور پھر ارباب کلیسا نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو یکسر مسخ کر دیا، اعتدال کی جگہ انتہا پسندی کی راہ اختیار کی اور جو مسیحیت دنیا کے سامنے پیش کی اس نے معاشرہ کی بیڑیوں کو اور بھی تنگ کر دیا۔

بائبل (عہد جدید) کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ اُس کی بہت سی تعلیمات غیر فطری (Un-Natural) اور غیر سماجی (Anti-Social) ہیں اور ان پر جہالت (Prinidtiveness) کی واضح چھاپ موجود ہے، اور ایسی تعلیمات پر کسی بھی انسانی معاشرہ کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

شادی بیاہ کے سلسلہ میں بائبل کی تعلیمات "غیر سماجی" اور عورتوں کو "شجر ممنوعہ" سے کم نہ سمجھنے کی ہدایات "غیر فطری" ہیں، اس کے منفی ومضر اثرات سے مسیحی معاشرہ کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکا، ہمیشہ وہ افراط وتفریط کا شکار رہا اور معاشرہ کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا۔

ارباب کلیسا نے ظاہری طور پر عورتوں کے سلسلہ میں نہایت ہی سخت موقف اختیار کیا، ہر طرح کی دینی وروحانی ترقیات میں سب سے بڑی رکاوٹ عورت کو ہی ٹھہرایا، گرچہ خود ان کی زندگیاں عورتوں کے جنسی استحصال سے عبارت رہی ہیں تاہم عام مسیحیوں نے کلیسا کی ان ہدایات کو پوری سنجیدگی سے اختیار کیا اور عورت کی محبت اور اس کے ساتھ انسجام کو سب سے بڑی ہلاکت کا باعث گردانا، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جوشیلے نوجوانوں میں نفس کشی اور تجرد کا عمومی رجحان پیدا ہونے لگا۔

مسیحی تعلیمات میں اجتناب عورت کے ساتھ ترک دنیا اور زہد پر بھی مبالغہ آمیز زور دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے بائبل کہتی ہے:

"میں تم سے کہتا ہوں کہ تم کو غذا کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اور بدن کو ڈھانکنے کے لیے ملبوسات کے لیے تم فکر مند نہ ہونا۔"(۲)

ایک دوسری جگہ یہ ہدایت بھی موجود ہے:

"اگر تم چاہتے ہو کہ میری پیروی کرو تو پہلے تم کو تمہارے پاس کی ہر چیز کو چھوڑنا ہوگا، ورنہ میرے شاگرد نہیں ہو سکتے۔"(۳)

---

(۱) حجة الله البالغة باب اقامة الارتفاقات واصلاح الرسوم /۱۰۵ (طبع دیوبند)
(ترجمانی: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم)
(۲) متی/۶:۲۵
(۳) لوقا/۱۴:۳۳

مسیحیت کا بانی پولس اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

''وہ لوگ یسوع مسیح کے ہیں جنھوں نے اپنی خواہشات کو اپنی خودغرضی کو برائیوں کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا ہے۔''(۱)

مسیحیت کی ان مبالغہ آمیز تعلیمات کا تعلق انسان کی ذات کے اندرون سے بھی تھا اور اس کی ذات سے باہر معاشرتی زندگی سے بھی، چنانچہ اردگرد کی برائیوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے پستی و خودسپردگی اختیار کرنے کو محبوب قرار دیا گیا ہے:

''میں تم سے جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ برے کے مقابلہ کھڑے نہ ہو، اگر کوئی تمہارے سیدھے گال پر تھپڑ مار دے تو اس کے لیے دوسرا بایاں گال بھی پیش کردو، اگر کوئی تم سے کرتا لینے کے لیے تم کو عدالت میں کھینچ لے جائے تو تم اس کو اپنا چوغہ بھی دے دو، اگر کوئی تم کو زبردستی ایک میل بیگار چلنے کے لیے کہے تو اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ۔''(۲)

بائبل کی ان مبالغہ آمیز تعلیمات کے نتیجہ میں ایسے لوگ کثرت سے پیدا ہوئے جنھوں نے عورتوں کے سایہ سے بھی خود کو دور رکھا، دنیا کی ہر نعمت سے آنکھیں موند لیں، اور معاشرہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کر کے اپنی پوری زندگی ''رہبانیت'' کے حوالہ کردی۔

رہبانیت کیا ہے؟

نفسانی لذتوں و دنیوی نعمتوں اور سماجی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو کر کسی غار کی خلوت یا جنگل کی تنہائی میں غیر معمولی ریاضت و نفس کشی کے ذریعہ وصال حق کی جستجو و کوشش ''رہبانیت'' (Monachism) کہلاتی ہے۔

مسیحیت کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی، شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے اور اناجیل اربعہ عمومی ہدایات و رہنمائی کی صفات سے خالی تھیں، چنانچہ مسیحی علماء کچھ عمومی فلسفیوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود کے رجحانات کو دلیل بنا کر طرح طرح کی بدعتیں ایجاد کرتے چلے گئے، رہبانیت بھی انہیں بدعات میں سے ایک بدعت تھی۔

اگرچہ رہبانیت کی ایجاد رضائے الٰہی کے حصول کے جذبہ اور ترقیات روحانی کے مقصد سے ہوئی تھی لیکن افسوس کہ کسی بھی ناحیہ سے اس کے مطلوبہ تقاضے پورے نہ ہو سکے، کیونکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات اور ان کے طریقۂ حیات کی روشنی میں نہ تھی، اس لیے اس نظام حیات کا فلسفہ شروع سے ہی گنجلک رہا اور اس میں بے جا شدت اور جسمانی و روحانی تشدد سے کام لیا جاتا رہا۔

قرآنی نقطۂ نظر سے یہ طرز زندگی خود انھیں کا اختیار کردہ تھا، اللہ رب العزت کی طرف سے نہ یہ نافذ کیا گیا تھا

---

(۱) گلتیوں کے نام خط/۵:۲۴ (۲) متی/۵:۳۹-۴۱

اور نہ اس کی تحسین کی گئی، قرآنی وضاحت ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ﴾

(اور رہبانیت کو انھوں نے رضائے الٰہی کی چاہ میں خود ایجاد کرلیا تھا، اس کو ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا)

(الحدید:۲۷)

رہبانیت کا سلسلہ

ارباب کلیسا نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا اور دین کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا، ان کی زندگی میں بائبل کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ تھا، ان کے اخلاقی تعفن کی وجہ سے مسیحی معاشرہ کی فضا مسموم ہورہی تھی، اسی بگڑی ہوئی صورتحال کے خلاف رہبانیت ایک صدائے احتجاج تھی، جو اپنے آغاز اور نشوونما میں کلیسا کی بالکل محتاج نہیں تھی۔

رہبانیت کی ابتدائی معلوم تاریخ ہندستان میں مہاتما گوتم بدھ سے جاکر ملتی ہے، اس کے اثرات حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل حضرت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگیوں میں بھی ملتے ہیں لیکن اس رہبانیت کی حیثیت محض عبادت کے لیے یکسوئی اور دنیوی آلائشوں سے دور رہ کر تزکیہ نفس کی تھی، اس طریقۂ عبادت کو دیگر اقوام نے بھی قبول کیا لیکن وہ افراط وتفریط کا شکار ہوتے گئے، البتہ اسے شہرت دائمی مسیحیت کے حوالہ سے ملی جہاں اسے پوری شدت کے ساتھ نافذ کیا گیا، اور اس میں ایسے اصول وضوابط متعین کیے گئے جو فطری وطبعی تقاضوں سے یکسر مختلف تھے۔

مسیحی دنیا میں رہبانیت کا آغاز تیسری صدی عیسوی میں ہوا جب اس کی بازگشت مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی مصر کے صحراؤں میں گونجی، اور 285ء میں ایک پادری سینٹ اینتھونی (St.Anthony) نے طریقۂ بندگی کی راہ اختیار کی اور مسیحی تاریخ کا پہلا راہب (Monk) تسلیم کیا گیا۔

سینٹ اینتھونی رہبانیت کو اختیار کرنے کے بعد ریگستان کے ایک ویرانے میں چلا گیا تاکہ اسے تنہائی ویکسوئی حاصل ہوسکے، اس دوران اسے عورتوں کے خیالی خاکے کچوکے لگاتے رہے، بھوت پریت کا وہم اسے ہراساں کرتا رہا، کھانے پینے کی لذتیں اسے ترغیبات میں مبتلا کرتی رہیں، درندوں نے اس پر حملے بھی کیے، موسم کی شدت نے نڈھال بھی کیا، لیکن اس کی ثابت قدمی وبے جگری نے اس کی ڈھارس بندھائی اور بیس سال کی مسلسل جانفشانی ونفس کشی کے بعد جب وہ تنہائی کے خول سے باہر نکلا تو رہبانیت کے باب میں ایک جلی عنوان بن چکا تھا، دور دور تک اس کا شہرہ ہوا، عقیدت مندوں کا ہجوم ہوا، حق کے متلاشی اس کے خوشہ چیں بنے، دنیا کے بیزار اس کے گرد جمع ہوئے، لوگوں نے اس کی تقلید کی، اور اس طرح رہبانیت کو فروغ ملا۔ (۱)

---

(۱) تاریخ کے پانچ ادوار از ولیم میک گاگی صفحہ: ۲۲۵

تھوڑی ہی مدت میں رہبانیت کے اثرات عالمگیر ہونے لگے، اور مصر کے بعد اس کی ہوا تمام مسیحی ممالک میں چلنے لگی اور اس نظام کے ماہرین نے دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اس کا حلقہ بگوش بنایا، اس بڑھتی مقبولیت کو دیکھ کر کلیسا نے بھی اس کی حمایت کر دی، اور پھر اس نظام کو منظم خطوط پر چلایا گیا چنانچہ:

"سینٹ اتھینیس (St.Athanasius) و سینٹ زینو (St.Zeno) نے اسے اٹلی میں روشناس کیا، پھر سینٹ جروم (St.Jerome) نے اسے اپنے یہاں خوب ترقی دی۔

سینٹ ہلرین (St.Hilarion) نے اس کی تخم ریزی فلسطین میں کی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہزار ہا شخص اس حلقہ میں داخل ہو گئے اور اس کا دائرہ سائپرس (Cyprus) تک وسیع ہو گیا۔

آرمینیا (Armenia) اور اس کی مضافات میں اسے سینٹ ایوستھیس (St.Eustathius) نے پھیلایا۔

دریائے ایوکسین (Euxine) کے کنارہ سینٹ باسل (St.Basil) نے اس کی اشاعت کی۔

اور گال (Gaul) میں اس کی بنا سینٹ مارٹین (St.Martin) کے ہاتھوں پڑی، پھر صدہا نامعلوم الاسم مشنریوں نے اسے حبش، جزائر بحر روم، آئرلینڈ اور ویلس (Wales) میں رواج دیا۔ (1)

رہبانیت کی اشاعت اُسی قدر تیز یا اُسی قدر سست تھی، جتنی خود تحریک مسیحیت کی تھی، اُس وقت کے کل زاہدوں کا مجموعی شمار ظاہر ہے کہ مؤرخین کے اختلاف بیان کے باعث قطعی طور پر نہیں معلوم ہو سکتا، تاہم اس کا اندازہ اعداد ذیل سے ہو سکتا ہے:

"سینٹ پکومیس (St.Pachomius) کے زیر تربیت سات ہزار (7000) راہب تھے۔

سینٹ جروم (St.Jerome) کے زمانہ میں ایسٹر (Easter) کی تقریب میں تقریباً پچاس ہزار (50,000) راہبوں کا مجمع تھا۔

چوتھی صدی میں اکیلے صحرائے نٹریا (Nitria) میں صرف ایک راہب کی ماتحتی میں پانچ ہزار (5000) راہب تھے۔

مصر کے ایک شہر کی ساری آبادی انہیں لوگوں کی تھی اور ان کی تعداد دس ہزار (10,000) راہبوں اور (20,000) راہبات کی تھی۔

سینٹ سراپین (St.Serapion) کی ماتحتی میں تقریباً دس ہزار (10,000) راہب تھے۔

اور چوتھی صدی کے خاتمہ پر تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جتنی خود مصر کے شہریوں کی آبادی تھی تقریباً اسی قدر ان راہبوں کی تھی۔" (2)

خانماں خرابی

راہبوں کا مقصود زندگی تمام تر یہ ہوتا تھا کہ خود انھیں نجات اُخروی حاصل ہو، انھیں اس سے کوئی غرض نہ

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.106

(2) History of European Morals, Vol.2, P.105

تھی کہ ان کے متعلقین و متوسلین جئیں یا مریں، ترک خانماں و قطع تعلقاتِ خانگی ان کے نزدیک اعلیٰ ترین صفت تھی، جس کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں، دلوں سے والدین کا احترام واجب کافور ہوگیا، بیویوں کے حقوق پامال ہوئے، اولادیں لاوارث اور دوسروں کے رحم وکرم کی محتاج ہوئیں، اور ان باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا بلکہ وہ اسے اپنی معراج سمجھتے اور اس پر مطمئن رہتے تھے۔

علم الانسان (Anthropology) کے مستند قلم کار فریزر (Frazer) نے ان راہبوں کے سلسلہ میں بالکل درست لکھا ہے:

"In their anxiety to save their own souls and the souls of others, they were content to leave the material world, which they identified with the principle of evil, to perish around them."(1)

(اپنی اور دوسروں کی روحوں کو بچانے کی فکر میں وہ دنیا کی مادی زندگی کو جسے وہ برائی کی جڑ سمجھتے تھے اپنے اردگرد فنا ہوتا ہوا دیکھ مطمئن ہوتے تھے)

سینٹ جروم (St.Jerome) لوگوں کو نہایت مؤثر و بلیغ اسلوب میں راہبانہ زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا تھا، ایک شخص کو ترک تعلقات خانگی کی دعوت اس انداز میں دیتا ہے:

"Though your little nephew twine his arms around your neck; though your mother, with dishevelled hair and tearing her robe asunder, point to the breast with which she suckled you; though your father fall down on the threshold before you, pass on over your father's body. Fly with tearless eyes to the banner of the cross. In this matter cruelty is the only piety... Your widowed sister may throw her gentle arms aronnd you... Your father may implore you to wait but a short time to bury those near to you, who will soon be no more; your weeping mother may recall your childish days, and may point to her shrunken breast and to her wrinkled brow. Those around you may tell you that all the household rests upon you. Such chain as these, the love of God and the fear of hell can easily break. You say that Scripture orders you to obey your parents, but he who loves them more than Christ loses his soul."(2)

(تمہارا ننھا بھتیجا تمہارے گلے میں باہیں ڈال دے گا، تمہاری ماں آنسوؤں کا تار باندھ دے گی، اپنے احسانات کو یاد دلائے گی، اپنے کپڑے اور بال نوچ نوچ کر اپنے حقوق پر توجہ دلائے گی، تمہارا باپ اپنے تئیں تمہارے قدموں پر

---

(1) The Golden Bough, By Sir James Frazer,p.319

(2) History of European Morals, Vol.2, P.134,135

CamScanner

گرادے گا،لیکن تمہیں چاہیے کہ اس کے جسم کو پامال ہوجانے دو اوران میں سے کسی شے کی پروانہ کرو،تمہاری بیوہ ہمشیر تمہارے گرد پروانہ ہوجائے گی، تمہارے والد یہ کہیں گے کہ میری موت کے وقت تک اپنا ارادہ ملتوی رکھو،تمہاری والدہ روتے ہوئے بچپن کی شفقتیں یاد دلائے گی اور اپنے خمیدہ و ناتواں جسم کا واسطہ دے گی،اعزہ یہ سمجھائیں گے کہ خاندان کا شیرازہ صرف تمہاری ذات سے قائم ہے،لیکن تمہیں ان میں سے کسی شے کی پرواہ نہ ہونی چاہیے،تمہارے کان میں مسیح کی صدا آرہی ہے،اُس کے مقابلہ میں تمہیں کسی اور آواز سے متاثر نہ ہونا چاہیے،مسیح کی محبت اور جہنم کے خوف کے سامنے ساری محبتیں اور رشتہ داریاں ہیچ ہیں)(۱)

رہبانیت کا یہ بنیادی اصول تھا کہ عورت سے بالکل دور رہا جائے اور دنیا کے تعلقات کو بالکل ترک کر دیا جائے،اس سلسلہ میں راہبوں نے جس قساوت قلبی اور سنگدلی کو اپنا رکھا تھا اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

☆ سینٹ بیسل (St.Basil) نے بجز کسی شدید ترین مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

☆ سینٹ جان (St.John) نے اڑتالیس (48) سال تک کسی بھی عورت کی صورت نہیں دیکھی بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہوکر اُس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر وہ اُسے دیکھنے نہیں آئے گا تو وہ اپنی جان دیدے گی،یہ سُن کر اس نے یہ جواب دیا کہ آج رات کو بس وقت تم اپنی خواب گاہ میں ہوگی میں آؤں گا،اور اس وعدہ کا ایفاء یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اُسے خواب میں دیکھ لیا۔

☆ رومہ کی ایک خوش عقیدہ لڑکی کی آرزو سینٹ آرسینیس (St.Arsenius) کی زیارت کرنے اور اس سے دعا لینے کی تھی،وہ اٹلی جیسے دور دراز مقام سے سفر کر کے اسکندریہ پہنچی،بڑی مشکل سے اُسے راہب کے یہاں باریابی نصیب ہوئی،اُس نے شدت الحاح وزاری سے التجا کی کہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔یہ سنتے ہی راہب آپے سے باہر ہوگیا اور نہایت غضب ناک ہوکر بولا کہ تجھے یاد رکھوں!اب ساری عمر اس دعا میں صرف ہوگی کہ تجھے بھلادوں۔بیچاری وہ لڑکی مایوس ہوکر اسکندریہ کے لاٹ پادری کے پاس گئی،پادری نے راہب کے ارشاد کی یوں تاویل کی کہ وہ تجھے بھلادے گا لیکن تیری روح کو ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھے گا۔

☆ مشہور راہب سسولیس (St.Sisoes) جب نہایت ضعیف اور اپاہج ہوگیا تو اُس کے تلامذہ و رفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل کو چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرلے تاکہ اس کی تیمارداری میں آسانی ہو،اس نے اس شرط کے ساتھ یہ درخواست قبول کی کہ وہ بستی ایسی ہو جس میں کبھی کسی عورت سے رُوبرو ہونے کا احتمال نہ رہے،چونکہ ایسی بستی کا وجود ناممکن تھا اس لیے وہ آخری دم تک بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا۔

---

(۱) ترجمانی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (تاریخ اخلاق یورپ)

☆ ایک راہب کو کسی شدید مجبوری کی وجہ سے اپنی والدہ کے ساتھ سفر کرنا پڑا، راستہ میں ایک چشمہ پڑا جس پر کوئی پل نہ تھا، اس راہب نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ اور پورے جسم کو کپڑے میں کس کر لپیٹنا شروع کیا، اس کی ماں نے حیرت زدہ ہو کر اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ تمہیں کاندھے پر اٹھا کر اس کو پار کرنا ہے، ڈر ہے کہ اگر کہیں میرا جسم تمہارے جسم سے مَس ہو گیا تو میری ساری محنت رائیگاں ہو جائے گی۔

☆ سینٹ مارکس (St.Marcus) کی والدہ اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھی، لیکن مارکس کسی بھی صورت ملنے کو تیار نہ تھا، والدہ کے اصرار پر مارکس کے شیخ نے ملنے کی ہدایت دی، جس سے مارکس کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ یا تو شیخ طریقت کی حکم عدولی کرے یا ماں کا چہرہ دیکھنے کی معصیت کا ارتکاب کرے، لیکن اس سنگدل نے اس کی ترکیب یوں نکالی کہ پہلے اس نے اپنا حلیہ تبدیل کیا، آنکھوں پر پٹی باندھی اور پھر اپنی ماں کے سامنے سے اس طور پر گذر گیا کہ وہ اس کو پہچان بھی نہ سکی۔

☆ سینٹ سیمون (St.Simeon) نے رہبانیت اختیار کی اور وہ گھر بار چھوڑ کر جنگل کو چلا گیا، گھر والوں کو بھی اس کی خانقاہ کا کوئی علم نہ تھا، باپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ فوت ہو گیا، ماں نڈھال رہی، جب 27 سال کا طویل عرصہ گذر گیا تو اسے راہب کی قیام گاہ کا پتہ معلوم ہوا، وہ ملاقات کے لیے خود جنگل گئی، بیٹے سے ملنے کے لیے خوشامدیں کیں، آہ وزاریاں کیں، لیکن سب بے کار گئیں اور اس نے کسی بھی طرح ملاقات کی ہامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزری جاتی ہے تو یہ کہہ لا بھیجا کہ میں عنقریب ہی ملنے آؤں گا، تین شبانہ روز گذر گئے لیکن وعدہ وفا نہ ہوا اور اس بے چاری نے فرط یاس میں اسی کے در آستانہ پہ دم توڑ دیا۔ (1)

نظام رہبانیت میں شدت پسندی کا ترجمان یہ نظریہ تھا کہ جو شخص اپنی ماں اور اپنے باپ کی دل شکنی برداشت کر سکتا ہے وہی بڑی سے بڑی ریاضتیں بھی جھیل سکتا ہے اور جو اس ضمن میں کمزور پڑتا ہے وہ بڑی محرومی کا شکار ہوتا ہے، اس سلسلہ کے داعی و پُر زور وکیل سینٹ گریگوری (St.Gregory) کے حوالہ سے یہ روایت ملاحظہ ہو:

"St. Gregory, the Great, assures us that a certain young boy, though he had enrolled himself as a monk, was unable to repress his love for his parents, and one night stole out secretly to visit them. But the judgment of God soon marked the enormity of the offence. On coming back to the monastery, he died that very day, and when he was buried, the earth

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.120-130

refused to receive so heinous a criminal. His body was repeatedly thrown up from the grave, and it was only suffered to rest in peace when St. Benedict had laid the Sacrament upon its breast."(1)

(سینٹ گری گوری روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنی صغرسنی سے راہب بن گیا تھا مگر والدین کی محبت ہنوز اس کے دل سے نہیں نکلی تھی آخر ایک روز خفیہ طور پر وہ ان کی ملاقات کے لیے چلا گیا اس جرم پر غضب الٰہی یوں نازل ہوا کہ جوں ہی لوٹ کر آیا مر گیا۔ اور جب نعش دفن کی جانے لگی تو زمین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ متعدد ناکام کوششوں کے بعد جب سینٹ بنی ڈکٹ نے اس کے سینہ پر تبرکات رکھے ہیں تب تدفین ہو سکی۔)

ایذائے جسم وجاں

رہبانیت کے پرستاروں نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا تھا کہ جنسی تقاضائی نفسہ ایک معصیت کبیرہ ہے، کیونکہ یہ تقاضا دیگر جذبات حسد وغضب وغیرہ کی طرح عارضی و ہنگامی نہیں ہوتا، بلکہ دل کے نہاں خانوں میں رہ رہ کر مستقل چٹکیاں لیا کرتا ہے اور حق کے متلاشی کو اسے ہر وقت دبائے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ اول تو نفس انسانی خود بدی و بدکاری کی جانب مائل ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیا کی ہر لذت انسان کو معصیت پر آمادہ کرتی ہے، لہٰذا ہر لذت معصیت ہے۔ اس اعتقاد کے قائم ہونے کے بعد راہبوں نے نہ صرف دنیا کی لذتوں سے یکسر منہ موڑ لیا بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنے کے لیے اس پر طرح طرح کی بندشیں بھی عائد کیں اور اپنے جسم کو سخت ترین اذیتوں میں جکڑ دیا، اس طرح اخلاق کا یہ معیار قائم ہو گیا کہ جو جتنا زیادہ جسم کو مبتلائے آزار وتکلیف رکھے گا اُسی قدر روحانی ترقی حاصل کرے گا۔

چنانچہ ان راہبوں نے جو زندگی اختیار کی وہ فطرت انسانی کے خلاف کھلم کھلا بغاوت تھی، معاشرت کی سرگرمیوں کو چھوڑ کر انھوں نے جنگلوں کی رہ لی، ان کے مسکن علی العموم اُس وقت مکانات نہیں ہوتے تھے، بلکہ وحشی درندوں کے غار، خشک کنوئیں یا قبرستان ہوتے تھے، اور اس میں ان کے حجرے خوف و دہشت کدے جہاں شیاطین کے وسوسہ اندازی کا خوف، عالم آخرت کی دہشت، آہ واشک باری، نالہ وفریاد کے ڈراونے مناظر ہوتے تھے۔

بعض راہب کسی بھی قسم کا لباس استعمال نہیں کرتے تھے، ستر پوشی کا کام اپنے جسم کے بڑے بالوں سے لیتے تھے، نیز بعض جاہل، اپاہج وکندۂ ناتراش راہب ایسے بھی ہوتے تھے جو دنیا کی جدوجہد سے رہبانیت کی پناہ میں آجانا غنیمت جانتے تھے اور اپاہج پن کی زندگی پڑے پڑے گزارا کرتے تھے۔

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.135

ذیل میں ایذائے جسم وجاں کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

☆ سینٹ میکریس اسکندری (Macarius of Alexandria) کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک برابر ایک دلدل میں سوتا رہا تا کہ اس کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈسیں، اس کے علاوہ وہ ہمیشہ ایک من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتا تھا۔

☆ سینٹ یوسیبس (St.Eusebius) ہمیشہ تقریباً دو من لوہے کا وزن اپنے اوپر لادے رہتا تھا اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں کے اندر مقیم رہا۔

☆ سینٹ سیبنس (St. Sabinus) ہمیشہ وہ غلہ استعمال کرتا تھا جو ایک مہینہ تک پانی میں پڑے پڑے سڑ گیا ہو۔

☆ سینٹ بیسرین (St.Besarion) نے چالیس شبانہ روز سخت خاردار جھاڑیوں کے اندر گزارے اور چالیس سال تک سونے کے وقت کبھی نہیں لیٹا۔

☆ سینٹ مارسین (St. Marcian) نے یہ عادت ڈال لی تھی کہ رات دن میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا اور وہ بھی صرف اس مقدار میں کہ رشتہ حیات منقطع نہ ہونے پائے، وہ کبھی بستر یا چٹائی پر نہیں سویا بلکہ کبھی استراحت کے طریقہ پر لیٹا ہی نہیں، چنانچہ اکثر فرط بیداری سے یہ حالت ہو جاتی تھی کہ کھانا کھاتے کھاتے اسے نیند کا جھونکا آجاتا اور منہ سے نوالہ بے اختیار گر جاتا۔

☆ سینٹ بیکریس کی بابت روایت ہے کہ وہ ہفتہ بھر فاقہ کرتا تھا اور صرف اتوار کے دن چند کچی جڑی بوٹیاں کھاتا تھا۔

☆ مشہور راہب یوحنا (St.John) کے متعلق منقول ہے کہ وہ مسلسل تین سال تک کھڑے کھڑے عبادت کرتا رہا، اس مدت میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ بیٹھا نہ لیٹا بلکہ جب تھک جاتا تو چٹان پر اپنے جسم کو سہارا دے لیتا اور ہفتہ میں صرف ایک بار کھانا کھاتا، اور کھانا بھی اتوار کے دن کسی کلیسا سے بٹنے والا تبرک ہوتا تھا۔

☆ سینٹ انٹونی (St.Antony) ایک کبیر السن راہب تھا اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پوری عمر اپنے پیر دھونے کے عصیاں کا مرتکب نہیں ہوا۔

☆ کنواری سلویا (Silvia) ایک مشہور راہبہ تھی، اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی، وہ بارہا کثافت کے باعث سخت بیمار ہوئی، لیکن کبھی بجز اپنی انگلیوں کے جسم کے کسی بھی حصہ میں پانی نہیں لگنے دیا۔

☆ سینٹ ایوفریکسیا (St.Euphraxia) ایک سو تیس (130) راہبات کی ایک ایسی جماعت میں شریک ہوئی، ان کنواریوں کا اصول یہ تھا کہ وہ کبھی اپنے پیر تک نہیں دھوتی تھیں اور غسل کے نام سے تو لرز اٹھتی تھیں۔

☆ مصر کی سینٹ میری (St.Mary) اپنے زمانہ میں ایک بہت حسین عورت تھی اس نے اپنے گناہوں کا کفارہ یوں کیا کہ پورے سینتالیس (47) سال تک اپنے جسم کے کسی بھی حصہ پر پانی نہیں لگنے دیا۔

بعض زاہد کبھی جرأت کر کے صفائی جسم پر اگر کبھی توجہ کرنے بھی لگتے تو اُن پر سخت لعن ہوتی۔ چنانچہ راہب الگزنڈر (Alexander) نہایت تاسف وتحیر میں کہا کرتا تھا:

"Our fathers never washed their faces, but we frequent the public baths."

(ہمارے باپ دادا نے کبھی اپنا منہ نہیں دھویا، اور ایک ہم لوگ ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں) (1)

جو راہب دنیا بیزاری اور نفس کشی میں جتنی زیادہ ترقی کرتا جاتا تھا، وہ اُسی قدر جسمہ عفونت وغلاظت ہو جاتا تھا، اس عنوان سے بہت سے راہبوں نے شہرت حاصل کی البتہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ شہرت سینٹ سمیون (St.Simeon) کو حاصل ہوئی جس کے متعلق بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر غلاظت ونجاست کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

سینٹ سمیون (St.Simeon) کا واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے، اس نے اپنے جسم کو ایک رسی سے اس قدر مضبوطی سے باندھ رکھا تھا کہ وہ رسی گوشت کی گہرائی میں پیوست ہوگئی تھی جس سے پوار گوشت سڑنے لگا تھا، زخموں کے اندر کیڑے پڑ چکے تھے جو رینگنے اور ٹپکنے لگے تھے، اس کی سڑاہند میں اس قدر تعفن تھا کہ پاس بیٹھنے والا اپنی ناک کھول نہیں سکتا تھا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ چھوڑ کر ایک خشک کنویں میں رہنے لگتا جسے شیاطین کی بستی کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنے لیے تین منارے بھی بنوائے تھے جن میں ایک ساٹھ (60) فٹ بلند اور صرف دو (2) گز چوڑا تھا، وہ اس کے اوپر تیس (30) سال تک سکونت گزیں رہا، حالات کی ناہمواری اور موسم کی خرابی کسی بھی چیز کا اس پر اثر نہیں پڑا، وہ اکثر نہایت تیزی سے سجدے کرتا، ایک شخص نے جب اس کے سجدوں کو شمار کرنا چاہا تو وہ بارہ سو چوالیس (1244) تک شمار کر کے تھک گیا۔ اس کے علاوہ وہ پورے ایک سال تک صرف ایک پیر کے بل کھڑا رہا اور اس کا دوسرا پیر زخموں سے چور ہو کر ناسور بن گیا، ایک مُرید کو جو ہر وقت پاس ہی رہتا تھا اسے یہ ہدایت تھی کہ جوں ہی اس زخم سے کوئی کیڑا نکل کر گرے اُسے پھر اُٹھا کر اُسی جگہ پر رکھ دے، اور وہ خود اُس کیڑے سے کہتا: "Eat what God has given you" (خدا نے تجھے جو رزق دیا ہے اسے کھا) ان حالات کو سُن سُن کر صدہا زائرین دور دراز ممالک سے اس کی زیارت کو آتے تھے۔ (2)

رہبانیت کا یہ پہلو نظام زندگی سے فرار اور غایت درجہ ایذائے جسم وجاں تھا جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ جب

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.108-111

(2) History of European Morals, Vol.2, P.112

اکثر راہب یہ دیکھتے کہ لذائذ دنیوی اب ان کے ترک کیے نہیں ترک ہوتے یا جذبات وشہوات پر انہیں قابو حاصل نہیں ہو پاتا اور انھیں وساوس شیطانی سے نجات نہیں مل پا رہی ہے، تو ان سب حالتوں میں وہ سخت مایوسی کا شکار ہوتے اور اس مایوسی کا علاج وہ خودکشی ہی کو قرار دیتے تھے۔

افراط وتفریط اور غلو پسندی سے بھری ہوئی یہ وہ رہبانیت تھی جسے انھوں نے خود اختیار کیا تھا، خود انھوں نے اس کے اصول متعین کیے، اس کے مراتب طے کیے، اور اس کی راہیں متعین کیں لیکن وہ خود نہ اس کی رعایت کر سکے اور نہ اس پر عمل پیرا ہو سکے، بلکہ اس نظام سے پورا معاشرہ متعفن ہو گیا، اسی حقیقت کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:

﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (اور انھوں نے اس کی مکمل رعایت (بھی) نہ کی)

رہبانیت کا تاریک پہلو

رہبانیت کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا جو نہایت تاریک تھا اور معاشرہ میں بداخلاقی وفحاشی کے فروغ کا حصہ دار تھا، رہبانیت کے پرستاروں نے جو شکلیں اختیار کی تھیں وہ اس قدر دشوار اور پر شدت تھیں کہ ان پر کچھ ہی راہب عمل پیرا ہو سکے، جبکہ اکثریت خود کو سہار نہ سکی اور اخلاق وکردار کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ انہیں راہبوں کے سلسلہ میں قرآن مجید کہتا ہے: ﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (اور ان میں زیادہ تر بدکردار تھے)

حقیقت یہ ہے کہ مسیحی راہب خانے ہر دور میں شہوانیت (Lasciviousness) اور بسیار خوری (Gluttony) نیز دوسری اخلاقی کمزوریوں کی آماجگاہ رہے ہیں۔ دنیا کی نظروں میں عصمت وروحانیت کا چوغہ اوڑھ کر عصمت فروشی کا کاروبار کیا جاتا تھا، جس مرد یا عورت کو تعلق بنانا ہوتا تھا وہ راہب خانہ میں پہنچ جاتا، دنیا کی نظر میں پارسائی بھی قائم رہتی اور جنسی تسکین کا سامان بھی ہو جاتا، اوباش قسم کے راہب دوشیزاؤں کے ساتھ رہتے سہتے اور ایک ساتھ سوتے بھی اور پھر یہ دعویٰ بھی کرتے کہ ہم نے اس قدر ضبط نفس حاصل کر لیا ہے کہ باوجود اس قدر اختلاط کے کبھی جذبہ جنسی کو تحریک نہیں ہوتی:

"Virgins and monks often lived together in the same house, professing sometimes to share in chastity the same bed."(1)

(دوشیزائیں اور راہب اکثر ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے، ایک ہی بستر پہ سوتے اور پارسائی کا دعویٰ بھی کرتے)

رہبانیت کے نظام میں ایک بڑی تعداد راہبات کی بھی تھی جن کے مخصوص مراکز اور خانقاہیں ہوا کرتی تھیں، ان خانقاہوں کے متعلق مسٹر لیکی کے الفاظ ہیں:

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.150

"The writers of the middle ages are full of accounts of nunneries that were like brothels, of the vast multitude of infanticides within their walls."(1)

(قرون وسطی کے اہل قلم کی نگارشات اس بات پر شاہد ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان بن چکے تھے)

آٹھویں صدی میں کلیسائی کونسل نے راہبات کے مراکز کو "انتہائی بداخلاقی کی کیفیت میں مبتلا" (in a condition of gross immorality) قرار دیا تھا(۲)

ایک دوسری کونسل کے نزدیک ان خانقاہوں کے اصلاح کی تمام کوشش ناکام ہو چکی تھی اور ان خانقاہوں کی صورتحال کچھ اس طرح بن چکی تھی:

"Nunneries were brothels, and to take the veil was simply another mode of becoming a public prostitute."(3)

(راہبات کے مراکز فحاشی کے اڈے بن چکے تھے، اور چہرہ پر نقاب ڈالنا (راہبات کا علامتی لباس) درحقیقت طوائف بننے کا دوسرا طریقہ تھا)

حاصل کلام یہ کہ رہبانیت کا نظام ایک غیر سماجی اور غیر فطری نظام تھا، جس نے ممکن ہے چند افراد کی کچھ روحانی اصلاح کی ہو لیکن بحیثیت مجموعی وہ انسانی معاشرہ کے حق میں نہایت تلخ اور شدید نقصان دہ ثابت ہوا، اس کا دعویٰ تو عام انسان کو ایک بہتر انسان یا کم از کم ایک بہتر مسیحی بنانا تھا مگر حقیقت میں اس نے ایسے افراد پیدا کیے جو آدم بیزار اور دنیوی ذمہ داریوں اور قریبی احباب و رشتہ داروں سے بھی متنفر تھے، اور کوئی بھی نظام زندگی ایسے افراد کی تشکیل قطعی نہیں چاہتا۔

اس حقیقت کو ایک مصنف اس طرح بیان کرتا ہے:

"Those who fled to the cell or cloister contributed little to the spiritual elevation of the Church or the spiritual welfare of the masses."(4)

(وہ لوگ جنھوں نے خانقاہ یا حجرہ کی سمت راہ فرار اختیار کی انھوں نے کلیسا کی روحانی بہتری یا عوام کی روحانی ترقی میں کوئی کردار انجام نہیں دیا)

کلیسا کی بے راہ روی، اخلاقی بدحالی اور پھر رہبانیت کی "کرشمہ سازیوں" نے مسیحی معاشرہ کو افراط و تفریط کا

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.331
(2) Sacerdotal Celibacy V.1, P.189
(3) Sacerdotal Celibacy V.2, P.2
(4) Uses of the Past By H.Muller,P.189

شکار کر دیا اور پورا یورپ ثقافتی وتمدنی میدان میں پست سے پست ہوتا گیا:

''اخلاق میں رکاکت وپستی حد درجہ سرایت کر گئی تھی، دربار کی عیش پرستیاں، ارکان دربار کی غلام طینتی اور ملبوسات وزیورات کی تزئین وآرائش اپنے شباب پر تھیں، دنیا اس وقت انتہائی رہبانیت اور انتہائی بدکاری کے تھپیڑوں کے درمیان جھونکے کھا رہی تھی بلکہ بعض شہر جن میں سب سے زیادہ کثیر التعداد زہاد ورا ہبین پیدا ہوئے تھے، وہ وہی تھے جن میں عیش پرستی اور بدچلنی کی سب سے زیادہ گرم بازاری تھی، غرض بدکاری اور توہم پرستی کا ایسا اجتماع ہو گیا تھا جو انسان کی شرافت وعظمت کا قطعی دشمن ہے، رائے جمہور اس قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ لوگوں کو بدنامی ورسوائی کا مطلق خوف نہیں باقی رہا تھا، البتہ ضمیر کو مذہب کا دھڑکا ہو سکتا تھا، لیکن اُسے بھی اِس اعتقاد نے مٹا دیا تھا کہ دعاؤں وغیرہ کے ذریعہ سے سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ مکاری، دغا بازی، دروغ گوئی کی وہ گرم بازاری تھی جو قیاصرہ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔''(۱)

---

(1) History of European Morals, Vol.2, P.154
(ترجمانی: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ-تاریخ اخلاق یورپ)

CamScanner

کلیسا اور اسلام

ساتویں صدی کی دنیا دو عظیم طاقتوں پر مشتمل تھی، بازنطین یعنی رومن امپائر اور پرشیا یعنی ایرانی سلطنت۔ یہ دونوں طاقتیں مکمل تہذیبیں تھیں جن کی اپنی ثقافت، اپنی تاریخ، اپنی زبان اور اپنی قدیم شہنشائیت تھی، تاہم یہ دونوں سلطنتیں شرافت واخلاق کی اعلیٰ قدروں سے خالی اور انسانیت کی صفات اور آدمیت کے احساس سے بالکل عاری تھیں، اور جہالت کی ایسی گھٹاٹوپ تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ چیر پھاڑ کرنے والے درندے بھی ان کے سامنے مات تھے۔ ایسی عمومی جہالت وعالمگیر تاریکی کے دور میں عرب کے صحراؤں سے اسلام کا آفتاب ہدایت طلوع ہوا اور چند صدیوں میں اس نے مشرق ومغرب کی عالمی سلطنتوں کو شکست فاش دے کر سسکتی ودم توڑتی انسانیت کی مسیحائی کی، اور اسے دنیا وآخرت کی حقیقی کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔

اسلام میں جنگ کا تصور

اسلام بنیادی طور پر ایک امن پسند مذہب ہے، اسی لیے وہ جنگ کو بالکل ناپسند کرتا ہے اور اسے "البأساء" (Adversity) یعنی صعوبت ومصیبت سے تعبیر کرتا ہے، تاہم ناگزیر حالات میں اس نے جنگ کی اجازت دی ہے تاکہ انسانوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے اور زمین میں فتنہ وفساد نہ پھیلے چنانچہ قرآن مجید میں یہ وضاحت ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ﴾ (البقرۃ:۲۵۱)

(اور اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض سے دور نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا)

اسی بنیادی مقصد کے تحت مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اسی وقت دی گئی جب خود ان پر ظلم کیا گیا یا ان کے خلاف جنگی کارروائی کی گئی، یا امن وصلح کے ماحول کو تاراج کر کے فتنہ وفساد پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ ارشادات خداوندی ہیں:

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا﴾ (الحج:۳۹)

(ان لوگوں کو (جنگ کی) اجازت دی گئی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے)

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (البقرۃ:۱۹۰)

(اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ (البقرۃ:۱۹۳)

(اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے)

مذکورہ وجوہات دنیا کے قوانین خیر وشر کی روشنی میں کسی بھی قوم یا ملک کے لیے جنگ کا معقول جواز (Reasonable Justification) فراہم کرتی ہیں، اور جنگ کے نتیجہ میں جو عمومی تباہی ہوتی ہے اسے بھی دنیا کا ہر قانون جنگ کا لازمی نتیجہ قرار دے کر قبول کر لیتا ہے لیکن اسلام چونکہ جنگ کو ایک "ناگزیر ضرورت" قرار دیتا ہے اس لیے اس نے عمومی تباہی و بربادی سے روکنے کے سخت احکام بھی دیے ہیں اور جنگ کے اصول وقواعد بھی وضع کیے ہیں جن کا اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، اور جب مسلمان ان ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے جنگ کرتے ہیں تو خدائے کائنات کی نظر میں وہ جنگ بھی ایک عبادت بن جاتی ہے اور اس عبادت کو شریعت کی اصطلاح میں "جہاد فی سبیل اللہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسلامی فتوحات

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت (634-632ء) میں مسلمانوں نے بیرون عرب امن وانسانیت کا پیغام پہنچانا چاہا تو روم وایران کی یہی دونوں عالمی طاقتیں مدمقابل ہوئیں، مسلمان ان دونوں طاقتوں سے بیک وقت نبرد آزما ہوئے، جس کے بعد جزیرہ نما عرب کے شمال میں دو متوازی محاذ کھل گئے، مسلمانوں نے مشرقی محاذ پر ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں (656-644ء) میں صرف چوبیس سال کی مدت میں پوری ایرانی سلطنت کو مملکت اسلامی کا جزء بنالیا۔

فتوحات کا سلسلہ

• مغربی محاذ پر رومن امپائر کی بازنطینی حکومت مدمقابل تھی، مسلمانوں نے اس سے لوہا لیا اور سب سے پہلا حملہ 632ء میں ملک شام پر کیا، 635ء میں شام کا صوبائی مستقر دمشق فتح ہوا، 636ء میں رومی شہنشاہ ہرقل (Hercules) نے خود قیادت کی اور اپنی عظیم فوج کے ساتھ مسلمانوں کے مدمقابل ہوا، یرموک کا تاریخی معرکہ سرگرم ہوا، حضرت خالد بن ولیدؓ نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست دی، اور سات سال کے عرصہ میں پورا شام اور فلسطین روم کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

شام کے بعد عرب فاتحین نے مصر کا رخ کیا اور 641ء میں حضرت عمرو بن العاصؓ نے مصر کے گورنر سائرس (Cyrus) کو شکست دی اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ (Alexandria) پر قبضہ کر لیا، ایک طرف شام کے سقوط سے

روم کی سیاسی عظمت کو شدید نقصان پہنچا تو دوسری طرف مصر سے محرومی نے اسے سخت معاشی دھچکا لگایا۔

فتوحات کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور میں عارضی طور پر رک گیا تھا، ان کی شہادت کے بعد خود عالم اسلام خانہ جنگیوں میں الجھ کر رہ گیا، لیکن جب اموی دور شروع ہوا تو فتوحات کا سلسلہ ایک بار پھر چل پڑا، اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت (680-661ء) میں نامور سپہ سالار عقبہ بن نافع نے شمالی افریقہ کی بربر ریاستوں کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا، جس کے نتیجہ میں رومن امپائر اپنی تمام افریقی نوآبادیوں سے محروم ہو گیا۔

فتوحات کا جو سلسلہ حضرت امیر معاویہؓ نے شروع کیا تھا وہ ان کے جانشینوں عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک کے دور حکومت (715-705ء) میں انتہائی عظمتوں تک پہنچ گیا، 711ء میں طارق بن زیاد کی فوج اسپین کی سرزمین پر وارد ہوئی، شاہ راڈرک (Roderic) کی فوج سے گھمسان کی جنگیں ہوئیں، اور صرف دو سال کے عرصہ میں اندلس مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ 718-717ء میں مسلمان کوہ پائرینیز (Pyrenees) کو عبور کر کے فرانس میں پیش قدمی کی اور وہاں کے مختلف علاقوں کو فتح کیا، فتوحات کا یہ سلسلہ 732ء تک جاری رہا۔

732ء کو نبی آخر الزماں کے وصال کو سو سال مکمل ہو گئے، اور اس ایک صدی میں مسلمانوں نے ایک ایسی عظیم مملکت قائم کر لی تھی جو اسپین سے لے کر چین تک پھیلی ہوئی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کا قیام

ساتویں اور آٹھویں صدی میں مسلم فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ دسویں صدی کے بعد تھمنے لگا، گیارہویں صدی میں تاتاریوں کا سیل رواں اٹھا اور 1055ء میں ان کے سردار طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد پر قبضہ کر لیا، مسلم حکومت انتشار کا شکار ہو کر کمزور پڑنے لگی جس کا سیدھا فائدہ بازنطینی حکومت کو ملا، اس نے اپنی بکھرتی مملکت کو سنبھالنے اور اپنے علاقوں کی بازیابی کی کوششیں شروع کر دیں۔

سلجوقیوں کی قوت سے بازنطین بھی سراسیمہ تھا، شہنشاہ بازنطین نے اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے 1071ء میں سلجوقی حکومت پر حملہ کر دیا، سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے ملاذگرد (Malaz kirt) کے مقام پر شہنشاہ بازنطین کو عبرتناک شکست دے کر مسیحی دنیا کو ایشیائے کوچک سے بھی محروم کر دیا۔

جنگ ملاذگرد میں شکست نے بازنطینی حکومت کو ہراساں کر دیا، مجبوری کے عالم میں اس نے اپنے دیرینہ رقیب کلیسائے مغرب سے مدد طلب کی اور پوپ اربن سے تعاون کی اپیل کی۔ پوپ نے عالم مسیحیت کی بقا کے

لیے ایشائے کوچک کی بازیابی کو لازم قرار دیا اور اس سیاسی ضرورت میں اس نے مذہبی عنصر شامل کر کے صلیبی جنگوں (Crusades) کا اعلان کر دیا۔

تیرہویں صدی کے اختتام پر مفتوحہ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحدوں سے متصل اناطولیہ کے علاقہ میں ترکوں نے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی، اس ریاست کے بانی کا نام عثمان تھا، اس لیے ان کے نام سے موسوم یہ ریاست ''سلطنت عثمانیہ'' کہلائی۔

چودھویں صدی میں بازنطین پر ترکوں کا دباؤ شدید ہونے لگا، بازنطین کے مختلف علاقوں پر ترک مسلمانوں کا قبضہ شروع ہوا، فتوحات کا سلسلہ 1326ء میں شروع ہوا اور چودھویں صدی کے اختتام تک یعنی 1403ء میں بلقان کا پورا علاقہ ترکوں کے قبضہ میں آ گیا۔ صرف قسطنطنیہ باقی رہ گیا جو اپنی قلعہ بندی کے طفیل مزید نصف صدی تک فتحیاب ہونے سے باقی رہا۔ بالآخر 1453ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا۔

ایک طرف مشرق میں ترک فتحیاب ہو رہے تھے تو دوسری طرف مغرب میں عربوں کی پسپائی کا سلسلہ جاری تھا، گیارہویں صدی سے مسلم برتری کا جو زوال شروع ہوا وہ سقوط قسطنطنیہ کے چالیس سال بعد 1492ء میں اسپین میں غرناطہ کے سقوط پر ختم ہوا، اس طرح مغربی یورپ سے مسلم اقتدار کا چراغ گل ہو گیا اور یورپ کے ''تاریک دور'' (Dark Ages) کا خاتمہ اور اس کی ''نشاۃ ثانیہ'' (Renaissance) کا آغاز ہوا۔

آٹھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے رومن امپائر کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا پندرہویں صدی تک ان میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی، درمیانی دور میں عارضی طور پر سرحدیں آگے پیچھے ہوتی رہیں لیکن مجموعی طور پر جغرافیائی نقشہ میں مستقل ردوبدل نہ ہو سکا، پندرہویں صدی میں مسیحیوں نے اسپین کی بازیابی کر لی تو اس کی جگہ اسپین سے کہیں بڑا علاقہ مشرقی یورپ سے نکل کر عثمانی حکومت میں شامل ہو گیا۔ اس طرح مغربی معاشرہ کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلم دنیا میں محصور و مغلوب رہا۔

اسلامی فتوحات کے دوررس اثرات

مسلم فوجوں نے اسلام کے جنگی اصول و قوانین کی سختی سے پابندی کی، اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور بے مثال انسانیت نوازی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ مفتوح قومیں اپنے فاتحین کی گرویدہ اور ان کی ثنا خوانی میں رطب اللسان ہو گئیں، انھوں نے خود بڑھ کر مسلم فوجوں کا استقبال کیا اور انھیں اپنا مسیحا تسلیم کیا، چنانچہ یہی مسلم فوجیں جب عراق کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو وہاں کے عوام نے انھیں اپنا نجات دہندہ قرار دیا اور ان کا نہایت والہانہ استقبال کیا:

"The Muslim on the whole were welcomed in Mesopotamiah as deliverers

from the foreign yoke of the persians."(1)

(میسوپوٹامیہ (قدیم عراق) میں 'ایرانیوں کی غیر ملکی غلامی سے نجات دلانے والوں کی طرح' مسلمانوں کا عمومی طور پر استقبال کیا گیا)

شام ومصر کے باشندے بازنطینی حکومت کی مذہبی زیادتیوں سے تنگ آ چکے تھے، چنانچہ انھوں نے مسلم فوج کشی کو اپنے حق میں آزادی کا پروانہ سمجھا اور کسی طرح کی مزاحمت سے بالکل گریز کیا:

"There is no doubt that one of the essential causes of the amazing military success of the Arabs was the discontent of the population of Syria and Egypt, this discontent was religious in character."(2)

(اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربوں کی کامیاب جنگی مہم کے اسباب میں ایک اہم سبب مصر وشام کے باشندوں کی بے اطمینانی بھی تھی، اور یہ بے اطمینانی خاص کر مذہبی معاملہ میں تھی)

اسلامی فتوحات نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، یورپ کی مذہبی وتہذیبی اور تمدنی ترقیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلام کے گہرے اور دوررس اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں، اسلام کے ان اثرات اور اس کے احسانات وعطیات کی تعیین وتحدید تو ناممکن ہے تاہم ان کا اختصار واستخاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے درج ذیل عناوین کے تحت کیا ہے:

"۱-صاف اور واضح عقیدۂ توحید۔۲- انسانی وحدت ومساوات کا تصور۔ ۳-انسانیت کے شرف اور انسان کی عزت وبلندی کا اعلان۔۴-عورت کی حیثیت عرفی کی بحالی اور اس کے حقوق کی بازیابی۔۵-ناامیدی وبدفالی کی تردید اور نفسیات انسانی کی حوصلہ مندی اور اعتماد وافتخار کی آفرینش۔۶-دین ودنیا کا اجتماع اور حریف وبرسرجنگ وانسانی طبقات کی وحدت۔۷-دین وعلم کے درمیان مقدس دائمی رشتے کا قیام واستحکام اور ایک کی قسمت کو دوسرے کی قسمت سے وابستہ کردینا، علم کی تکریم وتعظیم اور اسے بامقصد، مفید اور خدا رسی کا ذریعہ بنانے کی سعی محمود۔۸-عقل سے دینی معاملات میں بھی کام لینے اور فائدہ اٹھانے اور انفس وآفاق میں غور وفکر کی ترغیب۔۹-امت اسلامیہ کو دنیا کی نگرانی ورہنمائی، انفرادی واجتماعی اخلاق ورجحانات کے احتساب، دنیا میں انصاف کے قیام اور شہادت حق کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کرنا۔۱۰-عالمگیر اعتقادی وتہذیبی وحدت کا قیام۔"(۳)

اسلام کے گہرے وعمومی احسانات وعطیات کا اعتراف خود مغربی مفکرین نے بھی کھلے لفظوں میں کیا ہے، چنانچہ معروف انگریز مؤرخ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

"It was not scince which brought Europe back to life. Other and manifold

---

(1) Encyclopaedia of Britanica, History of Mesopotamiah

(2)Byzantium-An Introduction to East Roman Civilization by Norman H. Baynes, P.309

(۱) تہذیب وتمدن پر اسلام کے احسانات واثرات/صفحہ ۲۰-۲۱

influences from the civilization of Islam communicated its first glow to European life."(1)

(صرف طبی علوم ہی (جن میں عربوں کا احسان مسلم ہے) یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں، اور اس کی ابتداء اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب وتمدن کی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئی ہیں)

کلیسا کی اسلام دشمنی

"مقدس رومی سلطنت" کے قیام سے قبل تک عربوں اور مغربی روم کے تعلقات بہتر اور خوشگوار تھے، عرب کے سفراء شہنشاہ پے پن (Pippin) اور شہنشاہ شارلیمن (Charlemagne) کے درباروں میں حاضر ہوا کرتے تھے، چنانچہ 629ء جب رسول انسانیت حضرت محمد (ﷺ) کا نامۂ مبارک قیصر روم ہرقل اول (Hercules I) کے پاس پہنچا تو اس نے بسر وچشم اسے قبول کرنا چاہا، اس کے دل نے آپ (ﷺ) کی نبوت وپیغمبری کی گواہی بھی دی لیکن اس کا تخت وتاج ارباب کلیسا کی مرضیوں کا غلام تھا اس لیے ان کی حمایت کے بغیر کوئی فیصلہ کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے دربار طلب کیا، خود تاج شاہی پہن کر شاہی جلال کے ساتھ تخت نشیں ہوا، چاروں طرف بطارقہ، قسیس اور رہبان کی صفیں قائم ہوئیں اور پھر:

(ہرقل نے ہدایت دی کہ محمد (ﷺ) کے خط کو دربار میں بلند آواز کے ساتھ کلیسا کے پادریوں اور درباریوں کے سامنے پڑھا جائے: اچانک فرش سے تیز آوازیں اٹھنے لگیں، وہ سب کے سب تیزی کے ساتھ دروازے کی جانب دوڑے تاکہ دربار سے باہر نکل جائیں)

"....Heraclius gave instructions for the prophet Muhammad's letter to be read out aloud to the patriarchs of the church and his generals assembled in the courtyard. There was an immediate out cry from the floor as they all rushed towards the gates of the fortress to get out."(2)

پادریوں کی اس پرزور مخالفت کے سامنے قیصر کو اپنا تخت وتاج خطرہ میں نظر آنے لگا چنانچہ وہ فوراً اپنے ارادہ سے مکر گیا اور کہنے لگا:

(جو کچھ میں نے کہا تھا وہ تمہارے اعتماد کو پرکھنے کے لیے کہا تھا اور میں نے اسے پرکھ لیا)

"What I just said to you was said to test your conviction, and I have seen it." (3)

---

(1) The Making of Humanity, P.202

(2) The Journey of A Lifetime With Prophet Muhammad By Khadijah A. Stephens (http://www.muhammad.com)

(3) The Journey of A Lifetime (http://www.muhammad.com)

پادریوں کے اس تعصب کی وجہ سے قیصر کے دل میں اسلام کا جو نور چمکا تھا وہ تخت وتاج کی تاریکی میں بجھ کر رہ گیا اور روم کی ایک بڑی تعداد اسلام کے دائمی حلقۂ فلاح و بہبود میں داخل ہونے سے محروم رہ گئی۔

800ء میں ارباب کلیسا کی نوازشوں اور سازشوں کے ذریعہ ہی مغربی روم میں ''مقدس رومی سلطنت'' قائم ہوئی تھی جس کے ساتھ ہی سیاست پر کلیسا کی گرفت بھی مضبوط ہوتی گئی، اور جو معاشرہ وجود میں آیا اس میں کسی فرد بشر کے لیے گنجائش نہیں تھی کہ وہ مسیحیت کے سوا کوئی دوسرا مذہب اختیار کر سکے یا کلیسائی افکار ونظریات اور اس کی پالیسیوں کی مخالفت کر کے زندہ رہ سکے، چنانچہ تلوار کے زور پر مسیحیت کو نافذ کیا گیا اور دل ودماغ بلکہ روحوں کو کھنگالنے اور انھیں کلیسا کا پابند بنانے کے لیے محکمۂ تفتیش (Inquisition) کا ظالمانہ نظام جاری کیا گیا۔ (۱)

کلیسا نے مغربی معاشرہ کو رومن کیتھولک نظریات کا سختی سے پابند بنایا، یہ نظریات مغرب سے باہر خود عیسائی دنیا کے لیے بھی اجنبی اور نا قابل قبول تھے چنانچہ ان نظریات کے خلاف مصر اور شام میں وقتاً فوقتاً شدید قسم کی تحریکیں بھی اٹھیں، بے شمار فرقے بھی ابھرے، اور انھوں نے رومن کیتھولک کے نظریات کے خلاف آوازیں بھی اٹھائیں لیکن ہر تحریک کو شعلہ وشمشیر کے ذریعہ ختم کر دیا گیا، ہر مخالف آواز کو نذر آتش کر دیا گیا کیونکہ مغربی کلیسا میں نظریاتی اختلاف کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی، معمولی سا بھی اختلاف کلیسا کی نظر میں بغاوت تھا، اور اس بغاوت کا نام 'بدعت'' (Heresy) تھا، یہ ایک ایسا لفظ تھا کہ اگر کسی فرد یا گروہ پر اس کا اطلاق ہو جاتا تو زمین اس پر تنگ ہو جاتی اور اس کا خون مباح ہو جاتا۔

بدعت (Heresy) کے نام پر مغربی معاشرہ جن مسائل سے دوچار تھا وہ سب ایسے تھے جو مغرب میں نہ سہی مسیحی دنیا میں کہیں نہ کہیں قابل قبول تھے، یہ مسائل ایسے تھے جن کو برداشت کر لینے سے مذہب پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی لیکن کلیسا کسی بھی صورت میں اس پر راضی نہیں تھا، جب ان معمولی اور قابل تسلیم اختلافات پر کلیسا کی جانب سے قتل وغارت گری ہو سکتی تھی تو وہ عقائد جن کو اسلام پیش کر رہا تھا کلیسا کی کیتھولک دنیا کی نظریاتی حدود میں کیسے برداشت کیے جا سکتے تھے؟!

چنانچہ ارباب کلیسا نے ابتداء ہی سے اسلام کو اپنا حریف سمجھا اور اپنے دائرہ اقتدار میں اس کے بڑھتے ہوئے صالح اور مفید اثرات کو نہ صرف ختم کرنے کی سازش کی بلکہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش بھی کی، مسلم ریاستوں کو دشمن قرار دیا اور اگر کبھی کسی مسلم ملک نے مصالحت کی جانب قدم بھی بڑھایا تو کلیسا نے ایسی کوشش کو عمداً ناکام کر دیا۔

---

(۱) تفصیلات اسی کتاب میں ''کلیسا کے مظالم'' کے تحت ملاحظہ ہوں۔

مسیحی دنیا میں مسلمانوں کا وجود نا قابل برداشت تھا، سسلی اور نیپلز کے حکمراں پوپ کے حلقۂ اقتدار سے باہر تھے، عربوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے، پوپ جان ہشتم نے نہ صرف عربوں کے ساتھ تعلقات ختم کرنے پر مجبور کیا بلکہ ان علاقوں میں موجود عربوں کو گرفتار کر کے روم روانہ کرنے کا حکم بھی دیا۔

".....had not only promised to break off relation with the Arabs but also to arrest the Arabs and send them to us."(1)

(اس نے نہ صرف عربوں سے تعلقات منقطع کرنے کا وعدہ لیا بلکہ یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ عربوں کو گرفتار کر کے اس کے پاس بھیجے)

کلیسائی پروپیگنڈہ

827 تا 831ء میں مسلم فوجوں (آل اغلب) کا سامنا اٹلی کی فوجوں سے ہوا، 846ء میں اور پھر اس کے بعد 875ء مسیحیوں کا مقدس شہر روم بھی نرغے میں آیا، مسلمانوں نے اس کے قریب ہی ایک پہاڑی قلعہ گاری گلیانو (Gari Giliano) کو اپنا مستقر بنالیا، رومی باشندے اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام کو گلے لگانے لگے، مفتوح قومیں اپنے فاتحین کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگیں۔

روم کی تاریخ گواہ ہے کہ روم کے حقیقی باشندے ہمیشہ سے ہر مذہب کے لیے روادار تھے، ان کی جویانہ فطرت و متلاشی طبیعت ہر خیر کو قبول کرنے کو تیار تھی، اور اسی مزاج نے ان کے درمیان مسیحیت کو بھی قبول عام عطا کیا تھا، البتہ اپنے مزاج کے مطابق اس کو ڈھالنا چاہا جسے کلیسا نے خوشی خوشی قبول کر لیا تھا، لیکن اب معاملہ رومی باشندوں کا نہیں خود کلیسا کا تھا، اس نے ظلم و تشدد کے ساتھ مغربی معاشرہ کو اپنے نظریاتی خطوط پر استوار کیا تھا، پروپیگنڈوں کے ذریعہ مذہبی رواداری کو ختم کر کے ہر مخالف کو باطل قرار دیا تھا۔

کلیسا کو اسلام سے کوئی ہمدردی نہ تھی، یہ اس کے طاقتور دشمن کا مذہب تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم نے ارباب کلیسا کے اضطراب و بے چینی میں شدت پیدا کر دی، چنانچہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی پر کمر کس لی، اور اس کے خلاف پروپیگنڈوں کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔

کلیسا نے یہ عقیدہ دیا کہ حقیقی نجات صرف کلیسا کے ذریعہ ہی ممکن ہے، دنیا میں جو بھی حق ہے وہ صرف مسیحیت کے ساتھ خاص ہے، اس کے علاوہ اسلام اور دیگر مذاہب سب باطل ہیں، اور جس طرح حق و باطل کا میل نہیں اسی طرح مسیحیت اور اسلام کا بھی کوئی جوڑ نہیں۔

ارباب کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز الفاظ بھی جاری کیے مثلاً مشرک (Pagan) ملحد

---

(1) The Arabs and the Mediaeval Europe P.77

(Infidel) دشمن عیسیٰ، شیطان کے پجاری وغیرہ اور حد تو یہ کہ شدت عناد و اسلام دشمنی میں پوپ جیسے عظیم مذہبی شخص کی زبان سے ''ولدالحرام'' (Sons of fornication) کے الفاظ بھی ادا ہوئے۔ (1)

مسلمانوں کے خلاف اس ''تشہیری جنگ'' (Propaganda War) میں پوپ کے شانہ بشانہ مغرب کا ہر وہ طبقہ تھا جس کے مفاد کلیسا سے وابستہ تھے یا جن کے استحصالی نظریات پر اسلام کی ضربیں پڑ رہی تھیں، چنانچہ مسلم دشمنی نے جو شدید نفرت پیدا کی اس کا اندازہ اس ایک مقولہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

"The only good Saracen is a dead Saracen."(2)

(صرف مردہ سراسن (یعنی مسلمان) ہی ایک اچھا سراسن ہے)

روم میں کلیسا اور حکومت دو الگ الگ ادارے تھے، حکومت کے عہدے قبول کرنا، فوج میں شامل ہونا، معاشرتی ذمہ داریاں اٹھانا، بال بچوں کی پرورش کرنا حتی کہ خود اپنی ذات کی فلاح و بہبود کی فکر کرنا مسیحیت کے منافی تھا، لیکن نویں صدی میں خود کلیسا نے بڑھ چڑھ کر ان امور میں حصہ لیا اور حکومت کے ہر شعبہ میں اس کے کارکن سرگرم ہوئے۔

مسیحیت عدم تشدد کا مذہب تھا، جارحیت اس کی بنیادی تعلیم کے خلاف تھی، ایک رخسار پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا رخسار پیش کرنے کا حکم تھا، جنگ کا تعلق صرف دنیادار سے تھا، مذہبی لوگوں کے نزدیک یہ ایک گناہ عظیم تھا، یہی وجہ ہے کہ جب روم پر عربوں کے دوسرے حملے کے بعد پوپ جان ہشتم (Pop John VIII) نے اپنے حلیفوں سے کلیسا کی حفاظت کے لیے فوجی مدد طلب کی تو خود کلیسا کے بشپ متردد ہوئے اور انھوں نے پوپ سے ایسے لوگوں کے حشر کے بارے میں سوال کیا جو خدا کے مقدس چرچ، عیسائی مذہب و حکومت کے دفاع میں کام آجائیں، تو پوپ نے جواب دیا:

"He was confident those who were killed while struggling hard against pagans and infidels cum pietate *for the Catholic religion would be received into eternal rest."(3)*

(اسے یقین ہے کہ وہ لوگ جو بت پرستوں اور بے دینوں (یعنی مسلمانوں) سے کیتھولک مذہب کے لیے شدید جدوجہد کرتے ہوئے مارے جائیں گے انھیں ابدی سکون نصیب ہوگا)

پوپ جان کا یہ فتویٰ عمومی و ہمہ گیر فتویٰ نہ تھا، یہ ان لوگوں کے لیے خاص تھا جو اس وقت فوج میں شریک

---

(1) The Arabs and the Mediaeval Europe P.76

(2) The Arabs and the Mediaeval Europe P.96

(3) The Arabs and the Medieval Europe P.78-79

CamScanner

ہوئے تھے، لیکن پوپ جان کے جانشینوں نے اس چنگاری کو ایک شعلۂ جوالہ بنا دیا اور اس فتویٰ کو عمومی حیثیت دے کر اس فکر و نظریہ کو عام کر دیا کہ اگر مسیحی دنیا کوشش کرے تو عالم اسلام سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس حاصل کر سکتی ہے، اس مقصد کے لیے بڑے پیمانہ پر فوجی کارروائی درکار تھی، لیکن مغرب کی اقتصادیات ان جنگوں کے اخراجات کا تحمل نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا رضا کار فوج کا منصوبہ بنایا گیا جس کے لیے ایک معقول نظریے کی ضرورت محسوس کی گئی، کلیسا نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ''مذہبی جنگ'' کا نظریہ وضع کیا، اور مختلف سیاسی و مذہبی عناصر کو آہستہ آہستہ یوں ترتیب دیا کہ عدم تشدد کی جگہ تشدد و جارحیت مسیحی مذہب کا عقیدہ بن گیا، عقیدہ کی یہ تبدیلی درحقیقت ''مقدس صلیبی جنگ'' کے لیے پہلا زینہ تھی۔

زوال اندلس

کلیسا نے مغرب کو ایک مؤثر مذہبی نظریۂ جنگ عطا کیا، جس کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے، اسپین میں مغلوب عیسائیوں کی جنونی تحریک چلی اور اس نے مسلمانوں کو شکست دے کر ایک نئے اسپین کی بنیاد ڈالی جس میں کلیسا کے پرتشدد نظریات اور مغرب کی ''مادہ پرست'' بنیادوں کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔

تحریک شہیداں

اندلس یورپ میں موجود ایک مسلم ریاست تھی جو ہسپانیہ، پرتگال اور جدید فرانس پر مشتمل تھی، اس کا شمار دنیا کے عظیم ترین ممالک میں ہوتا تھا، مسلمانوں کے عہد میں یہ ملک پورے یورپ کے لیے روشنی کا مینار تھا، مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک یہاں حکمرانی کی، اس پوری مدت میں مسیحیوں کو مکمل طور پر مذہبی، معاشی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔

اندلس کے پادری کلیسا کے پچھلے اقتدار کو قائم کرنے کے خواہاں و متمنی تھے، لیکن اسلامی حکومت کی روادارانہ روش کی وجہ سے وہ مسیحیوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں ناکام تھے، چنانچہ انھوں نے پروپیگنڈہ کا سہارا لیا اور غالی مسیحیوں میں یہ خیالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے کہ مذہب کی اصل روح تکلیفیں اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے حکمرانوں کو مشتعل کر کے انسانی جسم اور گوشت پوست کو تکلیفیں پہنچائی جائیں تاکہ روح کی تقدیس و تزکیہ ہو سکے، اس پروپیگنڈہ کی بدولت 850ء میں مسیحیوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو گئی جس کے افراد دین اسلام کو برملا برا کہتے اور (نعوذ باللہ) آنحضرت (ﷺ) کی ذات گرامی کو سب و شتم کا نشانہ بناتے اور اس کی پاداش میں حکومت کی سختیاں خوشی خوشی قبول کرتے، اور اپنے نقطۂ نظر سے قتل ہو کر مسیحی مذہب پر نثار ہو جاتے۔

اس تحریک کا بانی قرطبہ کا ایک راہب یولوجیس (Eulogius) تھا، اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں

ایک دولتمند مسیحی نوجوان الوارو (Alvaro) اور ایک حسین دوشیزہ فلورا (Flora) نے نمایاں حصہ لیا۔ (۱)

اس کے بعد اس تحریک کے عملی مظاہرے شروع ہوئے، اور مختلف پادریوں اور ان کے ہمنواؤں نے اسلام وپیغمبر اسلام کی شان میں سرعام گستاخیاں شروع کر دیں، جس کی پاداش میں لوگ جان سے مارے جاتے، کلیسا نے اسے ایک تحریک کی شکل دے دی جسے ''تحریک شہیداں'' (Martyr's Movement) کا نام دیا گیا۔ (۲)

سب سے پہلے ایک مسیحی راہب پرفکتوس (Perfectus) سامنے آیا، اس نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں دشنام تراشی کی، اسے قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا، وہاں بھی اس نے وہی دریدہ دہنی اختیار کی، اور دل کھول کر سب وشتم سے کام لیا جس کے نتیجہ میں اسے سرعام پھانسی دے دی گئی:

"A foolish priest Perfectus had been led into cursing the dominant religion, and had been executed on a great Mohammedan feast-day."(3)

(نابنجار پادری پرفکتوس کو رائج مذہب (اسلام) کو برا بھلا کہنے پر آمادہ کیا گیا، اور پھر عید محمدیؐ کے عظیم دن اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا)

اس کے بعد ایک دوسرا پادری آئزک (Isaac) سامنے آیا، وہ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا کہ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے، قاضی نے اس کے سامنے جیسے ہی دینی عقائد بیان کیے اس نے اسلام پر سب وشتم شروع کر دیا، قاضی کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور ایک طمانچہ مارتے ہوئے کہا کہ تو جانتا ہے اسلام میں اس کی سزا قتل ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں اور کہنے لگا:

"Condemn me to death; I desire it; for I know that the Lord said, "Blessed are they who are persecuted for righteousness' sake, for theirs is the kingdom of heaven."(4)

(مجھے موت کی سزا دو، میں اس کا متمنی ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خداوند نے کہا ہے کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو حق کی خاطر ستائے جاتے ہیں، آسمان کی بادشاہت انہیں کے لیے ہے)

بالآخر آئزک اپنی دریدہ دہنی کی پاداش میں موت کی سزا کا مستحق قرار پایا۔ (۵)

---

(۱) تاریخ اندلس از مولانا ریاست علی ندویؒ/ ۳۷۸

(2) The Arabs and the Mediaeval Europe P.31

(3) The Moors In Spain By Stanley Lane-Poole P.88

(4) The Moors In Spain By Stanley Lane-Poole P.89

(۵) ان دونوں واقعات کو معروف مستشرق پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی (Reinhart Dozy) نے اپنے استشراقی اسلوب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ دیکھئے:

"Spanish Islam- A History of the Moslems in Spain"

اس کے بعد اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی اور اس کی پاداش میں قتل کا ایک عمومی سلسلہ شروع ہوگیا، چنانچہ بیک وقت چھ پادری قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے، انھوں نے گستاخیاں کیں اور خوشی خوشی اپنے سر قلم کروائے، پھر دو ماہ میں مزید گیارہ افراد نے گستاخیاں کیں اور وہ موت کے مستحق قرار پائے۔ اس جنونی تحریک کے باعث عام مسیحیوں کی روزمرہ زندگی بھی متاثر ہونے لگی، خود قرطبہ کے عیسائیوں نے اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی اور اس موت کو خودکشی قرار دیا جسے تحریک کے ارکان شہادت کہا کرتے تھے۔ حکومت نے بھی اسے سنجیدگی سے لیا، آخر کار اس تحریک کا بانی اور اس کا روح رواں یولوجیس (Eulogius) گرفتار ہوا اور اس کے تختۂ دار تک پہنچنے کے بعد 852ء میں یہ تحریک بھی اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم ہوگئی۔

اسپین کی یہ تحریک مغلوب عیسائیوں کی نفرت و دشمنی کا اظہار تھی جس میں جذبات کی شدت نے خودکشی کی شکل اختیار کرلی تھی، بقیہ مغرب مغلوب ضرور تھا لیکن کمزور نہیں تھا، اسپین کی طرح وہاں بھی کلیسا کی سرپرستی میں مختلف تحریکیں سرگرم تھیں، پس اگر مسلمانوں کا یہ دور عروج تھا تو کلیسا کی بھی نفرت اور دشمنی اپنے عروج پر تھی، جس نے سرد جنگ کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔

دسویں صدی کے اختتام کے ساتھ ساتھ تک عالم اسلام میں کمزوری پیدا ہونے لگی، خانہ جنگیوں نے ایسا انتشار پیدا کیا کہ پورا عالم اسلام تین حریف طاقتوں میں تقسیم ہوگیا، ایشیا میں عباسیوں کی کمزور سی خلافت تھی جس میں سلجوقیوں کا سکہ رائج تھا۔ فلسطین، مصر، سسلی اور افریقیہ کے علاقے فاطمی خلافت کے ماتحت تھے، اور اسپین میں اموی حکمراں عبدالرحمٰن نے خلافت قائم کرلی تھی، اس طرح گیارہویں صدی عالم اسلام کے ابتری کا پیام لائی، اور اسپین کی عظیم الشان اموی حکومت 1031ء میں ختم ہوکر چھوٹی چھوٹی عرب اور بربر ریاستوں میں بٹ گئی جو ایک دوسرے سے متحارب تھیں۔

نوٹ

آٹھویں صدی کے وسط سے دسویں صدی کے وسط تک اندلس میں مسلمانوں کی ایک مرکزی حکومت تھی جو 4 لاکھ، 94 ہزار مربع کلومیٹر تک محیط تھی، جو بارہویں صدی کے وسط تک 2 لاکھ 2 ہزار مربع کلومیٹر سمٹ چکی تھی، قریب نصف اندلس ہاتھ سے جاتا رہا اور مسلم ریاستوں کی تعداد بڑھتی رہی، جہاں پہلے ایک سلطنت تھی وہاں اب پانچ سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں، رقبہ کم ہوتا جارہا تھا اور تفریق بڑھتی جارہی تھی، 1037ء میں اندلس کی پانچ مسلم ریاستیں تقسیم ہوکر تیرہ ریاستیں بن چکی تھیں، اور رقبہ محض 15 ہزار کلومیٹر رہ گیا تھا، یہ رقبہ سمٹتا رہا اور 1403ء میں محض ساڑھے گیارہ ہزار مربع کلومیٹر پر آکر رک گیا۔

CamScanner

حقیقت یہی ہے کہ یہی چھوٹی چھوٹی حکومتیں عظیم الشان اندلس کو لے ڈوبیں، ہر ریاست اپنی بقاو تحفظ کے لیے ہمسایہ مسیحی حکومت کے تعاون کی محتاج تھی، مرکز سے بغاوت اور غداری کی بنیاد پر قائم ہونے والی ان حکومتوں کے لیے مسیحی حکمرانوں کا دست تعاون ہمیشہ دراز رہا، اور چند ہی سالوں بعد یہ دست تعاون دست غصب بن گیا، مسیحی ریاستوں لیون (Leon) اور قسطالیہ (Castilla) نے ان چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو ہضم کرنا شروع کر دیا، اور گیارہویں صدی کے اواخر تک مسلم اسپین کا اکثر حصہ عملاً مسیحیوں کا باج گذار بن گیا۔

صلیبی جنگیں (Crusades)

"CRUSADES: This title originated to describe the military expeditions under taken by Christians of the 11th, 12th, and 13th Century for the recovery of the Holy Land from Muslims. The name comes from the cross which the Crusaders bore upon their clothing."(1)

(کروسیڈس (یعنی صلیبی جنگیں): یہ عنوان مسیحی افواج کی ان کارروائیوں کی وضاحت کے لیے اختیار کیا گیا ہے جو کارروائیاں گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی میں مسلمانوں سے ارض مقدس کی بازیابی کے لیے انجام دی گئیں، یہ نام اس صلیب سے مشتق ہے جو صلیبیوں کے کپڑوں پر نقش تھی)

عالم اسلام کا شدید انتشار، اندلس اور سسلی میں عیسائی غلبہ، افریقی فتوحات اور عباسیوں اور فاطمیوں کی سلجوقیوں کے ہاتھوں شکست، یہ سب ایسی تبدیلیاں تھیں جو مغرب کے لیے خوش آئند تھیں، البتہ بازنطین کی مکمل شکست اور ایشائے کوچک سے اس کی محرومی مغرب کے لیے ایک عظیم سانحہ ضرور تھی جسے مغرب کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

مغرب میں عالم اسلام کے خلاف صدیوں سے ایک اضطراب پنپ رہا تھا، عالم اسلام کے داخلی انتشار نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ مغرب دفاعی پوزیشن سے نکل کر اقدامی پوزیشن میں آ گیا، اور اس نے عالم اسلام پر ایک شدید ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا، اس دوران بازنطین مسلسل شکست سے دوچار ہو کر بے بس ہو چکا تھا، اس نے اپنی تباہی اور مایوسی کے حالات میں کلیسائے روم سے مدد کی اپیل کی، جو ہر ناحیہ سے مغرب کی برتری تسلیم کرنے کے مرادف تھی۔

پوپ اربن دوم (Urban II) کلیسائے روم کا سربراہ تھا، وہ بڑا جاہ پرست اور جنگی مزاج کا مذہبی رہنما تھا، یورپ کے حکمرانوں میں اس کا وقار کم ہو چکا تھا، معاشرہ میں ارباب کلیسا کی بدعنوانیوں کے خلاف آوازیں بھی

---

(1)Oxford Dictionary of the Christian Church *(CRUSADES)p.*358

اٹھ رہی تھیں، جس سے پوپ کا روحانی اقتدار بھی خطرہ میں تھا، چنانچہ پوپ اربن نے اپنی گرتی ہوئی ساخت اور کلیسا کے گرتے ہوئے رتبہ کو بحال کرنے کے لیے اس موقع کو سب سے غنیمت جانا۔

چنانچہ 1095ء پوپ اربن فرانس پہنچا، خاصی تعداد میں بشپوں کو ملنے کی دعوت دی، اور کلیمنٹ (Clermont) کے ایک بڑے میدان میں عیسائیوں کے ایک جم غفیر کو اکٹھا کیا جہاں اس نے زبردست خطاب کیا۔ اپنے خطاب میں مسیحیوں کی فلسطین آمدورفت پر مسلمانوں کی جانب سے سخت بندشوں کا تذکرہ کیا اور مسیحی عوام پر مسلمانوں کے دلخراش مظالم کی داستانیں سنائیں، جبکہ یہ داستانیں بالکل فرضی تھیں اور مسیحیوں کی فلسطین آمد ورفت پر نہ کوئی بندش تھی اور نہ کسی طرح کا تعارض تھا:

"In fact, there is little evidence that the Turks mistreated Christians; they were far harsher against their own dissident sects."(1)

(حقیقت یہ ہے کہ بالکل معمولی سا ثبوت اس بات کا تھا کہ ترکوں نے مسیحیوں کے ساتھ برا سلوک کیا ہو، جبکہ وہ خود اپنے ہی لوگوں پر مسیحیوں سے کہیں زیادہ سخت تھے)

پوپ کی اس تقریر نے پورے مغرب میں جنگی جوش پیدا کر دیا، اور مسیحی معاشرہ کے ہر طبقہ کا انسان جنگ کے لیے آمادہ و برسرپیکار ہو گیا:

"Pope Urban II's famous speech at the Council of Clermont in 1095 that initiated the movement. There he described the atrocities of the Turks in the Holy Land in inflammatory language, painting word pictures of Christians being slaughtered (and gutted) within their own churches. Urban linked his call for an expedition to both spiritual and material benefits."(2)

(1095ء میں پوپ اربن دوم کی کلیمنٹ کونسل میں کی گئی تقریر نے اس تحریک کا آغاز کیا، اپنی شعلہ بیانی میں مسیحی علاقوں اور کلیساؤں میں مسیحیوں کے ذبح کیے جانے کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس نے ارض مقدس پر ترکوں کے مظالم کو بیان کیا، پوپ اربن نے اس مہم کو مادی و روحانی مفادات سے جوڑ کر پیش کیا)

اس طرح مسیحی یورپ نے مسلمانوں کے خلاف نو (9) صلیبی جنگیں لڑیں، ان جنگوں میں یورپ نے جس بربریت وحیوانیت کا مظاہرہ کیا وہ خود اس کی پیشانی پر بدنما داغ ہے، اور مسلمانوں نے جس انسانیت و رحمدلی کا شیوہ اپنایا وہ ان کی تاریخ کا زریں باب ہے۔

---

(1) A Criminal History Of Mankind P.169

(2) Western Views Of Islam In Medieval And Early Modern Europe By David R. Blanks, P.62

جنگ کے اغراض ومقاصد

صلیبی جنگوں کی بنیادی غرض وغایت کلیسا کی اسلام دشمنی تھی، ارباب کلیسا کو کسی بھی صورت یہ گوارہ نہیں تھا کہ ان کی چودھراہٹ کو کسی بھی طرح سے ٹھیس پہنچے، چنانچہ انھوں نے اپنے اقتدار کو بحال کرنے اور اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔

صلیبی جنگ کا نظریہ کوئی خود رو نظریہ نہیں تھا، اسے صدیوں کی کاوش کے ذریعہ دلنشیں کیا گیا تھا، کلیسائی پروپیگنڈہ نے اسلام کو مسیحیت کا دشمن اور ''ارض مقدس'' کا غاصب قرار دیا تھا جس کی بازیابی عالم مسیحیت کی اولین ذمہ داری تھی، اس ناحیہ سے اسلام کو فتح کرنا اور اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا نہایت ضروری تھا، اس نظریہ کو بنیاد بنا کر اربن سوم نے پورے یورپ میں جنگ کا صور پھونک دیا، اور معاشرہ کے ہر طبقہ کے ذاتی مفادات کو اس جنگ سے جوڑ دیا۔

چنانچہ مسیحی عوام میں جنگی جنون پیدا کرنے کیے لیے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس جنگ میں محض شرکت بھی تمام گناہوں کا کفارہ ہے:

"Whoever for devotion alone, but not to gain honour or money, goes to Jerusalem to liberate the Church of God can substitute this journey for all penance."(1)

(ہر وہ شخص جو واقعی مخلص ہو، عزت ودولت اس کا مقصود نہ ہو، وہ شخص اگر خدائی کلیسا کی بازیابی کے لیے یروشلم جاتا ہے تو اس کا یہ سفر اس کے ہر گناہ کا کفارہ ہوگا)

اور یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ جو لوگ اس جنگ میں کام آجائیں گے وہ سیدھے جنت جائیں گے:

"He proclaimed an Indulgence to all who should take a part and promised, like Mohammad, instant entry into heaven to those who lost their lives."(2)

(اس نے اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی اس جنگ میں شریک ہوگا اس کی مغفرت یقینی ہے، اور محمد (ﷺ) کی طرح اس نے بھی وعدہ کیا کہ جو لوگ اس جنگ میں مریں گے وہ سیدھے جنت میں جائیں گے)

پوپ اربن نے اس جنگ کو اس قدر اہمیت دی کہ جو لوگ خوشی خوشی اس جنگ کے لیے تیار نہیں تھے ان پر مذہبی دباؤ ڈالا گیا اور اس جنگ میں شریک ہونے کا پابند بنایا گیا:

---

(1) The Crusades : A Complete History by Jonathan Phillips
(www.historytoday.com/jonathan-phillips)

(2) Short History of the Christian Church, By Clarke P.204

"Urban II ordered his bishops and preachers not to receive vows from those who could not participate in the army, and he dissolved those vows already taken."(1)

(پوپ اربن دوم نے اپنے بشپ اور داعیوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے نذرانوں کو قبول نہ کریں جو فوج میں شریک ہونے سے انکاری ہیں، نیز اس نے ان نذرانوں کو بھی باطل قرار دے دیا جو پہلے سے قبول کی جا چکی تھیں)

مسلم اقتدار کی وجہ سے رومن حکومت کی تجارت و معیشت پر زبردست اثر پڑا تھا، وہ اقتصادی بحران کا شکار تھا، چنانچہ صلیبی جنگ کا ایک اہم محرک جلب زر اور حصول مال بھی تھا، پوپ اربن نے صلیبی جنگ پر ابھارتے ہوئے مسیحی شہزادوں اور بہادروں کو کہا تھا:

"The wealth of our enemies will be yours, and you will despoil them of their treasures."(2)

(ہمارے دشمنوں کی دولت تمہاری ہو جائے گی، اور تم انھیں ان کے خزانوں سے محروم کر دو گے)

راہب پیٹر کا پروپیگنڈہ

پوپ اربن نے اپنی سحر البیانی کے ذریعہ صلیبی جنگ کی جو آگ بھڑکائی تھی مشہور راہب پیٹر (Monk Peter) نے اس آگ میں زبردست ایندھن کا کام کیا، یوں تو وہ ایک پستہ قد، میلا کچیلا راہب تھا لیکن اس کی کرشماتی صلاحیتوں کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لوگ اس کے گرویدہ اور اس پر سو جان سے نثار تھے، اس کی باتوں کو یکسوئی سے سنتے اور اسے ذمہ داری سے برتتے تھے، اپنے گدھے پر سوار وہ ایک شہر سے دوسرے شہر پھرتا، لوگوں کو جنگ پر آمادہ کرتا، انھیں بشارتیں دیتا، بے مقصد زندگی کو ارض قدس پر نچھاور کرنے کی ترغیب دیتا اور کہتا: "God wills it" (خدا کی یہی مرضی ہے)(۳)

پیٹر کی کرشماتی شخصیت نے عوام کو اس قدر مسحور کر رکھا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس کے پاس جنت سے خدا کا پیغام آیا ہوا ہے، جس میں اس جنگ کی بشارتیں ہیں:

"It was widely believed that Peter carried with him a letter sent from heaven in which God exhorted all Christians to move quickly against the Turks so that he could take vengeance upon them."(4)

(یہ عقیدہ عام ہو گیا تھا کہ پطرس کے پاس جنت سے ایک خط آیا ہے جس میں خدا کی جانب سے مسیحیوں کو تاکیدی

---

(1) A Concise History of the Crusades By Thomas ,P.10

(2) A Rationalist Encyclopedia, P.125

(3) A Short History Of The Catholic Church By Hermann Wedewer,P.104

(4) A Concise History of the Crusades By Thomas P.16

CamScanner

طور پر کہا گیا ہے کہ ترکوں کے خلاف جلد سے جلد نکل پڑیں تا کہ وہ ان سے انتقام لے سکے)

صلیبی جنگوں کا بگل ایسے وقت میں بجایا گیا تھا جب پورا یورپ جہالت اور توہمات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں، مذہب کے نام پر ان کو ہراساں کیا گیا اور ایک خطرناک جنگ میں انھیں ڈھکیل دیا گیا:

"At this time Europe was sank in to the most profound ignorance and superstition."(1)

(اس وقت یورپ جہالت اور توہمات کی گہری تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا)

پوپ کی اپیل اور راہب کی تشہیر کیا تھی جنگل کی آگ تھی، پورا معاشرہ دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوا اور ہر فرد صلیبی جنگ کی تبلیغ کرنے لگا، ماں باپ مسرت کے ساتھ اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو رخصت کرنے لگیں، لوگ اپنے سینوں پر گرم گرم لوہے سے صلیب کا نشان داغنے لگے، بچے گھروں سے بھاگ نکلے، لوگوں نے اپنی انا واپنی عزت کو خاک گردانہ، اپنے بیوی بچوں کو خس وخاشاک کی طرح جھٹک دیا، اپنے کھیتوں، کھلیانوں، باغات زندگی کے ہر لطف سے منھ موڑ لیا اور ٹڈی دل کی طرح دوڑ پڑے، چور اچکوں نے اس جنگ کو اپنی بخشش ومغفرت کا نادر موقع جانا اور گناہوں کے کفارے کے لیے شریک جنگ ہونے لگے، الغرض:

''ایک سراسیمی سی کیفیت عام تھی جو انگلستان سے پھیلتی ہوئی فرانس، وہاں سے کسکانی ہوتی ہوئی اطالیہ کے بندرگاہوں تک پہنچی جہاں صلیبیوں کو لے جانے کے لیے جہاز تیار ہو رہے تھے۔''

(The fever extended from England acrossFrance and Gascony to the Italian cities, which prepared their ships to carry their pilgrims.)(2)

صلیبی جنگ کے اعلان نے مسیحی معاشرہ کو طالع آزمائی کے لیے میدان جنگ فراہم کر دیا، مذہبی اعتقاد کے لیے شہر مسیح کی بازیابی، افلاس کے لیے مال وزر، جنگی فطرت کے لیے فتح ونصرت، تجارت کے لیے منڈیاں، شاہوں کے لیے نئی مملکت، اور کلیسا کے لیے اپنا اقتدار اور اسلام کی تباہی، غرض ہر طبقہ کے لیے صلیبی جنگ میں کشش موجود تھی۔

سقوط بیت المقدس

پوپ اربن دوم نے اجلاس کلیمنٹ (ClermontCouncil) میں ہی پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا، اس نے مغربی خوں آشامی کو پرچم صلیب عطا کر کے عالم اسلام پر کھلا چھوڑ دیا، 1096ء دو سے تین لاکھ اشخاص پر مشتمل

---

(1) Encyclopedia of Britanica *(Crusade)* V.6, P.763

(2) The Arabs and the Mediaeval Europe P.123

ایک لشکر فوج نے ایشیائے کوچک سے جنوب کی جانب پیش قدمی کی، انطاکیہ کے بڑے شہروں، بہت سے قلعوں اور صلیب پر قبضہ کرلیا، راستہ بھر قتل وغارت اور لوٹ مار کرتے ہوئے 1099ء میں یہ لشکر یروشلم پہنچا اور تقریباً ایک لاکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے اور اتنی ہی تعداد میں قیدی بنانے کے بعد وہاں قابض ہوگیا۔(1)

صلیبی افواج کی حیوانیت

یروشلم میں داخل ہوتے ہی صلیبی لشکر نے پورے شہر کو تہس نہس کردیا، اس نے دشمن کی تباہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، قتل وخونریزی، آتش زنی، لوٹ مار، عصمت دری، مقامات مقدسہ کی بے حرمتی، یہ سب گویا صلیبی لشکر کے ضابطۂ اخلاق میں شامل تھا، ان کی بہیمیت کا اندازہ خود مغربی مؤرخین کے بیانات سے ہوتا ہے:

"They poured into the city and began a massacre that lasted for several days. No one was spared."(2)

(وہ شہر میں داخل ہوئے اور قتل عام شروع کردیا، ایسا قتل عام جو سات دنوں تک جاری رہا، انھوں نے کسی کو معاف نہیں کیا)

اس جنگ کی منظر کشی کرتے ہوئے آگسٹ کرے (August C. Krey) لکھتا ہے:

"The battle raged throughout the day, so that the Temple was covered with their blood. When the pagans had been overcome, our men seized great numbers, both men and women, either killing them or keeping them captive, as they wished."(3)

(جنگ پورے دن جاری رہی اور بیت المقدس ان کے خون سے بھر گیا، جب کفار (یعنی مسلمانوں) پر قابو پالیا گیا تو ہمارے مردوں نے ان کے مردوں اور عورتوں کو کثیر تعداد میں گرفتار کرلیا اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق انہیں یا تو قتل کردیا گیا اور یا پھر غلام بنالیا گیا)

مشہور مستشرقہ کیرن آرم اسٹرانگ (Karen Armstrong) کے الفاظ ہیں:

"They killed everyone, male or female. The streets ran with blood... ten thousand Muslims who had sought sanctuary in the Haram al-Sharif were brutally massacred. Piles of heads, hands and feet were to be seen."(4)

(کیا مرد کیا عورت، انھوں نے ہر کسی کو قتل کرڈالا، سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا، دسیوں ہزار مسلمان جنھوں نے حرم شریف (مسجد اقصیٰ) میں پناہ لی تھی وہ بے دردی کے ساتھ قتل کیے گئے، ہاتھ، پیر اور سروں کے انبار دیکھے جاسکتے تھے)

---

(1) اردو انسائیکلوپیڈیا از قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی/صفحہ: ۶۴۶

(2) A Criminal History Of Mankind, P.170

(3) www.fordham.edu/halsall/source/gesta-cde.html#jerusalem2

(4) Fields Of Blood By Karen Armstrong, P.116

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"So terrible, it is said, was the carnage- which followed that the horses of the crusaders who rode up to the mosque of Omar were knee-deep in the stream of blood. Infants wero seized by their feet and dashed against the walls or whirled over the battlements, while the Jews were all burnt alive in their synagogue."(1)

(بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی جنگجوؤں نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے گھٹنوں گھٹنوں خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا، یہودی کُل کے کُل اپنے ہیکل میں زندہ جلا دیے گئے)(۲)

ایک مؤرخ سلومون رینا چ(Solomon Reinach)طنزاً کہتا ہے:

'It is said that seventy thousand persons were put to death in less than a week to attest the superior morality of the Christian faith."(3)

(یہ کہا جاتا ہے کہ عیسائیت کی اعلیٰ اخلاقیات کی تصدیق کے لیے ہفتہ سے بھی کم عرصہ میں ستر ہزار انسان قتل کیے گئے)

یہ پہلی صلیبی جنگ نتائج کے اعتبار سے کلیسا اور مغرب کے حق میں خاصی کامیاب رہی، نہ صرف یروشلم اس کے قبضہ میں آ گیا بلکہ ایشیاء کے رومی ساحل پر چار نئی ریاستیں بھی قائم ہو گئیں:

۱-سلطنت یروشلم ۲-سلطنت ٹریپولی ۳-سلطنت انطاکیہ ۴-سلطنت ایڈیسا

اس کامیابی نے مغرب کی بیشتر محرومیاں دور کر دیں، بحر روم پر برتری قائم ہوئی، تجارتی راہیں کھلیں، شام وفلسطین کی پیداوار پر قبضہ قائم ہوا، مسیحیت کو وسعت کے مواقع میسر آئے، اور سب سے بڑھ کر کلیسا کے اختیار کردہ دشمن مذہب اسلام کو زبردست نقصان پہنچا۔

پہلی صلیبی جنگ میں مغرب کو جو کامیابی ملی، بعد کی جنگوں میں ویسی کامیابی دوبارہ نصیب نہ ہوئی، بلکہ باقی صلیبی جنگیں مغرب کی عمومی تباہی اور زوال کا باعث ہوئیں:

"In the light of history, we can see that the success of that first crusade was actually a disaster for Europe. It convinced Christendom that the Holy Land could be turned into a kind of Papal State. The result was that over the next two centuries there were eight more crusades, most of which failed miserably."(4)

---

(1) Encyclopaedia Britannica V.6, P.627 *(Crusade)*

(۲) ترجمانی:-حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (تاریخ دعوت وعزیمت:۳/۲۵۵)

(3) A Criminal History Of Mankind P.170

(4) A Criminal History Of Mankind P.170

CamScanner

(تاریخ کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس پہلی صلیبی جنگ میں کامیابی دراصل یورپ کی تباہی تھی، اس سے مسیحیوں میں یہ یقین پیدا ہوگیا کہ ارض مقدس کو "پوپ اسٹیٹ" بنایا جاسکتا ہے، جس کے نتیجہ میں اگلے دوسو برسوں کے اندر مزید آٹھ صلیبی جنگیں لڑی گئیں جو اکثر ذلت آمیز شکست پر ختم ہوئیں)

عمادالدین زنگیؒ

شام وفلسطین میں مسیحی حکومتوں کے قیام سے ہی مسلمانوں میں شدید ردعمل شروع ہوا، یہ زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار وبدنظمی کا زمانہ تھا، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی قائد ایسا نہ تھا جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو، اور جو عالم اسلام کی بچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال ومغرب سے بڑھتے ہوئے اس خطرہ کا مقابلہ کر سکے، لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارا طلوع ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور یہ ذات سلطان عمادالدین زنگی کی تھی جس نے اپنے جوش جہاد اور حسن تدبیر سے صلیبیوں کی کمر توڑ دی۔

لین پول (Lane-Pole) لکھتا ہے:

"It was necessary to preach the Jihad -the Holy War- and to show them a commander whose courage and military genius all must respect, and the Turkuman chiefs and vassals would at once become a Church Militant with whom the Crusaders would have very seriously to reckon. The leader was found in Imad-ed-din Zengy."(1)

(مسلمانوں کے لیے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دلیری اور ہمت اور جنگی قابلیت کا سکہ سب مانے لگیں، ترکمانی سرداروں اور ان کے ماتحت والیان ملک ایک ایسی جوانمرد وجنگجو جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے، اور اب یہ سردار عمادالدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا) (۲)

1144ء میں عمادالدین زنگی نے شام وعراق میں اپنی طاقت منظم ومستحکم کی اور ایڈیسا (Edessa) پر قبضہ کر کے فرات کی وادی کو صلیبیوں سے محفوظ کر دیا، یہ شہر لاطینی سلطنت کا سب سے اہم شہر تھا، صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کے جہاد کی یہ شاندار ابتدا تھی جس کو عمادالدین کے بعد ان کے نامور فرزند نورالدین زنگی نے بہت آگے تک بڑھایا۔

---

(1) Saladin By Stanley Lane-Pool,P.34

(۲) ترجمانی:-حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (تاریخ دعوت وعزیمت:۱/۲۵۵)

نورالدین زنگیؒ

نورالدین زنگیؒ روز اول سے ہی صلیبیوں کے خلاف شمشیر بکف تھے، ایڈیسا میں مسیحیوں کی شکست کی خبریں یورپ میں پہنچیں تو پوپ یوجین سوم (Eugenius III) نے 1146ء دوسری صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا، 1147ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم (Louis VII) اور جرمنی کے بادشاہ کونارڈ سوم (Conrad III) کی قیادت میں نو لاکھ افراد پر مشتمل فوج روانہ ہوئی اور ہنگری سے گذرتے ہوئے ایشیائے کوچک پہنچیں، اس کے بعد صلیبی افواج نے دمشق کا محاصرہ کر لیا لیکن نورالدین زنگی کی فوجی تدبیروں کی وجہ سے صلیبی اپنے مقاصد میں ناکام رہے اور انھیں واپس یورپ کے حدود میں لوٹنا پڑا:

"The Second Crusade was over. By any measure, it was a disaster. Not only did it fail to recapture Edessa, but by its blundering attempt to take Damascus it strengthened the Christians' greatest enemy, Nured-Din."(1)

(دوسری صلیبی جنگ ختم ہوئی، بہر صورت یہ ایک تباہ کن جنگ تھی، نہ صرف ایڈیسا کی بازیابی کی کوششیں ناکام رہیں بلکہ دمش کو فتح کرنے کی سعی نے مسیحیوں کے سب سے بڑے دشمن نورالدین زنگی کو تقویت بہم پہنچائی)

بیت المقدس کی بازیابی

1163ء میں یروشلم کے صلیبی حکمرانوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی مہم چلائی، اس کے مقابلہ کے لیے نورالدینؒ نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ (Shirkuh) کو روانہ کیا، صلیبی جنگوں کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا ذکر تاریخ میں پہلی بار اسی جنگ میں آتا ہے، اس جنگ میں خاطر خواہ کامیابی تو نہ مل سکی البتہ نورالدین زنگی نے دوسری صلیبی سلطنت انطاکیہ کو اگست 1164ء میں تباہ کن شکست دی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی 1167ء میں صلیبیوں کے مدمقابل تھے، مصر میں انھوں نے صلیبیوں کو ایسی شکست دی کہ انھوں نے پورا علاقہ ہی خالی کر دیا، نورالدین زنگی کے بعد 1174ء میں صلاح الدین ان کے جانشین ہوئے، سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد ہی ان کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذت عیش اور روح کی غذا تھی، 1183ء تک انھوں نے مصر و شام کو متحد کر کے ان کی اندرونی رقابتوں کو ختم کر دیا، اس کے بعد پوری یکسوئی سے صلیبیوں کی جانب متوجہ ہوئے۔

صلیبیوں کی دست درازیاں حد سے گذر چکی تھیں، مسلم علاقوں پر تگ وتاز ان کا معمول بن گیا تھا، دمشق تک ان کی دسترس تھی، مدینہ کے نواح تک ان کے قزاق پہنچنے لگے تھے، چنانچہ صلیبی جب مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن گئے تو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبی علاقوں پر شدید حملے کیے، بالآخر

---

(1) The Concise History of the Crusades,P.58

مختلف جنگی کارروائیوں اور مقابلوں کے بعد وہ عظیم معرکہ بھی پیش آیا جو تاریخ میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، جس نے فلسطین کی مسیحی سلطنت کا خاتمہ اور صلیبیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1187ء میں حطین (Hattin) کے بے آب وگیاہ میدان میں صلیبی قوت کو پاش پاش کر ڈالا، اس کے بعد یکے بعد دیگرے تمام اہم شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آتے چلے گئے، پھر وہ مبارک موقع بھی آ گیا جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی یعنی بیت المقدس کی فتح، 20/ستمبر 1187 کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے، اور پورے نوے سال کے بعد مسلمانوں کا یہ پہلا قبلہ اسلام کی تولیت میں آ گیا۔

"Thus fell the Latin kingdom eighty-eight years after Godfrey became the Defender of the Holy Sepulchre.." (1)

(اس طرح گوڈفرے کے ارض مقدس کے پاسبانی کے اٹھاسی سال بعد لاطینی حکومت کا زوال ہو گیا)

صلیبی افواج کی ذلت آمیز شکست پوپ اربن سوم کے لیے موت کا پیغام تھی، اس شکست نے اس کی ساری امیدوں کو چکنا چور کر دیا اور غم واندوہ کی شدت میں وہ گھٹ گھٹ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا:

"Pope Urban III (1185–87) died of grief when he heard the news on October 20, 1187." (2)

(پوپ اربن سوم ۲۰/اکتوبر ۱۱۸۷ء کی خبر سن کر شدت غم واندوہ کی وجہ سے ہلاک ہو گیا)

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی اور دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا اس کا اعتراف خود مسیحی مؤرخین کو بھی ہے:

"when the battle was over he was merciful and generous to his fallen foes." (3)

(جب جنگ ختم ہو گئی تو وہ اپنے شکست خوردہ دشمنوں کے حق میں نہایت رحم دل اور فیاض ثابت ہوا)

"Never did Saladin show himself greater than during this memorable surrender. His guards, commanded by responsible emirs, kept order in every street, and prevented violence and insult, in so much that no ill-usage of the Christian was ever heard of. Every exit was in his hands, and a trusty was set over Davit's gate to receive the ransoms as each citizen came forth." (4)

---

(1) Encyclopaedia Britannica V.6,Pp.628 *(Crusade)*

(2) The Concise History of the Crusades,P.77

(3)The Story History of France By John Bonner P.86

(4) Saladin By Stanley Lane-Pool,P.230

(صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ (جنگجو) ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جارہا تھا اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار جو اس کے تحت تھے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم وزیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ کوئی ایسا واقعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ ہر شہر والے کو جو فدیہ ادا کر چکا ہے باہر جانے دے)

"Saladin may have been forgotten in the Middle East, but he was very well remembered in western Europe. In part, this was because his manners and actions seemed to have much in common with a chivalric knight."(1)

(ممکن ہے صلاح الدین کو مشرق وسطی میں فراموش کر دیا جائے لیکن مغربی یورپ میں وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے، اپنے اعلی اخلاق وکردار کی وجہ سے جو اصول پسند جنگجوؤں کا طرۂ امتیاز ہے)

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ وغضب کی آگ بھڑک اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر ابل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما اور مشہور بادشاہ وسپہ سالار شامل تھے، شاہ جرمنی فریڈرک (Frederick) شاہ فرانس فلپ اگسٹس (Philip Augustus) اور شاہ انگلستان رچرڈ شیر دل (Richard) نے بنفس نفیس اس جنگ میں شرکت کی، پادریوں اور راہبوں نے قریہ قریہ گھوم کر عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا، پوپ گریگوری ہشتم (Gregory VIII) کی جانب سے یہ تیسری صلیبی جنگ (Third Crusade) کا اعلان تھا، آخر پانچ سال کی مسلسل خونریز وخوں آشام لڑائیوں کے بعد جب دونوں حریف تھک کر چور ہو گئے تو 1192ء میں مقام رملہ پر صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ علاقے بدستور ان کے قبضے میں رہے، البتہ ساحل پر عکہ/عکرہ (Acre) کی ایک مختصری ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اس طرح صلیبیوں کی ناکامی کے ساتھ تیسری صلیبی جنگ بھی اختتام کو پہنچی:

"The Holy War was over, the five years' contest needed before the great victory of Hittin in July 1187, not an inch of Palestine west of the Jordan was in the Moslem's hands. After the peace of Ramla in September 1192, the whole land was theirs, except a narrow strip of cost of Tyre of Jaffa."(2)

(جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی، پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک انچ زمین بھی نہ تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے تو

---

(1) The Concise History of the Crusades,P.202

(2) Saladin By Stanley Lane-Pool,P.358

صور سے لے کر یافا تک ساحل پر بجز زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا)(۱)

قسطنطنیہ کی پامالی

چوتھی صلیبی جنگ (Forth Crusade) کے لیے جو فوج جمع ہوئی اس کا حقیقی ہدف عالم اسلام کے بجائے مشرقی عالم مسیحیت بنا، صلیبیوں نے 1204ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کر کے اسے پامال کر ڈالا:

"On 12 April 1204, thousands of western knights broke into the city and in spite of their crusading vows, subjected its Christian population to a horrific three day riot of violence, rape and plunder."(2)

(12/اپریل 1204ء کو ہزاروں مغربی جنگجو شہر میں گھس گئے، صلیبی پاسداری کے عہد کے باوجود وہ تین دن تک مسیحی آبادی کے قتل وغارت، عصمت دری اور لوٹ مار میں سرگرم رہے)

اس جنگ میں صلیبیوں نے انسانیت کی ساری حدیں پار کر دیں اور خود اپنے ہی مذہب کے پیروکاروں کے ساتھ زبردست حیوانیت کا مظاہرہ کیا جو مغرب کی پیشانی پر آج بھی ایک بدنما داغ ہے:

"1204, which was followed by riot and carnage altogether disgraceful to Western chivalry."(3)

(1204ء میں قتل وفساد کا ایسا دور چلا کہ آج بھی مغربی دنیا کے لیے وہ باعث شرم وعار ہے)

"Oaths sworn on the Gospels to leave women and ecclesiastical buildings unmolested were forgotten in the frenzied anarchy."(4)

(عورتوں اور مسیحی عمارتوں کو نقصان نہ پہنچانے کی وہ قسمیں جو انجیل پر اٹھائی گئی تھیں، ان کی جنونیت میں یکلخت فراموش کر دی گئیں تھیں)

بداخلاقی اور فحاشی کے نشہ میں وہ اس قدر بدمست تھے کہ:

"ایک فرانسیسی داشتہ کو بطریق اعظم کے تخت پر بٹھا دیا گیا، جس نے لوٹ مار کرنے والوں کو فحش ناچ گانوں سے محظوظ کیا۔"

(A French prostitute was put on the throne of the patriarch, where she provided entertainment for the looters with her bawdy songs and high-kicking dances.)(5)

تیرہویں صدی عیسوی صلیبی جنگوں سے پر ہے جو یروشلم کے سوا دیگر مقامات پر لڑی گئیں، اس صدی کے نصف سے ایک نئی قوت "مملوک" ابھری، اس کے حکمرانوں نے 1268ء میں انطاکیہ 1289ء میں ترپولی اور

---

(۱) ترجمانی: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (تاریخ دعوت وعزیمت: ۳/۲۷۰)

(2) The Crusades - The war for the Holy Land By Thomas Asbridge, P.2965

(3) Encyclopaedia of Britannica v.6, P.629 *(Crusades)*

(4,5) A Concise History of the Crusades By Thomas, P.112

1291ء میں آخری صلیبی مورچہ عکرہ (Acre) کو فتح کر کے صلیبی جنگوں کا باب بند کر دیا۔

سینٹ لوئس کی وصیت

"Louis IX of France, the most zealous crusader king in history."(1)

(فرانس کا لوئیس نہم تاریخ میں نہایت ہی سرگرم صلیبی بادشاہ تھا)

1248ء میں فرانس کے نویں بادشاہ سینٹ لوئس (Saint Louis IX) نے پاپائے روم انوسینٹ چہارم (Innocent IV) کی ترغیب پر ساتویں صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا، اس جنگ میں نہ صرف اس کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا بلکہ 1250ء میں وہ خود گرفتار ہو گیا۔ تقریباً چار سال بعد جب وہ آزاد ہو کر واپس فرانس پہنچا تو اس نے اپنے ارباب حل وعقد کے سامنے اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایک لائحۂ عمل پیش کیا، اس لائحۂ عمل کا مسودہ شہنشاہ کے وصیت نامہ کی حیثیت سے آج بھی پیرس کے "دار الوثائق القومیة" میں موجود ہے، اس وصیت نامہ میں بطور اصول کے اس کی وضاحت ہے کہ مسلمانوں کو جنگوں کے ذریعہ شکست دے کر مفتوح ومغلوب کرنا تقریباً ناممکن ہے، اس لیے ان پر فتح اور غلبہ کے حصول کے لیے یہ لائحۂ عمل اور پالیسیاں اختیار کی جانی چاہیے:

۱-اشاعة الفرقة بين قادة المسلمين، واذا حدث فيعمل على توسيع شقتها ما أمكن حتى يكون هذا الخلاف عاملا في اضعاف المسلمين۔

(مسلمان قائدین کے درمیان تفرقہ ڈالنا، اور پھر جہاں تک ممکن ہو ان ٹکڑوں کو بھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اس طرح بانٹ دینا کہ ان کی قوت بکھر جائے)

۲-افساد أنظمة الحكم في البلاد الاسلامية بالرشوة والفساد والنساء حتى تنفصل القاعدة عن القمة۔

(اسلامی ملکوں میں حکومت کا نظام ابتر کرنا، اور اس کے لئے رشوت ستانی، فساد، اور بے حیائی کو اس طرح عام کر دینا کہ چول اپنی جگہ سے ہٹ جائے)

۳-الحيلولة دون قيام جيش قوي مؤمن برسالته وحق وطنه يضحي في سبيل مبادئه (يعني الاسلام)۔

(کسی ایسی جماعت یا لشکر کو ہرگز منظم نہ ہونے دینا جو اسلامی پیغام پر ایمان راسخ رکھتا ہو اور اپنے ملک ووطن کے حق کو سمجھتا ہو، اور دین کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو)

۴-العمل على قيام دولة غربية في المنطقة العربية تمتد مابين غزة جنوبا الى انطاكيه شمالا، ثم تتجه شرقا، وتمتد حتى تصل الى الفرب"

(1) The Crusades - The war for the Holy Land By Thomas Asbridge,P.1807

(ایسے یورپین ایمپائر کا قیام جو جنوب میں غزہ سے لے کر شمال میں انطاکیہ تک چلا گیا ہو اور پھر مشرق میں اس کی سرحدیں اس قدر وسیع ہوں کہ وہ یورپ تک پہنچ جائے)۔ (۱)

دو صدیوں پر محیط یہ صلیبی جنگیں جو مسلمانوں پر بے جا طور پر مسلط کی گئیں تھیں اپنے ساتھ زبردست تباہی و بربادی لے کر آئیں، مذہبی جنونیوں نے دنیا کی ایک کثیر آبادی کو آہ وفغاں اور انتہاہ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ یورپ کا جنگی جنون جب سرد پڑا تو انھیں کلیسا کے اثر ورسوخ کا ادراک بھی ہوا، جس کے نتیجہ میں "اصلاح کلیسا" جیسی تحریکیں برپا ہوئیں اور کلیسا کے خلاف بغاوت کا عمومی رجحان پروان چڑھا۔

صلیبی جنگوں کی باعث یورپ کا واسطہ مسلمانوں سے پڑا تو ان کی علمی وتہذیبی ترقیاں دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، اسلامی تمدن سے آشنا ہو کر ان کی ذہنی کیفیت میں انقلاب پیدا ہوا، اور احیائے علوم کے لیے یورپ میں فضا سازگار ہوئی، اور شہنشاہ لوئیس کی وصیت کے بعد ارباب کلیسا نے اسلامی علوم کے حصول کی عمومی اجازت دے دی، اور مسلمانوں سے فکری محاذ پر لڑنے کے لیے ہتھیار تیار کیے جانے لگے کہ موجودہ "الغزو الفکری" کی بنیادیں ہیں۔

استشراق اور مستشرقین

صلیبی جنگوں میں مسلسل پسپائی نے پورے یورپ کو سراسیمہ وششدر کر دیا تھا، کلیسا میں اضطراب و بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی، معاشرہ کا ہر فرد ماتم کناں تھا، خاص کر وہ طبقہ جس کے دل ودماغ کو کلیسا نے اسلام دشمنی سے بھر رکھا تھا، چنانچہ ہر سطح پر شکست وریخت کا جائزہ لیا گیا، حالات کا تجزیہ ہوا، مسلم افواج کی کامیابی وثابت قدمی اور ان کے مقابل میں صلیبی فوجوں کے انتشار وپراگندگی کے اسباب کا مطالعہ کیا گیا، مغربی مفکرین نے مسلح تصادم کی اس ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عالم اسلام کی قوت واستحکام محض شمشیر وسناں کی بدولت نہیں بلکہ اس میں نظریاتی عنصر بھی شامل ہے، اور پھر کلیسا کے سامنے تین طرح کے موقف ظاہر ہوئے:

پہلا موقف یہ کہ مغرب فلسطین ومصر کی طرح اسلام قبول کر لے، دوسرا یہ کہ اسپین کی طرح مسلم بالادستی قبول کر کے ثانوی حیثیت اختیار کر لے، اور تیسرا موقف یہ کہ رومن کی سابقہ روایات کے مطابق اسلام کا مقابلہ کرے اور مختلف میدانوں میں اسلامی قوت کو چیلنج کرے۔ آخرش کلیسا نے اپنے پادریوں اور اصحاب علم ودانش کے مشوروں کے بعد دو طرح کے اقدام کیے:

۱) مشرقی علوم وفنون کے حصول کی اجازت اور اس کی ترغیب دی اور اسے مسلمانوں کے خلاف ایک ہتھیار کے

---

(۱) الغزو الفکری – التحدی والمواجهة لدکتورا سماعیل علی محمد/۳۰۲۹
ترجمانی بلال عبدالحی حسنی ندوی (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی – دعوت وفکر کے اہم پہلو/۳۰)

طور پر استعمال کیا، اس نظریاتی جنگ کو اصطلاحی طور پر "الاستشراق" (Orientalism) کہتے ہیں۔

۲) مسلم و دیگر اقوام کو مسیحی بنانے کا فرمان جاری کیا جسے "نظریۂ دریافت" (View of Discovery) کہا جاتا ہے، اس فرمان کی دو عملی دو شکلیں اختیار کی گئیں:

۱۔ مسیحیت کو دنیاوی منافع سے مربوط کر کے پیش کیا گیا اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مسیحی بنانے کے لیے انجیل کی دعوت و تبلیغ شروع کی گئی، جس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے اور صحیح غلط عقلی و نقلی دلائل سے اسے پرکشش بنایا گیا جسے اصطلاحی طور پر "التبشیر" (Evangelization) کہا جاتا ہے۔

۲۔ مسیحیت کی اشاعت طاقت و تلوار کے زور پر کی گئی اور ضرورت پڑنے پر مختلف قسم کے مظالم کو بھی روا رکھا گیا، اس طریقۂ تسخیر کو Colonialism بھی کہتے ہیں، اور اسی مفہوم کو عربی زبان میں "الاستعمار" (سامراج) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

استشراق

مغربی علماء و مفکرین جب مشرقی علوم و فنون کو اپنی تحقیق و تفتیش کا محور بناتے ہیں تو اسے عربی زبان میں 'الاستشراق" (Orientalism) کہتے ہیں اور ایسے عالم کو "المستشرق" (Orientalist) کہا جاتا ہے۔

استشراق کا لفظ "شرق" سے مشتق ہے جس سے مراد مشرق ہے، یعنی وہ علاقے جہاں سورج پہلے طلوع ہوتا ہے، انگریزی میں اس مفہوم کے لیے "Orient" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اہل یورپ کے یہاں اس سے وہ تمام علاقے مراد ہیں جو یورپ سے مشرق کی سمت میں واقع ہیں، اس مفہوم میں ایشیاء کے تمام ممالک داخل ہیں، چنانچہ "Merriam Webster Dictionary" کی وضاحت ہے:

"Orient: The East, also, the countries of Asia."

(اورینٹ سے مراد مشرق، نیز ایشیاء کے ممالک ہے)

لفظ شرق کو جب عربی قواعد میں استفعال کے وزن پر لایا جائے تو "استشراق" بن جاتا ہے جس میں طلب کا مفہوم پایا جاتا ہے، گویا استشراق سے مراد مشرق کی طلب ہے، اور عربی لغات کے رو سے مشرقی علوم، آداب، لغات و ادیان سب اس طلب کا محور ہیں۔

چنانچہ عربی لغت "المنجد" کے مطابق:

"المستشرق: العالم باللغات والآداب والعلوم الشرقية والاسم الاستشراق"

(مشرقی زبان اور علوم و آداب کے عالم کو مستشرق کہا جاتا ہے اور اس علم کا نام استشراق ہے)

اور انگریزی لغت "WordWeb Dictionary" کے مطابق:

"Orientalism: The scholarly knowledge of Asian cultures and languages and people."

(ایشائی ثقافت اور زبان وعوام کے عالمانہ مطالعہ کا نام استشراق ہے)

استشراق کا لفظ پہلی مرتبہ 1630ء میں ایک یونانی پادری کے لیے استعمال ہوا، 1799ء میں فرنچ زبان میں اور پھر 1838ء میں انگریزی زبان میں اس لفظ کا عام استعمال شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں علمائے اسلام نے استشراقی تحریک کا زبردست تعاقب کیا جس کے نتیجہ میں مستشرقین اپنے لیے استشراق کا لفظ ناپسند کرنے لگے، چنانچہ 1973ء کو جب پیرس میں مستشرقین کی ایک عالمی کانفرنس بعنوان: "المؤتمرات العالمية للدراسات الآسيوية والشمال افريقيا" منعقد ہوئی تو اس میں مستشرقین کی اصطلاح کو ترک کرنے کا اجتماعی فیصلہ صادر ہوا، اور آئندہ کے لیے "المستعربون" (Arabists) یا "الاسلاميون" (Islamists) یا "الباحثون في العلوم الانسانية" (Humanists) یا "ماہرین مطالعہ ممالک" (Area Studies Experts) وغیرہ جیسی اصطلاحات کے حسب ضرورت استعمال پر اتفاق ہوا۔ (۱)

مستشرقین کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم ان میں سے چند مستشرقین کے نام اور ان کے موضوعات درج کیے جاتے ہیں جنھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی:

رچرڈ بیل (Richard Bell) (قرآنیات) ریجس بلاچیر (Regis Blacher) (مصادر قرآن) جوزف شاخت (Joseph Schacht) (فن حدیث) ولیم میور (William Murir) (فن سیرت) کارل برکلمان (Carl Brockelmann) (فن تاریخ) ڈنکن میگڈونلڈ (Duncan McDonald) (فقہ اسلامی)، وغیرہ۔

استشراق کی ابتدا

استشراق کی ابتدا کب ہوئی، اس سلسلہ میں مؤرخین ومحققین کی آراء میں خاصا اختلاف ہے، البتہ معروف قول کے مطابق مشرقی علوم سے استفادہ کا باقاعدہ سلسلہ دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا، مغرب کے بعض راہب علم وثقافت کے حصول میں اندلس پہنچے اور انھوں نے وہاں کی تہذیب وثقافت اور علوم ونظریات سے بھرپور استفادہ کیا، ان راہبوں میں جربرٹ ڈی اوریلک (Gerbert D'Oraliac) سب سے زیادہ معروف ہے:

---

(۱) اسلام اور مستشرقین از پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد زبیر (لاہور) صفحہ:۶

"Gerbert (Sylvester II), who is indebted for his knowledge to the Arabians."(1)

(جربرٹ (سلویسٹر ثانی) علوم عربیہ کا رہین منت ہے)

جربرٹ اندلس کی جامعات سے بھرپور استفادہ کے بعد 999ء سے 1003ء تک پاپائیت کے منصب پر بھی فائز رہا اور "پوپ سلویسٹر ثانی" (Pope Silvester II) کے لقب سے مشہور ہوا۔(۲)

جربرٹ (Gerbert) کے علاوہ مغرب کے متعدد علماء و راہب اندلس گئے اور وہاں مسلمانوں اور عربوں کے علوم سے استفادہ کیا اور پھر اپنے علاقوں میں واپس آ کر اسلامی تہذیب وثقافت اور عربی زبان وعلوم کے متعدد ادارے قائم کیے، ان میں خاص طور پر پطرس کلونی (Peter Cluny) رابرٹ آف کیٹن (Robert of Ketton) اور گیرارڈ ی گریمون (Gerard De Germone) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

استشراق کا ابتدائی دور مشرقی علوم کی منتقلی کا دور ہے، اس دور کا آغاز اسپین میں طلیطلہ (Toledo) کے سقوط (1085ء) سے ہوتا ہے، جس کا امتداد تیرہویں صدی عیسوی تک ہے، طلیطلہ ایک عظیم علمی مرکز تھا، اس کے سقوط کے بعد وہاں کے نادر کتب خانے عیسائیوں کے قبضے میں آئے، جس کے بعد مسلم علوم کی لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں منتقلی کا کام شروع کیا گیا۔ 1143ء میں رابرٹ آف کیٹن (Robert of Ketton) نے پطرس کلونی کی ایماء پر پہلی مرتبہ قرآن کا لاطینی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔

بارہویں صدی کی ابتدا میں ریمنڈ مارٹین (Raymond Martin) ایک مشہور راہب تھا جس نے مسلمانوں سے علم کلام سیکھا اور پھر اسلام کے خلاف ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا: "خنجر الایمان" (Dagger of the true religion)۔

ریمنڈ مارٹین نے خود بعض عربی کتابوں کو لاطینی زبان میں منتقل کیا، نیز اس نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا جو عربی سے لاطینی میں تراجم کے فرائض انجام دیتا تھا، اس میں مغربی اہل قلم اور یہودی مترجمین کے علاوہ مسلم علماء بھی ملازم تھے، یہ ادارہ تقریباً ایک صدی تک قائم رہا، اس کا سربراہ ایک اطالوی شخص جرارڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona) تھا جس نے خود نوے (90) سے زائد کتابوں کا ترجمہ کیا، اس کی مترجمہ کتابوں کی فہرست میں بطلیموس کی معروف کتاب الماجست (Almagist) ابن حنین کا "ترجمۂ جالینوس" (Translation of Galen) ابن سینا کی "القانون" (The Canon) الخوارزمی کی "الجبر والمقابلة" الکندی کی تصنیفات

---

(1) History of Philosophy By Alfred Weber, P.211

(2) A Rationalist Encyclopaedia, P.241

اور الزہراوی کی جراحی اور تشریح الاعضاء پر مشتمل کتابیں شامل ہیں۔ (۱)

"During the twelfth century, translators gradually increased the number of Greek books available to Western students"(2)

(بارہویں صدی میں مترجمین یونانی کتابوں کے تراجم میں بتدریج اضافہ کرتے گئے اور یہی کتابیں مغرب میں طلباء کو میسر آئیں)

تیرہویں صدی میں اسپین میں شاہ الفانسو دہم (Alfanso X) کی سرپرستی میں تراجم کی مہم زوروں پر رہی، اس کے درباریوں میں بکثرت مترجم تھے، اس نے عربوں کی مدد سے فلکیات کے جدول تیار کرائے جسے "Armillary Sphere" کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں مائیکل اسکاٹ (م1232ء) نے ابن رشد اور ابن العربی کی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ایک مترجم رابرٹ نے الخوارزمی کے الجبرا کے علم کو لاطینی میں منتقل کیا۔

انگریز فلسفی راجر بیکن (Roger Bacon) کی عالمی شہرت اس کے اہم دریافتوں کے حوالہ سے ہوئی جو سب کی سب عربوں سے ماخوذ ہیں خاص کر بصریات کے موضوع پر جو کارنامے ہیں ان کی بنیاد ابن الہیثم کے نظریات پر تھی، اس ناحیہ سے اسے عربوں کا شاگرد کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ (۳)

تیرہویں صدی کے نصف سے تراجم کا کام سست پڑ گیا، اور عربی علوم وفنون کی منتقلی کا طویل سلسلہ کئی صدیوں بعد تھم سا گیا، لیکن اس وقت تک یورپ کا ہر علمی شعبہ عربوں کا مرہون منت بن چکا تھا، اور اہل یورپ کا سارا علمی انہماک انہیں علوم کی از سر نو تدوین وتحقیق تک محدود ہو گیا۔

علوم شرقیہ سے استفادہ کا یہ سلسلہ استشراق کی انفرادی کوششیں تھیں، اور ان کوششوں کا بنیادی مقصد یورپ کو جہالت کی تاریکی سے باہر نکالنا اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو اختیار کرنا تھا۔ انفرادی استشراق کی یہ کوششیں یورپ کے تاریک آسمان پر چمکتے ہوئے چند ستاروں کی مانند تھیں جن سے ظاہری خوبصورتی میں اضافہ تو ہو سکتا ہے لیکن تاریک راہوں میں روشنی کا کام نہیں لیا جا سکتا، کیونکہ اس وقت علم وثقافت پر کلیسا کی بالادستی قائم تھی، اور اس کی مرضی کے بغیر کسی بھی طرح کا علم حاصل کرنا سنگین جرم تھا جس کے نتائج بہت ہی ہولناک تھے۔

کلیسا کی سرپرستی

صلیبی جنگوں کے بعد مغربی مفکرین اور کلیسائی رہنماؤں نے پوری سنجیدگی سے اپنی شکست وریخت اور

---

(۱) تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام (مترجم) از ڈاکٹر فواد سیزگین صفحہ: ۱۵۸
Islam and the West By Philip K. Hitti P.72

(2) A History of Western Philosophy, P.440

(۳) تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام (مترجم) از ڈاکٹر فواد سیزگین صفحہ: ۱۶۳

CamScanner

مسلمانوں کے غلبہ واستحکام کا جائزہ لیا، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ عالم اسلام کی قوت واستحکام محض شمشیر وسناں کی بدولت نہیں بلکہ اس میں مذہبی ونظریاتی عنصر کا بڑا حصہ ہے، چنانچہ ان کے سیاسی ومذہبی اقتدار کا مقابلہ انہیں خطوط پر ممکن ہے جو شہنشاہ لوئس نہم نے پیش کی تھیں، اس سلسلہ میں نمایاں ترین نام مشہور مفکر وفلسفی روجر بیکن (Roger Bacon) اور ریمنڈلل (Raymond Lull) کا پیش کیا جاتا ہے۔

روجر بیکن (Roger Bacon) وہ انگریز اسکالر ہے جس نے مسیحی دنیا کی توسیع واضافہ کے لیے "تبشیر" (Evangelization) کو بہترین لائحۂ عمل قرار دیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اسلامی لغات کی معرفت کو لازمی شرط قرار دیا۔ اس نے مشرقی وعربی علوم کی طرف پر پوری توجہ مرکوز کی اور کلیسا کو اس سلسلہ میں قانع کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن اپنے بعض نظریات کی وجہ سے وہ خود کلیسا کا مطعون ٹھہرا اور محکمۂ احتساب نے اسے قید خانہ میں ڈال دیا، اس طرح اس کے نظریات رد کر دیے گئے۔

روجر بیکن کے بعد ریمنڈلل (Raymond Lull) وہ پہلا شخص ہے جس نے کلیسا کو دعوت دی کہ علوم شرقیہ کے مطالعہ کو روحانی صلیبی جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے:

"It was a Catalan, Raymundus Lullus, who first attempted to promote the development of Oriental studies at the instrument of a pacific crusade in which the arms should be entirely spiritual."(1)

(کٹالی ریمنڈلل وہ پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے علوم شرقیہ کو صلیبی جنگوں میں روحانی ہتھیار کے طور پر اختیار کرنے پر زور دیا)

ریمنڈلل کے نظریہ کو شہنشاہِ وقت نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے عملی جامہ بھی پہنایا، اور اس مقصد کے تحت ایک خانقاہ بھی قائم کی جس میں راہبوں کی خاص جماعت کو مشرقی علوم وثقافت میں مہارت پیدا کرنے پر مامور کیا گیا:

"The king welcomed the idea, and in the year 1276 such a monastary was opened and thirteen monks began to study Lull's method and imbibe Lull's spirit."(2)

(شہنشاہ نے اس کے نظریہ کو قبول کرتے ہوئے 1276ء میں ایک خانقاہ کا آغاز کیا اور تیرہ راہبوں نے لل کے طریقہ پر مطالعہ کی شروعات کی اور اس کی روح کو اپنے اندر سمولیا)

کونسل آف ویانا

1311-12ء میں کونسل آف ویانا (Council of Vienne) کے نام سے کیتھولک چرچ کی پندرہویں

---

(1) The Legacy of Islam By Sir Thomas Arnold, PP.64,65

(2) Raymund Lull By Samuel M. Zwemer, PP.65,66

کونسل منعقد ہوئی، اس کونسل میں راجر بیکن اور ریمنڈلل کے افکار ونظریات کی بنیاد پر ''استشراق'' کو منصوبہ بند طریقہ پر اختیار کیا گیا، اور اس کونسل کی قرارداد کے مطابق یورپ کی یونیورسٹیز میں عربی زبان کے شعبے قائم کیے گئے:

" passed a decree that professorships of the Oriental languages should be endowed in the universities of Paris, Salamanca, and Oxford, and in all cities where the papal court resided."(1)

(کونسل نے یہ قرارداد منظور کی کہ پیرس، سلمانکا، اور آکسفورڈ، اور پاپائیت کے زیر انصرام تمام علاقوں کی یونیورسٹیز میں مشرقی زبانوں کے عہدے قائم کیے جائیں)

کونسل آف ویانا کے بعد کلیسا نے مسلمانوں کے خلاف سرد جنگ کو اور تیز کر دیا، اور پھر بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، اغراض ومقاصد کا تعین ہوا، طریقۂ کار طے کیے گئے، علوم شرقیہ کے بامقصد مطالعہ کا دور شروع ہوا، یونیورسٹیز میں عربی زبان وادب اور مشرقی علوم کے شعبے قائم ہوئے، اور ایسے ماہرین پیدا ہونے لگے جن کا متعین مقصد یہ تھا کہ وہ عیسائیت کی ترویج واشاعت اور اسلام کی بیخ کنی کے لیے مسلسل کوششیں کریں اور دوسروں کو مواد بہم پہنچائیں، اس طرح استشراق نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کی، اور کلیسا و مغربی حکومتوں نے اس کی مکمل سرپرستی کی:

''مستشرقین کی پہلی کانفرنس 1873ء میں پیرس میں ہوئی تھی، اس کے بعد کانفرنسوں کے انعقاد کا یہ سلسلہ جاری رہا، ان کانفرنسوں میں ہر شخص کو آنے کی اجازت تھی، مگر 1973ء میں پیرس میں ہونے والی کانفرنس میں یہودی مستشرق برناڈ لوئس (Bernard Lewis) نے یہ تجویز پیش کی آئندہ صرف اہل مغرب کو ہی ایسی کانفرنسوں میں شرکت کی اجازت دی جائے، یہ تجویز منظور کر لی گئی، چنانچہ اب مستشرقین کی کانفرنسیں بند کمروں میں ہوتی ہیں، جن کا مقصد آزادئ فکر اور علمی تحقیق کے نام پر مسلمانوں اور ان کے وسائل پر غلبہ کو مضبوط تر بنانا اور مستقبل کے بارے میں اپنے ارادوں کو مخفی رکھنا ہے۔''(۲)

الغرض مستشرقین کا وجود کوئی اتفاقی امر نہ تھا، وہ ایک ایسے معاشرہ کے ذمہ دار اصحاب فکر تھے جو صدیوں سے عالم اسلام کے خلاف حالت جنگ میں مبتلا تھا، اور عالم اسلام کو کسی بھی صورت میں نابود یا کم از کم مغلوب کرنے پر تلا تھا، جس نے اپنی کمزوری کی تشخیص کر لی تھی اور جسے اپنے دشمن کی برتری کے راز معلوم ہو چکے تھے، اور جس نے اپنی کمزوری کو رفع کرنے اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کا جامع منصوبہ تیار کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا، علوم شرقیہ کا مطالعہ اسی جنگی منصوبہ کا ایک اہم حصہ تھا، اور مستشرقین اس روحانی صلیبی جنگ کے ہراول دستے (Pioneers) تھے، جن کا فرض تھا کہ دشمن کے ان کمزور مقامات کی دریافت کریں جہاں سے دشمن پر حملہ آور ہوا

---

(1) Raymund Lull By Samuel M. Zwemer, P.76

(۲) تکملہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) جلد اول، صفحہ: ۵۷۱

جا سکے، اور ان مستحکم مقامات کی نشاندہی کریں جہاں سے نقصانات یقینی ہوں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ استشراق کی بنیادوں میں یہودی عناصر بھی پوری طرح شامل ہیں، یہودی ابتداء ہی سے مسلمانوں کے ہم نشیں اور ان کی مملکت کے اہم باشندے تھے، عربی زبان سے اچھی واقفیت کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، مسیحیوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا، اور عربی کتابوں کی منتقلی کے لیے یہودی مترجمین کا سہارا لیا، چنانچہ پہلے تو یہودیوں نے خود ان علوم سے اسلامی اثرات کو دور کرنے کی کوشش کی پھر عیسائیوں نے انھیں اپنے رنگ میں رنگ کر اپنی جانب منسوب کر لیا اور جن علوم کو اپنی جانب منسوب نہ کر سکے انھیں یونانی الاصل قرار دے کر اپنی میراث ٹھہرالیا۔

اسباب ومحرکات

استشراق کا دائرہ کار اور اس کے اغراض ومقاصد بہت وسیع ہیں، انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اس کی مضبوط گرفت اور گہری چھاپ ہے، اس تحریک کے اسباب ومحرکات کو کئی اعتبارات سے تقسیم کیا جا سکتا ہے، تاہم بنیادی طور پر اس کے درج ذیل اسباب ومحرکات ہیں:

مذہبی محرکات (Religious Motives)

کلیسا اور اس کے متولیوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام کا چہرہ مسخ کرنے اور اس کے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے لیے مشرقی علوم وفنون کی طرف توجہ دی، تاکہ مسیحیت کی برتری اور اس کی ترجیح خود بخود ثابت ہو سکے اور نئے تعلیم یافتہ افراد اور نئی نسل کے لیے مسیحیت میں کشش پیدا ہو سکے، چنانچہ استشراق اور تنصیر دونوں تحریکیں اکثر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

جرمن مستشرق روڈلف روڈی پارٹ (Rudolf Rudi Paret) کا کہنا ہے:

"معاصر استشراقی جدوجہد کا مقصود دین اسلام کو باطل ثابت کرنا اور مسلمانوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرنا ہے۔"

ان مستشرقین میں عمومی طور پر پادری شامل ہیں، تاہم ایک بڑی تعداد ان علماء کی بھی ہے جو نسلاً و مذہباً یہودی ہیں؛ ان یہودی مستشرقین میں گولڈزیہر (Goldziher) (1850-1921ء) نولڈیکے (Theodor Noldeke) (1836-1930ء) ریجس بلیچر (Regis Blacher) (1900-1973ء) اور ویلہاؤزن (Wellhausen) (1844-1918ء) وغیرہ شامل ہیں۔

استعماری محرکات (Imperialistic Motives)

انیسویں صدی میں تقریباً تمام عالم اسلام مغربی استعمار کا حصہ بن گیا، مشرق پر اپنے غلبہ واقتدار کو قائم رکھنے

کے لیے مغربی حاکموں نے مشرقی علوم وفنون اور تاریخ ولغات کی طرف خصوصی توجہ دی تا کہ غلام ومحکوم قوم کی نفسیات وزبان کو سمجھتے ہوئے ان سے خدمت لی جاسکے۔اس عنوان سے دو مستشرقین سب سے زیادہ مشہور ہوئے،ایک کارل ہائزش بیکا(Carl Heinrich Becket)(1876-1933ء)جوافریقہ میں جرمن استعمار کی خاطر سرگرم تھا،اور دوسرا مستشرق کرسٹیان(Christian Snouck Hurgronje)(1857-1396)جو ہالینڈ کی حکومت کی طرف سے مکہ مکرمہ میں بعدازاں انڈونیشیا میں عبدالغفار کے نام سے اپنی خدمات پیش کرتا رہا۔

امریکی استعمار کے نمائندہ مستشرقین میں مسٹر ایچ اے آر گب (Hamliton Alexander Rosskeen Gibb)(1895-1971ء) کا نام سب سے نمایاں ہے،گب کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کے استعماری مشن کو قائم رکھا،اِن شاگردوں میں برناڈ لیوس(Bernard Lewis)کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

علمی محرکات(Academic Motives)

مستشرقین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس نے اپنے علمی ذوق وشغف کے ماتحت مشرقی علوم کی طرف توجہ دی،اور اس میدان میں دیدہ ریزی،دماغ سوزی اور جفاکشی سے کام لیا،اور اپنی انتھک محنت کے ذریعہ بہت سے اسلامی علمی جواہرات ونوادر کو پردۂ خفا سے نکال کر منظر عام پر لائے،مثال کے طور پر طبقات ابن سعد،تاریخ طبری،تاریخ کامل لابن اثیر،فتوح البلدان وغیرہ پہلی مرتبہ انہیں مستشرقین کی کوششوں سے یورپ میں شائع ہوئیں۔اس علمی اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان مستشرقین کا بنیادی مقصد علوم اسلامیہ میں کمزوریوں کو تلاش کرنا اور اپنے دینی یا سیاسی مقاصد کے تحت ان کو نمایاں کرنا تھا،اس سلسلہ میں فرانسیسی مستشرق موریس بکائے(Maurice Bucaille)(1920-1998ء)اور جرمانس(Germanus Gyula) (1884-1979)وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اقتصادی محرکات(Economical Motives)

قدرتی طور پر استشراق کا ایک اہم محرک اقتصادی بھی ہے،بہت سے مستشرقین اسے ایک کامیاب پیشہ کے طور پر بھی اختیار کرتے ہیں،یورپ وایشیاء میں اسلامیات ومشرقیات پر لکھی کتابوں کی بڑی منڈیاں ہیں،اس لیے ناشرین ایسے قلم کاروں کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے،آج بھی بڑی سرعت کے ساتھ ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بڑی مالی منفعت اور کاروباری ترقی کا ذریعہ ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مستشرقین نے نہ صرف نظریاتی ضروریات کے لیے مواد فراہم کیا بلکہ ان کی مساعی کی بدولت مغرب کو سیاسی واقتصادی سہولتیں بھی میسر ہوئیں،انھوں نے ایشیا اور افریقہ کی تہذیبوں اور ان کے علوم پر

بڑی تحقیقات کیں، قبل تاریخ کی گمشدہ تہذیبوں کا سراغ لگایا، مردہ زبانوں کو معانی دیے، تاریخ انسانی کی فراموش کڑیوں کا احیاء کیا، دنیا کی اکثر زبانوں کے علمی خزانے اپنی زبانوں میں منتقل کیے، ان کی تحقیقات وکاوشوں کا موجودہ علوم کے ارتفاع میں ناقابل انکار حصہ ہے لیکن ان سب اعترافات کے باجود یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ وہ اپنی تاسیس کے اعتبار سے اسلام سے سرد جنگ لڑنے کے لیے تیار تھے، اور ان کی ساری تگ ودو اور کوششوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے، اور وہ اسلام کے بارے میں شک وشبہ میں پڑ جائے، یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ اسلام موجودہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ (۱)

الغرض تحریک استشراق کی گذشتہ تین صدیوں (اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی) کے علمی کارناموں کا جائزہ یہی بتلاتا ہے کہ استشراق اہل مغرب کی جانب سے مشرق اور اس کے وسائل کو قابو میں رکھنے کی ایک تحریک ہے:

''مختصر الفاظ میں استشراق؛ مشرق پر غلبہ، اس کی تشکیل جدید اور اس پر تفوق کا مغربی اسلوب ہے۔''

(In short; Orientalism is a western style for dominating, restructuring and having authority over the orient.)(2)

کلیسا کا نظریۂ دریافت

چودھویں اور پندرھویں صدی کا درمیانی عرصہ ''مسیحی سامراج'' کا آغاز ہے، یہ وہی دور ہے جب مسیحیت یورپ سے نکل کر افریقہ، ایشیا اور امریکہ کے پسماندہ وکمزور علاقوں کی بازیافت کر رہی تھی، اور ان کے باشندوں کو غلام بنا رہی تھی، اس دور کو ''عہد بازیافت'' (Age of Discovery) بھی کہا جاتا ہے۔

نئے ممالک کی بازیافت، صلیبی جنگوں کی شکست اور بازنطینی حکومت کی پسپائی کے تناظر میں ارباب حکومت وارباب کلیسا کو ایسی نظریاتی قوت کی سخت ضرورت تھی جس کی بنیاد پر وہ غیر مسیحیوں اور خاص کر مسلمانوں کے قتل کو جائز ٹھہرا سکیں اور اپنی فوج کو بھی برسر پیکار رکھ سکیں، چنانچہ 1452ء میں پوپ نکولس پنجم (NicholasV) نے ''اصول دریافت'' (Doctrine of Discovery) کا سنگین نظریہ پیش کیا، جس کی بنیاد پر لاکھوں انسانوں کا بے دریغ خون بہایا گیا۔

---

(۱) مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے: الاستشراق المستشرقون / الدکتور مصطفی السباعی مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش/مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(2) Orientalism: Western Conceptions of the Orient, By Edward W. Said (Online)

کلیسا کے اس نظریہ کی بنیاد پر مسیحی ملکوں کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ نو مفتوح علاقوں اور نو دریافت ممالک کی معیشت پر قبضہ کیا جائے اور وہاں کے باشندوں کو جبراً مسیحی بنایا جائے، بصورت دیگر ان کی املاک وجائداد ضبط کر کے انھیں غلام بنا لیا جائے چنانچہ پوپ نکولس نے پرتگال کے بادشاہ الفانسو پنجم (Alfonso V) کے نام ایک مذہبی حکم نامہ (Bull) روانہ کیا، جس میں اس نے مسلمانوں، مشرکوں اور کافروں کو غلام بنانے کی ہدایات دیں:

"It authorised Alfonso V of Portugal to reduce any 'Saracen (Muslims) and Pagans and any other unbelievers' to perpetual slavery."(1)

پوپ نکولس نے 1455ء کو ایک دوسرا حکم نامہ جاری کیا جس میں اس نے اپنے سابقہ فرمان کی مزید وضاحت کی اور شدت سے اس کو نافذ کرنے کا حکم دیا، اس حکم نامہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"to invade, search out, capture, vanquish, and subdue all Saracens and pagans whatsoever, and other enemies of Christ, wheresoever placed, and the kingdoms, dukedoms, principalities, dominions, possessions, and all moveable and immoveable goods whatsoever held and possessed by them and to reduce their persons to perpetual slavery"(2)

(حملہ کرو، ڈھونڈ نکالو، قید کرو، تباہ کرو، اور سبھی مسلمانوں، مشرکوں اور عیسیٰ مسیح کے ہر ایک دشمن کو سرنگوں کردو، وہ چاہے جہاں اور جس حال میں ہوں، اور ان کی بادشاہت، حکومت، علاقے، اور املاک چاہے قابل نقل وحرکت ہوں یا نہ ہوں ان پر قبضہ کرو، اور ان کی تعداد کو گھٹا کر ہمیشہ کے لیے غلام بنالو)

اس مذہبی حکم نامہ کی بنیاد پر پرتگال نے نہ صرف افریقہ سے غلاموں کی تجارت کو فروغ دیا بلکہ مغربی ساحل پر آباد علاقوں پر جبری تسلط بھی قائم کرلیا۔

1492ء میں کرسٹوفر کولمبس کو اسی حق دریافت سے مسلح کر کے ملکہ ازابیلا نے نئی دنیا امریکہ کی دریافت اور فتوحات پر روانہ کیا، پس جب کولمبس امریکہ وارد ہوا تو اس کے پاس کلیسا، پوپ، ملکہ اور بادشاہ کی جانب سے غیر عیسائیوں کے قتل عام کا اجازت نامہ موجود تھا، اور اس کی پشت پر اس قتل عام کا مذہبی ونظریاتی جواز بھی درج تھا۔

اندلس کی ملکہ ازابیلا نے کلیسا کے نظریۂ دریافت کو مسلمانوں کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا جس کا عملی مظاہرہ غرناطہ کی جنگوں میں اور اس کے بعد ہوا، بلاتفریق جنس وعمر لاکھوں مسلمانوں کو اس نظریہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔

---

(1) Papal Bull Dum Diversas, 18 June, 1452 *(www.doctrineofdiscovery.org)*

(2) Papal Bull Romanus Pontifex, 5 Jan, 1455 *(www.doctrineofdiscovery.org)*

CamScanner

1492ء کا سال امت مسلمہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل تھا، اسی سال اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ اقتدار کا آخری سورج غروب ہوا، صدیوں سے چل رہی کلیسا کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں اور شاہ فرڈی نینڈ (Ferdinand) اور ملکہ ازابیلا (Isabella) کی دیرینہ تمنائیں بر آئیں، اسپین میں مسلمانوں کے خلاف طویل جدوجہد کامیاب ہوئی، اور ایک ایسے عہد کا آغاز ہوا جس نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے انسانیت کو شرمسار اور لہولہان کر دیا۔

2/جنوری 1492ء کی سہ پہر مسلمانوں پر بہت ہی بھاری تھی، ملکہ ازابیلا کے سپاہی غرناطہ کی سڑکوں پر دندناتے پھر رہے تھے، شراب کے نشہ میں چور فتح کے جشن میں بدمست تھے، عزتیں تاراج تھیں، سڑکیں لہولہان تھیں اور مسجدیں اصطبل میں تبدیل ہو چکی تھیں، مناروں سے اٹھنے ہونے والی اذان کی آوازیں چیخ و پکار میں گھٹ چکی تھیں، جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، اور ان شعلوں میں قرآن کے نسخے، نادر کتابیں اور نایاب قلمی نسخوں کی شکل میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی میراث بھی راکھ ہو رہی تھی، غرناطہ کی فضا میں ایسا کثیف دھواں چھایا ہوا تھا کہ جس کی سیاہی مسلمانوں کی سیاہ بختی سے ہرگز کم نہ تھی۔

ایک طرف مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی، ان کی عزت و آبرو اور ناموس لٹ رہی تھی اور دوسری طرف مسلم حکمراں ابوعبداللہ (باب دل) غرناطہ کی چابیاں ملکہ ازابیلا اور اس کے شوہر شاہ فرڈی نینڈ کو پیش کر رہا تھا، مسلم تاریخ کا یہ دل اندوہ واقعہ 2/جنوری 1492ء کو پیش آیا، ملک عبداللہ نے چابیاں دیتے ہوئے کہا:

"They are thine, O King, Since Allah so Decrees; use thy success with clemency and moderation."(1)

(اے بادشاہ! یہ (چابیاں) آپ کی ہیں، خدا کی یہی مرضی ہے، اس کامیابی کا استعمال رحم اور نرمی سے کیجیے)

ملکہ ازابیلا کے ساتھ مہمان خصوصی کے طور پر معروف بحری مہم جو کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) بھی موجود تھا، سقوط غرناطہ کے اس دلخراش منظر کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے:

"On the second day of January, this present year, I saw the royal banners of your Highnesses planted by force of arms upon the towers of the Alhambra, which is the fortress of that city, and saw the Moorish king come out at the gate of the city and kiss the hands of your Highnesses.

---

(1) History of The Reign of Ferdinand And Isabella, by William H. Prescott. V.2,P.97

and of the Prince my Sovereign."(1)

(آج میں نے سال رواں (1492) کی 2/ جنوری کو دیکھا کہ الحمراء کے میناروں پر ملکہ عالیہ (ازابیلا) کا شاہی نشان بزور قوت لہرا دیا گیا، اور پھر مور (مسلمان) بادشاہ عبداللہ کو شہر کی فصیل کے دروازے پر ملکہ (ازابیلا) اور بادشاہ (فرڈی ننڈ) کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا)

شکست خوردہ وجود کے ساتھ ابوعبداللہ رخصت ہوا، وہ بالکل نڈھال تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر اس کی دلیر ماں نے یہ تاریخی جملہ کہا:

"You do well, to weep like a woman, for what you could not defend like a man! Alas!"(2)

(بہت اچھا کر رہے ہو! ایک مرد کی طرح تو لڑ نہیں سکے اور اب عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو، افسوس!)

تعذیبِ مسلم

غرناطہ کی جنگ میں مسلمان کمزور پڑ چکے تھے، خانہ جنگیوں نے ان کی طاقت منتشر کر دی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے ہتھیار ڈال دیے، اپنی شکست تسلیم کر لی اور شاہی کنجیاں ملکہ ازابیلا کو سپرد کر دیں، لیکن یہ خود سپردگی ایک معاہدہ کے ساتھ عمل میں آئی تھی جس میں یہ وضاحت تھی کہ مسلمانوں کو ان کے ملی تشخص، مذہبی شعار اور جان و مال کی پوری آزادی حاصل ہوگی:

"The Moore were permitted to retain their property, dress, customs, laws and religion, and to be ruled by their own magistrates under a governer appointed by the spanish king, and those who wished to migrate to Africa were to be given free transport."(3)

(مور (مسلمانوں) کو ان کی جائداد، لباس، رسم و رواج اور مذہب و شریعت کے ساتھ آباد رہنے کی اجازت دی گئی تھی، اور اس کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ ان پر انہیں کے قاضی حکمراں ہوں گے جن کا تعین اسپینی شہنشاہ کی جانب سے ہوگا، اور جو لوگ افریقہ کو ہجرت کرنا چاہیں گے ان کے لیے بلا قیمت سواری کا نظم بھی کیا جائے گا)

لیکن بعد کے دنوں نے واضح کر دیا کہ مفتوح اور فاتح کے درمیان کیا مکالمہ اور کیا گفتگو، کیا شرائط اور کیا معاہدہ، کیا وعدے وعید اور کیا قول کی حرمت! زبانی خرچ کے سوا کچھ نہیں!

سقوط غرناطہ کو ابھی چند سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ مسیحی حکمرانوں نے عہد شکنی اور وعدہ خلافی کا عملی مظاہرہ شروع کر دیا، تعصب، ناانصافی، مذہبی منافرت اور سازشوں کی ایسی لہر چلی کہ اندلس کی سرزمین مسلمانوں

---

(1) The Journal Of His First Voyage To America By Christ-opher Columbus, p.1

(2) History Of The Reign Of Ferdinand And Isabella, V.2,P.99

(3) The Decisive Battles of The Western World,P.544

CamScanner

پر تنگ سے تنگ ہوتی گئی، بالآخر صرف دس سال کی مدت کے بعد 1502ء میں یہ شاہی فرمان جاری ہوا کہ مسلمانوں کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں، یا مسیحیت کو قبول کرلیں یا اندلس کی سرزمین کو اپنے وجود سے آزاد کردیں:

"Isabella was not inclined to tolerate Muslims elsewhere in her realms. On 12 February 1502 all Mudéjares in Castile were offered the choice between baptism and exile."(1)

(ایزابیلا اپنی مملکت میں کہیں بھی مسلمانوں کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھی، 12/فروری 1502ء کو قشتالیہ کے بھی مداجر (یعنی مسلمانوں) کو بپتسمہ اور جلاوطنی میں سے کسی ایک کا اختیار دیا گیا)

اس ظالمانہ فرمان کے بعد مسلمان مسیحیت قبول کرنے یا ہجرت کرنے پر مجبور تھے، جن مسلمانوں کو کوئی پناہ گاہ نہ ملی انھوں نے ظاہری طور پر ہی مسیحیت کو اختیار کرلیا، نیز بہت سے مسلمان اپنی جان و مال اور اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں میں روپوش ہوگئے تھے، جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے ساتھ ہر طرح کا ظلم روا کردیا گیا، جائدادیں ضبط کرلی گئیں، عزتیں پامال کی گئیں، اور پھر ان کے دلوں میں کھنگالنے اور ان کی روحوں میں جھانکنے کے لیے احتساب کا محکمہ (Inquisition) سرگرم کردیا گیا جو ایسے مسلمانوں کی تلاش کرتا جن کے اندر اسلام کی رمق بھی محسوس ہوتی، پھر ان کو ایسی خطرناک و ہولناک سزائیں دی جاتیں جن کے بیان سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجائیں، اور جن کے تصور سے بدن میں کپکپی آجائے۔

جلاوطنی کا شاہی فرمان

1502ء کے شاہی فرمان کے وقت پورے اندلس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ تھی، اتنی بڑی تعداد کو یکلخت مٹانا ممکن نا تھا، اس لیے ایک صدی تک مسلمانوں کو دھیرے دھیرے مٹایا گیا، قتل و غارت کے بدترین حربے استعمال کیے گئے، یہاں تک کہ شہنشاہ فلپ سوم (Philip III) کا دور اقتدار آیا، اور اس نے مسلمانوں کے جبری انخلاء کا حکم جاری کردیا جس کے لیے انھیں صرف تین دن کی مہلت دی گئی:

"In April 1609, king Phlilip of Spain signed an edict denouncing the Muslim inhabitants of Spain as heretics, traitors, and apostates. Later that year, the entire Muslim population of Spain was giventhree days to leave Spanish territory, on threat of death."(2)

---

(1) The Spanish Inquisition-A Historical Revision By Henry Kamen, P.1281

(2) Blood & Faith-The Purging of Muslim Spain By Mathew Carr (Arches Quarterly, v.4 Edition.8)

(اپریل 1609ء میں شہنشاہ فلپ سوم نے اپنی دستخط کے ساتھ ایک شاہی فرمان جاری کیا جس میں اندلس کے مسلم باشندوں کو ملحد، دھوکے باز اور غدار قرار دیا گیا، پھر اسی سال (22/ستمبر) اندلس کی تمام مسلم آبادی کو موت کی دھمکی کے ساتھ اندلس کی سرحدوں کو خالی کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی گئی)

نو صدیوں کے ساکنانِ اندلس کو ترک اندلس کے لیے دیا گیا یہ وقت بہت ہی کم تھا، تین دن کی اس مختصر ترین مدت میں وہ صرف قتل ہو سکتے تھے یا سمندر میں ڈوب مر سکتے تھے، پس وہ قتل ہوئے اور جو بچ گئے انھیں سمندر نے نگل لیا، اس طرح 25/ستمبر 1609ء میں اندلس کے ساحلی شہر ویلنسیا (Valencia) سے مسلمانوں کا وجود ختم ہو گیا، یہی شاہی فرمان اندلس کے دوسرے شہروں میں بھی نافذ ہوا، اور صرف پانچ سال کی مدت میں اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشاں تک مٹ گیا، اور نو سو سال کی شاندار تہذیبی وثقافتی میراث اوراق پارینہ بن گئی، اور اسلامی اندلس ''فردوس گم گشتاں'' قرار پایا۔

"The expulsion was eventually decreed on 4 April 1609, and took place in stages up to 1614."(1)

(4/اپریل 1609ء میں ملک بدری کا فرمان جاری ہوا، جو 1614ء تک تدریجی طور پر مکمل ہوا)

نو صدیوں بعد جب اندلس سے مسلمانوں کو بے دخل کیا گیا تو طارق بن زیاد کے کہے ہوئے جملہ کا ایک ایک لفظ پورا ہو کر رہا، یقیناً مسلمانوں کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا، ان کے سامنے سمندر تھا اور پیچھے دشمن، پس ابن زیاد کا اندیشہ پورا ہو کر رہا، وہ ہجوم در ہجوم قتل ہوئے، انبوہ در انبوہ سمندر میں ڈوب گئے اور کلمہ گو مخلوق اندلس کی سرزمین سے نابود ہو گئی:

"أيها الناس! أين المفر؟ البحر من ورائكم، والعدو أمامكم، وليس لكم والله إلا الصدق والصبر۔"

(اے لوگو! کہاں بھاگتے ہو؟ سمندر تمھارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے سامنے ہے، خدا کی قسم تمہارے پاس راست بازی اور ثابت قدمی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں)

"Between 1609-14 an estimated 350,000 men, women, children were forcibly removed from their homes and deported from the country in what was then the largest removal of a civilian population in European history."(2)

(۱۶۰۹ سے ۱۶۱۴ء تک تقریباً ساڑھے تین لاکھ مرد، عورت، بچے جبری طور پر اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور ملک بدر کر دیے گئے، یورپ کی تاریخ میں کسی آبادی کی یہ سب بڑی ملک بدری تھی)

---

(1) The Spanish Inquisition, P.1382

(2) The Moriscoss: a Lesson from History? By Mathew Carr
(Arches Quarterly, V.4 Edition.8)

CamScanner

کلیسا کے سنگین مظالم

رومن امپائر (Roman Empire) کی تاریخ میں کلیسائی مسیحیت کا آغاز نہایت غربت و کسمپرسی کی حالت میں ہوا تھا، لیکن سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے بعد اسے سیاسی استحکام بھی نصیب ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ وہ شہنشائیت کے مدمقابل ہوئی اور طویل کشمکش کے بعد اس نے اقتدار پر مکمل تسلط بھی حاصل کرلیا۔

شہنشائیت پر فتح کے بعد کسی بھی شعبہ میں کلیسا کا کوئی مدمقابل نہ تھا، اسے اگر کسی مقاومت کا سامنا تھا تو وہ صرف اندرونی کشمکش اور پاپائی چپقلش تھی، ورنہ معاشرہ کا ہر شعبہ اس کے سامنے سرنگوں اور سماج کا ہر طبقہ اس کی مرضی کے آگے بے دست و پا تھا۔

کلیسا نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بے جا تشدد اور سنگین مظالم کا سہارا لیا، اس نے معاشرہ کے ہر طبقہ کا استحصال کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو پوری طرح نچوڑ ڈالا، ابتدائی صدیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ بندہ اپنے خالق سے براہ راست تعلق قائم کرسکتا ہے، لیکن کلیسائی اقتدار کے بعد الٰہیات کو بھی عقل و خرد کی بنیادوں پر استوار کیا گیا، اور یہ عقیدہ نافذ کیا گیا کہ خالق سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہوسکتا، اس کے لیے پوپ کا رابطہ یا توسط ضروری ہے، اور پھر نجات کے حصول کے لیے پوپ کا وسیلہ لازم ہوگیا، عقیدہ کی اس تبدیلی کے بعد روح کی نجات کے لیے ہر فرد کو اس کی خدمت میں پیش ہونا لازم ہوگیا، شادی بیاہ ہو یا موت و حیات، سیاسی جرائم ہوں یا تجارتی بددیانتی، ہر جرم و ہر گناہ میں سزا و معافی کا اختیار صرف پوپ کو تھا، یوں مغرب کا ہر فرد اور اس کی زندگی کا ہر شعبہ کلیسا کے تابع ہوگیا اور پوپ اس کے جسم و روح کا آقا و مالک بن گیا۔

محکمۂ احتساب (Inquisition)

محکمۂ احتساب؛ یورپ کے کیتھولک ممالک میں سرگرم ادارہ جس کا مقصد کلیسا سے اختلاف رکھنے والوں کی جانچ پڑتال کرنا اور ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا تھا:

(INQUISITION, in the church of Rome, is a tribunal, in several Roman Catholic countries, erected by the popes for the examination and punishment of heretics.)(1)

---

(1) An Account of the Inquisition at Goa in India, P.2

کلیسا نے اپنے اقتدار کی بنیاد جبر واستبداد پر رکھی، اس نے ہر اس آواز کو حلق ہی میں دبا دیا جس میں پوپ کے افکار ونظریات کی مخالفت تھی، صدیوں تک مسیحی دنیا میں ایمان وعقائد کا حرفِ آخر کلیسا ہی تھا لیکن جب مغربی معاشرہ کا تعلق گرد وپیش کی ثقافتوں سے ہوا اور خاص کر مسلمانوں سے اختلاط عام ہوا تو غور وفکر کے نئے نئے دریچے کھلنے لگے، جس کے بعد فکری اضطراب وبے چینی کا پیدا ہونا لازمی تھا، چنانچہ کلیسا نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور ہر اس فکر کو جو کلیسا کے خلاف تھی "بدعت" (Heresy) قرار دیا۔

کلیسا کی حکومت میں "بدعت" سب سے بڑا معاشرتی ومذہبی جرم تھا اور بدعتی آسمانی حکومت کا غدار تھا جس کا وجود کسی بھی قیمت پر قابل برداشت نہیں تھا، کیونکہ بدعت کے ذریعہ روح آلودہ ہو جاتی تھی اور روح کی آلودگی کے بعد اس جسم کا باقی رہنا کسی بھی صورت روا نہیں تھا، نیز ملحد صرف وہ ہی نہیں تھا جو کج عقیدہ ہو بلکہ وہ بھی تھا جو پوپ کا ہم نوا نہ ہو۔

چنانچہ بارہویں صدی میں پوپ انوسینٹ دوم (Innocent II) نے ایک تفتیشی ادارہ (Inquisition) کی بنیاد رکھی تا کہ اس کے ذریعہ کلیسا مخالف ہر فکر کو مٹایا جا سکے اور ہر اس شخص کی بیخ کنی کی جا سکے جو کسی بھی ناحیہ سے کلیسا کے افکار ونظریات یا اس کے معتقدات کے خلاف ہو:

"This court was founded in the twelfth century, under the patronage of pope Innocent, who issued out orders to excite the Catholic princes and people to extirpate heretics."(1)

یہودیوں اور مسلمانوں کے علاوہ ابتدائی تین صدیوں میں رومی شہنشاہوں نے جتنے مسیحیوں کو ہلاک کیا تھا اس سے کہیں زیادہ مسیحی اس احتساب کی بھینٹ چڑھ گئے، صرف ایک ملک نیدرلینڈ (Netherland) میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی، اور طرفہ یہ کہ انھیں ہلاک کرنے والے خود مسیحی تھے اور وہ روئے زمین پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات محبت کے داعی وامین کہلاتے تھے!

1185ء میں پوپ لیوسیس سوم (Lucius III) نے باقاعدہ فرمان جاری کیا کہ بشپ اور کلیسائی حکام ملک بھر کے مسلسل دورے کریں، اور کلیسا کے غیر وفادار اور عقیدے کے مشکوک لوگوں کی پڑتال کریں، اور انھیں گرفتار کر کے ان کے خلاف سخت کارروائی کریں:

"In 1185, Pope Lucius III, dissatisfied with the negligence of the bishops in pursuing heresy, ordered them to visit their parishes at least once a year, to arrest all suspects."(2)

---

(1) An Account of the Inquisition at Goa in India, P.2

(2)The Age of Faith by Will Durant, P.779

پوپ کے فرمان کے بموجب فرانس، اٹلی، اسپین، جرمنی، انگلستان اور دیگر مسیحی ملکوں کے ہر بڑے شہر میں احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا، جس میں کلیسا سے کسی بھی قسم کا اختلاف رکھنے والے "ملحدین" کے خلاف مقدمہ چلایا جاتا اور انھیں سزا دی جاتی:

"……it is established in certain places, as Italy, Spain, Portugal, and the greatest part of the countries which are dependent upon them."(1)

(مختلف اہم جگہوں پر احتساب کی عدالت قائم کی گئی جیسے اٹلی، اسپین، پرتگال، اور ان تمام اہم ملکوں میں جو ان کے زیر اقتدار تھے)

احتساب کی یہ عمومی عدالتیں اور خاص کر روم اور اسپین کی عدالتیں انسانی تاریخ کا سب سے تاریک باب ہے، جن کے تحت لاکھوں لاکھ انسان لقمۂ اجل بنے۔

اسپین کے محکمۂ احتساب (Spanish inquisition) کے رکارڈ کے مطابق تین لاکھ اکتالیس ہزار سے زائد افراد موت کے گھاٹ اتارے گئے، اور لاکھوں مسلمانوں اور یہودیوں کو مسیحیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ (۲)

اسپین میں احتساب کے قیام کا بنیادی مقصد اسلام کی پیش قدمی کو روکنا اور مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا تھا، اس میں دنیا بھر کے دھتکارے ہوئی وہ یہودی بھی شامل تھے جنھیں مسلمانوں نے اسپین میں پناہ دی تھی:

"In Spain, however, it remained operative into the nineteenth century. Originally called into being against secret Judaism and secret Islam."(3)

(بہر حال اسپین کا احتساب انیسویں صدی تک جاری رہا، جو کہ درحقیقت خفیہ یہودیت اور خفیہ اسلام کے خلاف تھا)

تفتیشی ادارہ کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے خود عوام میں ہی جاسوس تیار کیے گئے، اس طور پر کہ کلیسا کی جانب سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص کسی ملحد یا مشکوک کی خبر دے گا اسے اس ملحد کی جائیداد کا ایک تہائی حصہ انعام میں دیا جائے گا، بسا اوقات اس میں اضافہ کر کے نصف حصہ تک دیدیا جاتا، جبکہ ایک تہائی کلیسا کو اور ایک تہائی علاقائی حکمراں کو دیا جاتا تھا، اور ورثا پوری طرح محروم کر دیے جاتے تھے، اس اعلان کے ساتھ ہی حرص ولالچ کا بازار گرم ہو گیا، دوست، پڑوسی، رشتہ دار سب ایک دوسرے کی چغلی کرنے اور تہمتیں لگانے لگے، حکام کی جانب سے ترغیب وتشویق بھی کی جاتی، اور اگر کوئی شخص کسی ملحد کی شناخت کے بعد یا شک وشبہ کے بعد اس کی خبر حکام تک نہیں

---

(1) An Account of the Inquisition at Goa in India, P.17

(ہندستان (گوا) میں بھی احتساب کا محکمہ قائم تھا جس کی تفصیلات مذکورہ کتاب میں درج ہیں)

(2) Rationalist Encyclopaedia P.318(416)

(3) (Catholic Encyclopedia, Inquisition)

http://www.newadvent.org/cathen/08026a.htm

CamScanner

پہنچ تا تھا تو خود وہ شخص ملعون وملحد قرار دے دیا جاتا تھا، اور اس کے خلاف کارروائی ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ پورے مغربی معاشرہ میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا، ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا، جائداد کی لالچ میں بے گناہوں ومعصوم لوگوں کو بھی مشکوک قرار دیا جانے لگا، حتی کہ مردہ افراد کی جائداد ہتھیانے کے لیے ان پر بھی بدعقیدگی کے الزامات لگائے گئے اور ان کی قبریں کھود کر ان پر مقدمے چلائے گئے، اور سزائیں بھی دی گئیں۔ (۱)

احتسابی محکمہ کی گرفت میں آجانے کے بعد مظلوم انسان سزا کے رسمی اعلان سے پہلے ہی تحقیق وتفتیش کے نام پر بدترین سزا واذیت کا شکار ہو جاتے تھے، انھیں اکٹھے سیکڑوں کی تعداد میں تنگ وتاریک قید خانوں میں ٹھونس دیا جاتا جہاں سخت غلاظت ہوتی اور کیڑے مکوڑے بھرے ہوتے تھے، پھر وہ مختلف اذیت اور مسلسل فاقہ کشی کا شکار ہوتے جبکہ گرفتار ہوتے ہی مشکوک افراد کی جائداد اور مملوکات محکمۂ احتساب کے افسروں کی دستبرد کا شکار ہو جاتے۔ (۲)

احتساب کے افسروں اور کارندوں کو غیر معمولی اختیارات حاصل تھے، بغیر گواہ وثبوت کے بھی انھیں کسی کو بھی گرفتار کرنے اور کارروائی کرنے کا اختیار تھا، چنانچہ کسی کی گرفتاری کے بعد افسران کی پوری کوشش رہتی کہ ملزم ہر کردہ وناکردہ گناہ کا اعتراف کرلے، اس مقصد کے لیے ملزم کو بدترین ایذائیں دیتے:

"Torture was used to extort confessions."(3)

(اعتراف کروانے کے لیے ایذا کا استعمال کیا جاتا تھا)

جب احتساب کی عدالت قائم ہوتی تو افسران کی پوری کوشش ہوتی کہ کوئی بھی ان کی گرفت سے آزاد نہ ہونے پائے، چنانچہ عدالت کی کارروائی کا آغاز ہی سختیوں اور اذیتوں سے ہوتا:

"Trial began with torture which included the use of iron boots, thumb screws and flogging."(4)

(عدالت کی جانچ کا آغاز لوہے کے جوتوں، آہنی شکنجوں اور کوڑوں کے ذریعہ اذیت سے ہوتا)

مظلوم افراد اپنی بے گناہی میں شاذ ونادر ہی کوئی گواہ پیش کرسکتا تھا کیونکہ گواہوں کو خود مشکوک قرار دیے جانے کا خطرہ رہتا تھا، اور احتساب کی عدالت میں صرف شک کی بنیاد پر ہی کارروائی کردی جاتی تھی، اسی لیے کوئی ایسے مظلوم سے بات چیت بھی نہیں کرتا تھا۔ (۵)

---

(1) The Inquisition by E.Vacandard, P.203

(2) History Of The Inquisition Of Spain by H.C.Lea, V.1, P.21

(3) The Shorter Cambridge Medieval History V.2, P.679

(4) What history tells us? by Dr.Mubarak Ali P.52

(5) The Shorter Cambridge Medieval History V.2, P.679

بدعتی کے خلاف ہر کسی کی گواہی معتبر سمجھی جاتی تھی خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم، بدنام زمانہ، یا کلیسا کا سزا یافتہ ہی کیوں نہ ہو، گواہی کے بعد ملحد کی ذمہ داری تھی کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خود کے خلاف گواہی دے، اسے کسی گواہ پر اعتراض کرنے یا کسی گواہ کی مخالفت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، حتی کہ وہ اپنے مسئلہ میں کسی سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا تھا، ایسی صورت میں خونی رشتہ دار بھی اس کے خلاف گواہی دینے پر مجبور تھے، کیونکہ جج کے فیصلہ کے خلاف کسی اپیل کی گنجائش نہیں تھی۔

تفتیش کے نتائج ایک بڑے مجمع میں پڑھ کر سنائے جاتے، اور پھر مجرم سے کہا جاتا کہ وہ سب کے سامنے توبہ کرے، اس کے بعد اس کے جرم کی نوعیت کے اعتبار سے اس کو سزا دی جاتی جو عام طور پر عمر قید ہوا کرتی تھی، اور توبہ نہ کرنے کی صورت میں وہ موت کا سزاوار ہوتا تھا، اس کے علاوہ ان دونوں سزاؤں میں جائداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی، سنگین الزامات کی صورت میں اگر کوئی شخص دوران تفتیش ہی مر جاتا تو قبر سے اس کی باقیات نکال کر اس کو جلایا جاتا تھا۔

ارباب کلیسا کی نظر میں بدعت سنگین جرم تھا، اور ایسے مجروں کے خلاف سنگین کارروائی ضروری تھی لیکن کلیسا کے نزدیک کسی کا خون بہانا خود کلیسا کے حق میں نامناسب تھا اسی لیے حکومت پر بھی یہ دباؤ تھا کہ وہ بھی ایسی سزا نہ دے جس میں خون بہتا ہو، اس لیے مشکوک وملحد افراد کو خون بہانے کے سوا سخت ترین سزا دی جاتی، کبھی ملزم کے ہاتھوں کو پشت پر باندھ کر لٹکا دیا جاتا تھا، کبھی اس طرح باندھا جاتا تھا کہ حرکت کرنا بھی ممکن نہ ہو، پھر اس کے گلے میں مسلسل پانی ٹپکایا جاتا تھا جس سے اس کا دم گھٹ جاتا تھا، کبھی بازوؤں اور پنڈلیوں کو رسی سے اتنا مضبوط باندھا جاتا تھا کہ رسیاں گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں، جب پوپ گریگوری نہم (Gregory IX) کا دور آیا تو اس نے سزا کے احکامات میں مزید شدت پیدا کر دی اور کہا کہ چونکہ آگ میں جلانے سے خون نہیں بہتا اس لیے ایسے سنگین مجرموں کو کھمبے سے باندھ کر زندہ جلا دینا چاہیے (By Burning at the Stake) اس طرح ہزاروں افراد زندہ جلا دیے گئے (1)

احتساب کے نام پر کلیسا کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونے والے انسانوں کی تعداد کا حقیقی علم تو رب کائنات کو ہی ہے، جو لوگ غلیظ، متعفن اور تنگ وتاریک کوٹھریوں مرکھپ گئے ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں تاہم دلائل وشواہد یہ بتلاتے ہیں کہ تقریباً پچاس ملین لوگ اس احتساب کے نام پر ہلاک کیے گئے:

"It has been computed that fifty millions of Christians have at different

(1) The Age of Faith by Will Durant, P.783

times been the victims of the persecution of the papists, and put to death for their religious opinions."(1)

(اعداد وشمار کے مطابق مختلف ادوار میں پچاس ملین افراد مسیحی پاپائیت کی ایذا رسانی کا شکار ہوئے، اور اپنے مذہبی افکار ونظریات کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اتارے گئے)

1478ء کو پوپ کی طرف سے اسپین میں "انکویزیشن" کے قیام کا حکم نامہ صادر ہوا، اس کے پہلے سال کی کارروائی میں دو ہزار اشخاص کو زندہ جلا دیا گیا، کئی ہزار مردوں کو قبروں سے نکال کر جلایا گیا، اور سترہ ہزار افراد کو جرمانہ یا حبس دوام کی سزا سنائی گئی (۲)

(اسپین کے محکمہ احتساب کے حکم سے اکیلے "ٹورکی میڈا" کی زیر صدارت تقریباً دو ہزار نفوس زندہ جلا دیے گئے)

".....about two thousand persons burnt by the Spanish Inquisition during the presidency of Torquemada alone,."(3)

جنوبی فرانس میں "ایل بی جینس (Albigenses) نام کا مسیحی فرقہ تھا، (۴) وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصلیب اور دوبارہ زندہ ہونے کا منکر تھا، پوپ انوسینٹ سوم (Innocent III) نے اس کے خلاف فوجی کارروائی کی، بستیوں کی بستیاں تباہ کردی، بعض جگہ انھیں کیتھولک مسیحیوں نے پناہ دی تو ان سب کو یہ کہہ کر بے دریغ تہہ تیغ کر دیا گیا کہ فی الحال ان سب کو قتل کردو، ان میں سے جو خدا کو صحیح طور پر ماننے والے ہیں، انھیں خدا خود ہی پہچان لے گا، اس تباہی میں ایک لاکھ سے زائد افراد قتل کیے گئے۔ (۵)

1572ء کا واقعہ ہے، فرانس میں سینٹ برتھولیمو (St.Bartholemew) کا دن منایا جارہا تھا، یہ لوگ رومی کلیسا کے "باغی" مانے جاتے تھے، رات میں صبح کے قریب تاریکی میں کلیسائی فوجوں نے حملہ کردیا، وہ گھروں کے اندر گھستے گئے اور قتل عام شروع ہوا، تقریباً سات سو (700) گھروں کو تاراج کردیا گیا، پانچ ہزار (5000) سے زائد شہری بے دردی سے قتل کیے گئے، پھر دوسرے علاقوں (Provinces) میں بھی موت کا یہ کھیل کھیلا گیا، جو تین دن تک چلتا رہا، جس میں تیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک لوگ جان سے مارے گئے۔ ایک شخص نے بادشاہ کے سامنے اپنا "کارنامہ" بیان کرتے ہوئے کہا:

"One man boasted to the king that he had killed one hundred fifty in one night."(6)

---

(1) A History of the Church by H.C.Wickersham. P.233-234

(۲) معرکۂ مذہب وسائنس/۲۵۵، ۲۵۶

(3) Hitistory Of European Morals, V.1, P.165

(4)The Ocford Dictionary of the Christian Church(Albigenses)

(5) A history of the inquistion of the Middle ages V.1, C.IV

(6) History Of The Church by H.C.Wickersham, P. 216. & A History of the Christian Church by W. Walker, P.435

(ایک شخص نے بادشاہ کے سامنے ڈینگیں مارتے ہوئے کہا کہ اس نے ایک ہی رات میں ایک سو پچاس لوگوں کو قتل کیا)

یہ نہایت ہی ہولناک اور روح فرساں منظر تھا جس میں غیر انسانی ظلم وتعدی کی انتہا یہ تھی کہ معصوم بچوں کو کھڑکیوں سے اچھال کر باہر دریا میں پھینک دیا گیا:

"Babies were thrown out of windows and tossed into the river."(1)

کلیسا کے ان سنگین مظالم کی وجہ سے پورا یورپ ذہنی وفکری اضطراب اور شدید کڑھن میں مبتلا تھا، اور محکمۂ احتساب کے متعلق انصاف پسند مؤرخ کو یہ لکھنا پڑا:

''پس احتساب کو استحکام حاصل ہوا جو کہ اپنے وقت کا سب سے خطرناک ادارہ (موت کی فیکٹری) بن گیا، جس نے پوری قوم کو کرب والم میں اور پاپائیت کی غلامی میں مبتلا کر دیا تھا۔''

(Hence rose the inquisition, which in time became a most horrible tribunal - an engine of death; which kept nations in awe, and in subjection to the papal dominion).(2)

تشدد کے طریقے

ظلم وتشدد کے کلیسائی دور میں احتساب کے نام پر جس شقاوت وسنگدلی کا مظاہرہ کیا گیا اس کے ذکر سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مذہب کے نام پر جس درندگی اور حیوانیت کو روا رکھا گیا گرچہ عقل وخرد آسانی سے اسے قبول نہیں کرتی، لیکن تاریخی حقائق اور خود مسیحی مؤرخین کے دلائل اور اعترافات کے سامنے ساری دانشمندی بے حیثیت ہو جاتی ہے، اور حقیقت کے اس کڑوے گھونٹ کو یہ کہہ کر پینا پڑتا ہے کہ کلیسا کا دور اقتدار پوری انسانیت کے چہرہ پر ایک بدنما دھبہ ہے، اور ان مستشرقین اور مغربی مفکرین کے لیے ایک شفاف آئینہ ہے جنھیں دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تو نظر آتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہ تیر نظر نہیں آتا۔

محکمۂ احتساب نے غیر انسانی تشدد اور انسانیت سوز مظالم کے جو طریقے اختیار کیے ان کی ایک لمبی فہرست ہے جس کا اندازہ ان چند نمونوں سے کیا جا سکتا ہے:

☆ ملزم کو سلگتے کوئلے پر کھڑا کر دیا جاتا اور وہ دھیرے دھیرے سلگتا رہتا۔

"..... the feet of the accused might be slowly roasted over burning coals."

☆ ٹکونے شکنجہ میں جکڑ کر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

"..... he might be bound upon a triangular frame."

☆ کئی کئی دنوں کے لیے بیڑیوں میں ایسے جکڑ دیا جاتا کہ ہلنا ڈلنا بھی ممکن نہ ہوتا، اور وہ ٹھنڈی زمین پر

---

(1) A Criminal History Of Mankind, P.230

(2) History Of The Church by H.C. Wickersham, P. 148

اپنی ہی غلاظت میں پڑا رہتا۔

" ... some were so manacled that they had to sit in their own filth, and could only lie on their backs on the cold earth."

☆ بے دردی کے ساتھ اس طرح کھینچا جاتا کہ ہاتھ پیر کسی کام کے نہیں بچتے۔

"Some men had been so drawn on the rack that they had lost the use of their arms and legs."(1)

☆ تپتے ہوئے لوہے سے مردوں کے ہاتھ پیر اور عورتوں کی چھاتیوں کو داغا جاتا۔

"In several places the soldiers applied red-hot irons to the hands and feet of men, and the breasts of women."

☆ زندہ انسان کو آگ میں جھونک دیا جاتا، پھر ادھ جلی حالت میں باہر نکال کر سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

"... they snatched him from the fire just as he was on the point of being burned."

☆ مرد و عورت کو پیروں اور بالوں سے باندھ کر چمنی میں لٹکا دیا جاتا اور نیچے آگ جلا دی جاتی تا کہ وہ آگ میں تپ کر اور دھوئیں میں گھٹ کر تڑپ تڑپ کر مر جائے۔

"... they hung up men and women by the hair and some by their feet, on hooks in chimneys, and smoked them with wisps of wet hay till they were suffocated."

☆ تڑپ تڑپ کے مرنے کے لیے تیز آگ میں بھون دیا جاتا۔

"they were bound before a great fire and being half-roasted."

☆ برہنہ کر کے کھلے عام سر سے پاؤں تک پورے جسم میں سوئیاں چبھوئی جاتیں۔

"They stripped them naked and after a thousand indignities, stuck them with pins and needles from head to foot."

☆ مردوں اور عورتوں کے پیٹ میں دھونکنیوں سے اس قدر ہوا بھری جاتی کہ پیٹ پھول کر پھٹ جاتا۔

"They blew up men and women with bellows till they burst them."

☆ بازوؤں کو رسیوں سے باندھ کر کنوئیں میں مسلسل ڈبکیاں دی جاتیں۔

"They tied some under the arms with ropes and plunged them again and again into wells."

---

(1) The Age of Faith by Will Durant, P. 783-784

☆ کئی کئی دنوں تک کے لیے دودھ پلانے والی ماؤں کو باندھ دیا جاتا، پھر ان کے سامنے ان کے شیر خوار بچوں کو چھوڑ دیا جاتا جو روتے بلکتے دم توڑ دیتے۔

"They bound mothers, that gave suck to posts and let their sucking infants lie languishing in their sight for several days and nights, crying and gasping for life."

☆ جنگلوں اور میدانوں میں چھوڑ کر جنگلی جانور کی طرح شکار کیا جاتا۔

"... they pursued them into the fields and woods where they shot them like wild beasts."

☆ زنجیر میں باندھ کر ہلکی و دھیمی آنچ کے اوپر جھلایا جاتا حتی کہ وہ بھن جاتا۔

"... he was suspended over a slow fire on a chain and allowed to swing back and forth as he roasted."(1)

☆ ملزم کو بستر سے کھینچ کر اس کے سر پر ہتھوڑے سے مارا جاتا۔

"... dragging suspects from their beds and hitting people on the head with a large club."

☆ جنگلہ میں باندھ کر بازار تک گھسیٹ کر لایا جاتا، پھر گرم گرم لوہے کے ذریعہ اس کے ہاتھ پیر کو مروڑ کر توڑ دیا جاتا۔

"He was dragged to the market place on a hurdle, and his hand and foot were twisted off with red hot pincers."

☆ منھ کو ایک قسم کی لگام کے ذریعہ اس طرح کس دیا جاتا کہ زبان باہر نکل آتی، پھر زبان کو کاٹ دیا جاتا اور منھ کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا۔

"The method was to seal their mouths with a kind of iron gag that allowed the tongue to protrude, then the end of the tongue was sliced off and burned with a red hot iron."

☆ زمین پر لٹا کر کلہاڑی یا لوہے کی سلاخ سے اس کی کمر توڑ دی جاتی، پھر اسے تڑپتا ہوا مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

"People were made to lie on the ground and had their backs broken with a tremendous blow of an iron bar or axe, then they were left to die."(2)

ظلم و تشدد کی یہ وارداتیں حقیقت پسند مسیحی مؤرخین سے پوشیدہ نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان حقائق کے

---

(1) History Of The Church by H.C.Wickersham, PP.224-225
(2) A Criminal History Of Mankind,P.228

مطالعہ کے بعد مشہور مؤرخ گبن (Gibbon) کو یہ کہنا ہی پڑا:

"The church of Rome defended by violence, the empire which she had acquired by fraud; a system of peace and benevolence was soon disgraced by proscriptions, war, massacres, and the institution of the holy office."(1)

(روی کلیسا نے اپنی اُس سلطنت کی حفاظت ظلم وستم سے کی جسے اس نے دھوکہ سے حاصل کیا تھا، جلاوطنی، جنگ و جدل، کشت وخون اور احتساب مقدس کی کارروائیوں سے امن وسکون، اور الفت ویگانگی کا پورا نظام تباہ ہوگیا)

یہودیوں پر مظالم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصلیب کے موقع پر رومی حاکم پیلاطس نے کہا تھا:

''اس کی موت کا میں ذمہ دار نہیں ہوں، تم ہی لوگ اس کے ذمہ دار ہو۔''(۲)

اس کا جواب یہودیوں نے نہایت غرور کے ساتھ دیا:

''اس کی موت کے ہم ہی ذمہ دار ہیں، اور اگر بطور سزا کچھ مقرر ہو تو اس کو ہم اور ہماری اولاد بھگت لیں گے۔''(۳)

حضرت عیسیٰ کے بعد بھی یہودیوں کا ستم جاری رہا، انھوں نے مسیحیوں کو مٹانے اور انھیں تہہ تیغ کرنے کی ہر چند کوششیں بھی کیں لیکن وہ مٹ مٹ کر بھی زندہ رہے اور بڑھتے رہے، حتی کہ مسیحیت تدوین اشاعت کے مرحلہ سے گذر کر اقتدار کی کرسی پر متمکن ہوگئی، تب مسیحیوں نے ظلم وستم کے اگلے پچھلے سارے رکارڈ توڑ دیے اور:

"With the triumph of Christianity, the Children of Israel had to repay His suffering a millionfold."(4)

(مسیحی کے غلبہ کے بعد بنی اسرائیل کو عیسیٰ کی تکالیف کا کئی لاکھ گنا بدلہ چکانا پڑا)

یہودیوں پر ہوئے مظالم درحقیقت ان کے کرتوتوں کی سزا تھی، انبیاء کے استہزاء وتوہین اور ان کے قتل کی عادت نے ان کے اندر حد سے زیادہ غرور وگھمنڈ پیدا کر دیا تھا، اور اسی گھمنڈ میں انھوں نے خم ٹھوک کر کہا تھا کہ عیسیٰ کا خون ہمارے اور ہماری اولاد کے سر ہے:

"It was a punishment of the Jews in answer to their challenge, "His blood be upon us and upon our children."(5)

(یہ سزا تھی یہودیوں کے اس فخریہ اعتراف کی کہ اس کا خون ہم پر اور ہماری اولاد کی گردنوں پر ہوگا)

---

(1) The Decline and Fall of Roman Empire, Vol.2, P.249

(۲) متی/ ۲۷: ۲۴-۲۵

(4) Uses of the Past, P.91

(5) A Short History Of The Catholic Church By H.Wedewer, P.13

CamScanner

کلیسا نے اقتدار ملنے کے بعد معاشرہ کے ہر طبقہ کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا، تاہم جو کلیسا کے سامنے سرنگوں رہا اور اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے رہا کلیسا نے اس کے ساتھ احسان وکرم کا معاملہ بھی کیا لیکن اس استثناء سے یہودی پوری طرح مستثنیٰ تھے، ان کے حق میں کلیسا کا رویہ کسی بھی صورت میں نرمی کا نہیں تھا، رومی شہنشاہوں نے جب کبھی یہودیوں کے ساتھ رعایت برتنی چاہی کلیسا نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور ان کے حق میں جاری ہوئے کسی بھی قانون کو باقی رہنے نہیں دیا بلکہ وقفہ وقفہ سے اپنے فرمانبردار شہنشاہوں کے ذریعہ ایسے ایسے قوانین کا نفاذ بھی کروایا جن کے تحت یہودیوں کے لیے صرف سانس لینے کا اختیار حاصل رہا:

"It has already been seen that the Church held the Jew to be a being deprived, by the guilt of his ancestors, of all natural rights save that of existence."(1)

(کلیسا کے نزدیک ایک یہودی اپنے آباء اجداد کے گناہ کی وجہ سے فقط زندہ رہنے کے حق کے علاوہ تمام دیگر قدرتی حقوق سے محروم تھا)

مغربی معاشرہ میں یہود اچھوت کی طرح تھے، ان کا ایک خاص قسم کا لباس ہوتا تھا تاکہ وہ الگ ہی نظر آئیں، عیسائی عورتوں سے میل ملاپ سنگین جرم تھا، مسیحیوں پر فرض عائد کیا گیا کہ وہ یہودیوں سے لین دین اور دوسرے معاملات روا نہ رکھیں، اور یہودیوں کے لیے اس بات کی قطعی اجازت نہیں تھی کہ کسی مسیحی کو غلام رکھے۔

''چنانچہ بعض احکامات ایسے بھی جاری کیے گئے جن کی بنا پر یہودی آقاؤں کے مسیحی غلاموں کو آزادی حاصل ہوگئی۔''

(Some measures were also taken, providing for the freedom of the Christian slaves of Jewish masters.)(2)

890ء میں پوپ اسٹیفن ششم (Stephen VI) نے اس بات پر شدید تشویش اور سخت ناراضگی کا اظہار کیا کہ مسیحی ''خدا کے دشمنوں'' (Enemies of God) کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں، ان کے ساتھ معاملات کرتے ہیں، اور انھیں اپنی زمینوں میں تصرف کا حق دیتے ہیں، پس کلیسا کی اس سوچ کے نتیجہ میں یہودیوں کو متعدد بار قتل عام اور ضبطی جائداد کا نشانہ بننا پڑا اور وہ بارہا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے (۳)

ایک موقع پر پوپ گریگوری ہفتم نے مسیحی حکماء، امراء وحکام کو ملحدین ومشرکین کے ساتھ یہودیوں کے قتل پر یہ کہتے ہوئے اکسایا:

---

(1) History of Inquisition Of Spain by H.C. Lea, V.1, P.81

(2) History Of European Morals, V.2, P.64

(3) History of Inquisition Of Spain by H.C. Lea, V.1, P.81

"Cursed be he that refraineth his sword from blood "(1)

(جس نے بھی اپنی تلوار ان کے خون سے رنگین نہیں کی وہ لعنتی ہے)

یہودیوں نے کلیسا کے ظلم وستم سے بچنے کے لیے خودکشی کی راہ اختیار کی چنانچہ قرون وسطیٰ میں بے شمار یہودیوں نے خودکشی کی (A multitude perished by their own hands)، 1340ء میں ایک موقع پر تقریباً پانچ سو یہودیوں نے اجتماعی طور پر خودکشی کر لی، 1095ء میں ہزارہا یہودیوں نے کلیسائی عقوبتوں سے بچنے کی خاطر خود کو ہلاک کر ڈالا۔ (۲)

اسپین کی احتسابی عدالتوں نے سب سے زیادہ ظلم مسلمانوں اور یہودیوں پر ہی ڈھائے تھے، یہودیوں سے ان کو سخت چڑ تھی اور اس قدر حقارت ونفرت تھی کہ وہ اسپین کی سرزمین پر یہودیوں کے ناپاک وجود کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا:

"Spain was too holy a land to be polluted with the presence of a Jew, even in captivity."(3)

(اسپین اس قدر مقدس ہے کہ اسے کسی یہودی کے وجود سے ناپاک نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ قید خانہ میں ہی کیوں نہ ہو)

چنانچہ 31 / مارچ 1499 کو اسپین حکومت کی جانب سے ایک فرمان جاری کیا گیا جس کے تحت یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ یا تو وہ عیسائی ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔ اس فرمان کے بعد اسپین سے ہجرت کر کے دنیا بھر میں بکھرنے والے یہودیوں کی مجموعی تعداد تقریباً چار لاکھ بیس ہزار بتائی جاتی ہے:

"As computing the number of exiles at 420,000."(4)

جبکہ اسی ہزار کے قریب سرحد عبور کر کے پرتگال چلے گئے اور پچاس ہزار یہودی ہجرت کر کے عثمانی سلطنت میں جا پہنچے:

"About eighty thousand crossed the border into Portugal, and fifty thousand took refuge in the Ottoman Empire." (5)

اس فرمان کے بعد اندلس میں یہودیوں کا عرصۂ حیات تنگ سے تنگ ہو گیا، بہت سے یہودی جو اندلس میں ہی بس گئے تھے انھوں نے اس عذاب سے خود کو بچانے کے لیے مسیحیت کو گلے سے لگا لیا، کلیساؤں میں حاضری دی، بپتسمہ لیا، کلیسائی رسم ورواج کو اختیار بھی کیا لیکن اس کے باوجود حکومت کو ان سے اطمینان نہیں تھا، اور ہزارہا دعوائے

---

(1) Rationalist Encyclopaedia, P.270
(2) History Of European Morals, V.2, P.50
(3) The Inquisition Of Spain By H.C. Lea, V.1, P.142
(4) The Inquisition Of Spain By H.C. Lea, V.1, P.142
(5) History of Jews By Paul Johnson, P. 229

"کس قدر یہودی ہلاک کیے گئے اس سلسلہ میں کوئی مستند دستاویز تو نہیں ہے تاہم مؤرخین کا اعتراف ہے کہ اس ابتدائی دور میں تقریباً تیرہ ہزار نومسیحی یہودیوں کو زندہ جلادیا گیا۔"

(There is no reliable documentation of the actual numbers of people killed. Historians once believed that about thirteen thousand conversos were burned during this early period.)(1)

کلیسا کی جانب سے صلیبی جنگوں (Crusades) کا سلسلہ گرچہ مسلمانوں کے خلاف شروع کیا گیا تھا لیکن ان جنگوں میں یہودیوں کو بھی خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا، اور جہاں کہیں ممکن ہو سکا انھیں نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، مغربی مؤرخین کا اعتراف ہے کہ جب کبھی بھی مسیحی غالب آئے تو انھوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کو وحشت ناک ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

صلیبی جنگ کے پروپیگنڈہ کے نتیجہ میں مسیحی عوام میں یہودی مخالفت ذہنیت میں شدت پیدا ہوئی، کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ یہودی ہی حضرت عیسیٰ کی مصلوبیت کے ذمہ دار (Responsible for the Crucifixion) ہیں، اس لیے ہزاروں میل مسلم دشمن کو ختم کرنے سے پہلے قریب کے ان دشمنوں کا خاتمہ کرنا ضروری ہے:

"When, in 1095, Pope Urban II proclaimed the First Crusade, some Christians thought it desirable to kill the Jews of Europe before proceeding so far to fight Turks in Jerusalem."(2)

(1095ء میں جب پوپ اربن دوم نے پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کیا تو کچھ مسیحیوں نے سوچا کہ یروشلم میں ترکوں سے جنگ کرنے سے پہلے یورپ کے ان یہودیوں کو قتل کرنا ہے زیادہ مناسب ہے جو یورپ میں آباد ہیں)

چنانچہ صلیبی جنگوں کے دوران پہلے انگلینڈ و جرمنی میں یہودیوں کو نشانہ بنایا گیا، اجتماعی طور پر ان کا قتل کیا گیا اور ان کی تجارت و معیشت کو پوری طرح تباہ کردیا گیا، یہودیوں پر مظالم کا اندازہ مشہور مؤرخ "برٹرینڈ رسل" (Bertrand Russell) کے ان الفاظ سے بھی لگایا جاسکتا ہے:

"There were large-scale murders of Jews in Germany at the time of the first Crusade, those who were not massacred were often despoiled of their property and forcibly baptized."(3)

(پہلی صلیبی جنگ کے دوران جرمنی میں یہودیوں کا وسیع پیمانہ پر قتل عام کیا گیا، جنھیں قتل نہیں کیا گیا ان کی جائدادیں چھین لی گئیں اور انھیں زبردستی بپتسمہ دیا گیا)

---

(1) Fields of blood by Karen Armstrong P.129

(2) The Age of Faith, P.389

(3) A History of Western Philosophy, P.434

"The Jews, before the Crusades, had almost a monopoly of the trade in Eastern goods through- out Europe; after the Crusades, as a result of the persecution of Jews, this trade was largely in Christian hands."(1)

(صلیبی جنگوں سے پہلے تمام یورپ میں مشرقی اشیاء کی تجارت کی اجارہ داری یہودیوں کے تصرف میں تھی، صلیبی جنگوں کے بعد یہودیوں کو اذیتیں دینے کے نتیجہ میں یہ تجارت وسیع طور پر مسیحیوں کے ہاتھ میں آ گئی)

بلاشبہ یروشلم کی گلیوں میں بہنے والے مسلم خون میں یہودیوں کی سرخی بھی شامل تھی، کلیسا کی صلیبی فوجوں نے یروشلم کو تہہ و بالا کر دیا اور وہاں پر موت کا ایسا تانڈو کیا کہ عورتیں اور بچے بھی محفوظ نہ رہ سکے، ان کی تلواروں نے ہر عمر اور ہر جنس کے ٹکڑے ٹکڑے کیے، یہودیوں نے جب دیکھا کہ ان کے صلیبی دشمن ان کے بچوں اور عورتوں پر حملے کر رہے ہیں، کسی عمر کے بھی بچہ کو معاف نہیں کر رہے ہیں تو وہ ایک دوسرے پر گرتے چلتے گئے اور بھائی، بہن، بیوی، بچے سب ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے:

"....and thus they perished at each other's hands."

اور اس سے بھی زیادہ ہولناک و روح فرسا منظر یہ تھا کہ ماؤں نے اپنے دودھ پیتے بچوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں ہلاک کیا، چھریوں سے ان کے گلے کاٹ دیے، خنجر و نیزے گھونپ دیے، کیونکہ ان کے نزدیک غیر مختون (غیر یہودی) کے ہاتھوں مرنے سے بہتر تھا کہ خود اپنے ہی ہاتھوں یا اپنوں کے ہاتھوں ہلاک ہو جائیں:

"Horrible to say, mothers cut the throats of nursing children with knives and stabbed others, preferring them to perish thus by their own hands rather than to be killed by the weapons of the uncircumcised."(2)

تباہی و بربادی کے اس ماحول میں بہت سے یہودیوں نے جان کی حفاظت کے لیے اپنی مرکزی عبادت گاہ میں پناہ بھی لی لیکن:

"No mercy was shown to them, the building was set on fire and they were all burnt within"(3)

(ان پر کوئی رحم نہیں کیا گیا، عمارت کو آگ لگا دی گئی اور وہ سب کے سب اسی میں زندہ جل کر مر گئے)

یہودیوں کے اجڑنے کے بعد دوبارہ بسنے اور آباد ہونے کی مکمل تاریخ مسلم حکومتوں کی مرہون منت ہے، رومی شہنشاہوں نے انھیں ملک بدر کیا تو وہ مسلم اندلس میں ہی پناہ گزیں ہوئے، مسیحیوں نے اندلس میں زمین تنگ کر دی تو عثمانی حکومت نے ان کی اشک شوئی کی اور انھیں پناہ دی، صلیبی جنگوں میں بھی ان کے لیے مضبوط پشت

---

(1) A History Of Western Philosophy, p.434

(2) *http://www.fordham.edu/halsall/source/1096jews.html*

(3) A History of the Crusades by Steven Runciman, V.1, P.287

CamScanner

پناہ مسلمان ہی تھے۔

لیکن ان تمام تر رواداریوں کے باوجود یہودیوں کی احسان فراموشی دیکھئے کہ انھوں نے مسلم حکومتوں میں رہ کر انہیں کے خلاف نہ صرف سازشیں رچیں بلکہ ان کی تباہی ونسل کشی کی کوششیں بھی کیں، جس کی ایک زندہ مثال ارض فلسطین ہے!

غلاموں کی مظلومیت

غلامی کا رواج اور غلاموں کا وجود ماقبل تاریخ سے رہا ہے، یہ طبقہ ہمیشہ مظلوم اور حقیر ترین سمجھا گیا ہے، ظہور مسیحیت کے وقت رومی سلطنت میں غلامی کا عمومی رواج تھا، اور غلاموں کی تعداد آزاد انسانوں سے کہیں زیادہ تھی، مسیحیت کے دعوائے عالمگیریت کے تناظر میں اس بات کی امید کی جاسکتی تھی یہ مذہب سماج کے ہر طبقہ کی اشک شوئی کرے گا، اور انسانی بنیادوں پر ہر فرد بشر کو مساوات کا حق دے گا، لیکن معاشرہ کے دیگر طبقوں کی طرح غلاموں کا طبقہ بھی انسانی حقوق سے محروم رہا اور کلیسا نے اپنے دور اقتدار میں اس کی جانب کوئی توجہ نہیں کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے غلامی کی زنجیروں کو تنگ سے تنگ کر دیا اور اپنی پر تعیش زندگی کا ایک آلہ بنالیا اور جب غلاموں کے غول کے غول اس کے قبضہ میں آگئے تو اس کے بشپ کہنے لگے:

"ان کی آزادی کا زمانہ ابھی نہیں آیا، شاید یہ زمانہ صدیوں کے بعد آئے۔"(۱)

کلیسا کے نزدیک غلامی ناقابل توجہ امر (Indifferent Circumstance) تھا یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ادوار میں کلیسا نے اس موضوع پر کبھی بحث ہی نہیں کی:

"The Church never called slavery in question at all"(2)

بعد کے دور میں جب غلامی کا موضوع زیر بحث آیا تو ارباب کلیسا نے پورے شد و مد کے ساتھ اس کی تائید وحمایت کی، چنانچہ سینٹ آگسٹائن کا کہنا ہے:

(غلامی خدا کے نزدیک کوئی جرم نہیں بلکہ اس نے اسے گناہ کی ایک سزا کے طور پر مقرر کیا ہے)(۳)

شہنشاہ شارلیمن کے عہد میں سلاؤ (Slav) قوم کو پوری طرح تباہ کیا گیا اور ان کو اس کثرت سے غلام بنایا گیا کہ لفظ سلاؤ بدل کر سلیو (Slave) یعنی غلام ہو گیا۔(۴)

---

(1) The Decline and Fall of Roman Empire, V.5, P.526
(2) Paganism and Christianity by J.A.Farrer, P.198
(3) The City of God, Book.XIX, Chapter.XV
(4) *www.downbound.com/slavery_s/29.htm*

سینٹ امبروز (St. Ambrose) غلامی کا پرزور حامی اور اس کا مؤید تھا اور اس کی توجیہ وہ اس طرح بیان کرتا:

"...slaves had an unusual advantage for the exercise of the Christian virtues of humility, patience, and forgiveness of enemies, and that men cursed with original sin were not fit to govern themselves anyway."(1)

(غلاموں کو غلامی حالت میں اپنے اندر عاجزی، صبر اور دشمنوں کو معاف کر دینے کے مسیحی اوصاف پیدا کرنے کا بہتر موقع ملتا ہے، اس کے علاوہ ازلی گناہ کی لعنت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انسان اس قابل ہی نہیں کہ وہ آزاد رہیں اور اپنی ذات پر حکمرانی کریں)

کلیسا نے معاشرہ میں طبقاتی تفاوت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس نے خود بھی ایک استحصالی طبقہ کی حیثیت اختیار کر لی، معاشرہ کے مظلوم طبقوں کو کلیسا کی ابتدائی تعلیمات و مساوات کے پروپیگنڈوں کی بدولت یہ توقع تھی کہ کلیسا کے اقتدار میں آنے کے بعد ان پر جبر و استبداد اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا، لیکن کلیسائی عروج میں غلاموں کا یہ شعبہ نہ صرف سنگین مظالم کا شکار ہوا بلکہ جبری غلامی کا ایک سلسلہ بھی چل پڑا جس میں جنگوں کے قیدیوں کے علاوہ کثرت سے مسلمان اور یہودی شامل تھے، جن کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی۔

پوپ لیو اعظم نے یہ حکم نامہ بھی جاری کر رکھا تھا کہ کوئی بھی غلام نہ پادری بن سکتا ہے اور نہ کلیسا کے کسی عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک مقدس سلسلہ ہے جو غلام کی وجہ سے ناپاک و نجس ہو جائے گا:

"No slave could become a cleric lest his "vileness" should "pollute" the sacred order."(2)

چھٹی صدی عیسوی میں گریگوری اعظم وہ واحد پوپ تھا جو پورے یورپ میں سب سے زیادہ غلاموں کا مالک تھا، اس نے اپنے دور پاپائیت میں یہ قانون نافذ کیا تھا کہ کوئی بھی غلام کسی بھی آزاد مسیحی عورت سے شادی نہیں کر سکتا:

"Forbade slaves to marry free Christian women."(3)

غلاموں کے ساتھ ان کی اولاد بھی آقا کی ملکیت ہوتی تھی، اور جس طرح مالک کو جائداد میں تصرف کا پورا حق حاصل ہوتا ہے وہی تمام حقوق یہاں بھی حاصل تھے:

"The children of slaves were the property of their master, who could dipose of or alienate them like the rest of his property."(4)

غلاموں پر جو مظالم پہلے سے ڈھائے جاتے تھے وہ بدستور قائم رہے چنانچہ مغربی معاشرہ میں بالائی طبقہ کے

---

(1) The Uses of the Past, P.188

(2,3) The Social Record of Christianity, P.27

(4) The Decline and Fall of Roman Empire, V.5, P.526

افراد کو جرم کی پاداش میں جرمانے کی معمولی سزا ملتی یا کچھ سرزنش کردی جاتی جبکہ غلام طبقہ کو جسمانی اذیت، گردن زدنی، جبری مشقت، زندہ جلانا، اور اکھاڑوں میں چیر پھاڑ کے لیے درندوں کے حوالہ کر دینا سب کچھ شامل تھا۔

سلطنت روم اور اس کے امراء کے زوال کے ساتھ غلاموں کا ادارہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا، اور یورپ میں "جاگیرداری نظام" رائج ہوا جس کے تحت مسیحیوں نے زمینی کمیر یعنی مزارع (Serf) کی شکل میں غلام بنا لیے جن کی قسمت کسی خاص قطعۂ زمین سے وابستہ ہوتی تھی، اور اس زمین کے ساتھ وہ بھی خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ زمین کے مالک ان سے سخت جسمانی مشقت لیتے، انھیں غیر انسانی سزائیں دیتے، ان کے اعضاء کاٹ ڈالنے اور مار ڈالنے تک کا اختیار رکھتے تھے، اس نظام کا سب سے تاریک پہلو یہ تھا کہ زیادہ تر جاگیریں یا تو کلیسا کے پاس تھیں، یا جاگیرداروں سے کلیسا کا مضبوط گٹھ جوڑ تھا، جس نے انھیں غلاموں پر زیادتیوں کا اخلاقی جواز فراہم کر رکھا تھا۔ اور اس میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈکس سبھی کلیسائیں شامل تھیں، اور یہ سلسلہ یورپ میں اٹھارویں صدی تک اور روس میں 1861ء تک قائم رہا۔ (1)

یورپ کے اصلاحی دور میں کلیسا نے غلاموں کی آزادی کی حوصلہ افزائی ضرور کی لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا بہت سے غلام خود کلیسا کی جائداد اور اس کی چاکری سے وابستہ تھے:

"The church began to encourage manumission, while ignoring the fact that many slaves were attached to church officials and church property"(2)

(کلیسا نے غلاموں کی آزادی کی ہمت افزائی شروع کر دی اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ زیادہ تر غلام کلیسا کی غلامی اور کلیسا کی جائداد سے ہی وابستہ تھے)

یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا آغاز مختلف انقلابات (Revolutions) سے ہوا تھا، ان انقلابات میں ایک "صنعتی انقلاب" بھی تھا جس نے اقتصادیات و معاشیات میں زبردست تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں، اس انقلاب کی تیز آندھی میں کمیروں کا نظام (Serfdom) بھی خاک میں مل گیا اور ان غلاموں کو آزادی نصیب ہوئی، لیکن مغربی دنیا کے ضمیر میں غلاموں پر انحصار اس قدر رچ بس چکا تھا کہ اس انقلاب نے ان کے اندرون کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی، اور انھوں نے افریقہ کی صورت میں غلاموں کی ایک نئی زرخیز زمین دریافت کر لی، جس کی پشت پناہی خود کلیسا نے کی، چنانچہ 1511ء میں کلیسا نے اس بات کی اجازت دی کہ افریقہ کے لوگوں کو غلام بنا کر اسپین لایا جائے:

---

(1) The Age of Faith By Will Durant, P.555

(2) The Columbia Electronic Encyclopedia,
http://www.infoplease.com/ce6/bus/A0861124.html

"In 1511 Ferdinand the Catholic gave permission to import slaves from Africa into Hispaniola."(1)

افریقی باشندوں کو غلام بنانے کا سلسلہ 1440ء کے زمانہ سے ہی شروع ہو چکا تھا، 1511ء میں کلیسا کی اجازت کے بعد غلاموں کی تجارت سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار بن گیا اور لاکھوں افریقیوں کو غلام بنایا جانے لگا، کھلے عام افریقہ کے غریب ومظلوم لوگوں پر حملے شروع ہوئے، انھیں زبردستی غلام بنایا گیا، بے دردی کے ساتھ انھیں جہازوں میں ٹھونس کر اور رسیوں میں باندھ کر لایا جاتا جس کی وجہ سے بہت سے راستہ میں ہی ہلاک ہو جاتے جنھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا، ایک بڑی تعداد دائمی مرض میں بھی مبتلا ہو جاتی، پھر انھیں جہازوں، گھروں، کھیتوں اور فیکٹریوں کے اندر بیگار میں مڑھ دیا جاتا۔

غلاموں کی تجارت ایک نفع بخش کاروبار تھا جس کی مختلف شکلیں رائج تھیں، لوٹ مار اور قذاقوں کے ذریعہ جو غلام بنائے جاتے ان کے علاوہ بھی بہت سے غلام تھے، کچھ ایک متعین مدت کے لیے غلام ہوتے، کچھ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے غلامی اختیار کرتے، اور کچھ بطور پیشہ اپنی مرضی سے بھی غلام بن کر خدمت کرتے جس میں انھیں اپنے ملک واپس جانے کی اجازت بھی ہوتی۔

1640ء میں لوئس سیزدہم نے یہ فرمان جاری کیا کہ وہ سارے افریقی جو کسی بھی طرح فرانس کی کالونیوں میں آئے ہیں اور ان کی موجودگی کی خواہ کوئی بھی شکل ہو وہ سب کے سب غلام بنائے جاتے ہیں:

In 1640 Louis XIII issued an edict by which all Africans whatever who came into the French colonies, under any circumstances, were to be made slaves.'(2)

1755ء میں برطانیہ کے جزائر غرب الہند (West Indies) میں افریقی غلاموں کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار تھی جبکہ خود گوروں کی آبادی نوے ہزار تھی:

"In 1755 the negro slaves in the British West Indies numbered 240,000, while the white population was only 90,000."(3)

1776ء میں جب امریکہ کی آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس وقت آبادی کا پانچواں حصہ غلام تھا:

"In America by the date of the Declaration of Independence (1776) about one fifth of the population was enslaved."(4)

(1,2) Encyclopaedia of Religion and Ethics, V.11, P.608

(3) Encyclopaedia of Religion and Ethics, V.11, P.609

(4)The Columbia Electronic Encyclopedia,
http://www.infoplease.com/ce6/bus/A0861124.html

جبری غلامی کی اس شکل کو کلیسا کے ذریعہ نہ صرف بڑھاوا ہی ملا، بلکہ کیتھولک و آرتھوڈکس سارے کلیسا خود اس کاروبار میں شریک تھے، اور زمینی کیروں کی ملکیت کی طرح ان افریقی غلاموں کی ملکیت میں بھی کلیسا پیش پیش تھا، اٹھارویں صدی میں امریکہ کے مختلف کلیسا چھ لاکھ غلاموں کے مالک تھے۔ (۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ غلاموں کا مظلوم طبقہ کلیسائی اقتدار میں بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہا، اور کلیسا کے دعوائے عالمگیریت وفلاح انسانیت کے باوجود اس کی تکلیفوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، بلکہ کلیسا خود اس کا استحصال کرتا رہا۔

کلیسا کی علم دشمنی

کلیسا نے اپنے اقتدار کا تحفظ ظلم وستم سے کیا، اس نے انسان کے جسموں کے ساتھ اس کی عقل وروح پر بھی سخت پہرے بٹھادیے، غور وفکر کی سبھی راہیں مسدود کردیں، علوم ومعارف کے سارے سوتے خشک کردیے، سائنس وفلسفہ، فلکیات وارضیات، شعروادب، غرض ہر علم وہر فن کا حقیقی سرچشمہ صرف کلیسا ہی تھا، تدبر وتفکر کے سارے دروازے کلیسا ہی سے کھلتے اور کلیسا ہی پر بند ہوتے تھے، علم وہی جو کلیسا سکھلائے، سچ وہی جو کلیسا بتلائے، الفاظ بھی کلیسا کے اور معانی بھی کلیسا کے، اس کے علاوہ ہر نیا نظریہ بغاوت، ہر نئی فکر جادوگری اور ہر نئی سوچ کفر وبدعت کی تعبیر تھی، اور کلیسا کے حدود سلطنت میں ہر ایسے مفکر ومدبر کی سزا موت یا موت سے بدتر زندگی تھی۔

چنانچہ ایک اعلیٰ درجہ کے پادری نے دعوی کیا کہ انجیل مقدس کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے:

"This work took place and man was created by the Trinity on October 23, 4004 BC, at nine o'clock in the morning."(2)

(اس نظام کائنات اور انسان نے تثلیث کے ذریعہ بروز اتوار 23/اکتوبر 4004 قبل مسیح کو صبح 9 بجے جنم لیا تھا)

جبکہ کچھ عرصہ پہلے ایک سائنسداں وائی کلف (John Wycliffe) نے کہا تھا کہ یہ زمین کئی کروڑ سال پرانی ہے، کلیسا نے مُردہ وائی کلف کی اس گستاخی کو کسی بھی صورت میں معاف نہیں کیا، چنانچہ قبر سے اس کی سڑی گلی ہڈیاں نکالی گئیں، اس پر مقدمہ چلایا گیا، سزا سنائی گئی، اور پھر ان ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کرکے سمندر میں اڑادیا گیا تاکہ کلیسا سے اختلاف اور شک وشبہ کے جراثیم زمین کو آلودہ نہ کرسکیں۔

مغربی معاشرہ میں ہر وہ تعلیم ناجائز تھی جو براہ راست کلیسائی تعلیمات کے مطابق نہیں تھیں، چنانچہ قرون

---

(1) Rationnalist Encyclopaedia, P.546,547

(2) A History of The Warfare of Science With Theology In Christendom By Andrew Dickson White, p.53

CamScanner

وسطی میں علوم سے مراد صرف کلیسا کی تعلیم تھی اور جس چیز کو فلسفہ کہا جاتا تھا وہ صرف الٰہیاتی مباحث (Theology) تھے۔

اٹھارویں صدی تک مغرب کی تمام درسگاہیں کلیسا کے زیرنگرانی تھیں، لوگوں کی فکر کا رخ صرف کلیسا متعین کرتا تھا، وہ کیا سوچیں اور کیسے سوچیں، کسے اچھا کہیں اور کسے برا کہیں یہ خود کلیسا بتلاتا، کوئی فرد کسی درسگاہ میں یا ذاتی طور پر تعلیم دینا چاہتا تو اسے کلیسا سے اجازت نامہ (License) حاصل کرنا ضروری تھا:

"No person might teach in a school or private family unless licensed by his Bishop."(1)

کلیسا سے تعلیم وتعلم کی اجازت ملنے کے بعد بھی ہر کتاب کی منظوری لینا ضروری تھا، کتابیں سختی سے سینسر (Censor) کی جاتی تھیں، اور سنسرشپ (Censorship) کا اختیار صرف کلیسا کو ہی تھا:

"Books were strictly censored, and the censorship was in the hands of the Bishops."(2)

پوپ گریگوری اعظم کو یہ اطلاع ملی کہ فرانس کا ایک بشپ پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے تو وہ سخت برہم ہوا اور اُس پر خفا ہوتے ہوئے یہ تحریر لکھی:

"A report has reached us, which we cannot mention without a blush, that thou expoundest grammar to certain friends."

(ہمیں یہ اطلاع ملی ہے، جس کا ذکر ہم شرمندہ ہوئے بغیر نہیں کرسکتے کہ تم اپنے بعض دوستوں کو زبان کے قواعد (Grammar) پڑھاتے ہو)

پوپ نے اس بشپ کو مجبور کیا کہ وہ اس وحشت ناک (Horrible) اور انتہائی گھٹیا (Execrable) کام سے باز آجائے۔(۳)

توہمات کی دنیا

سینٹ آگسٹائین (St.Augustin) کے عہد سے ہی سائنس کے ہر مسئلہ کی سند کتب مقدسہ میں ڈھونڈی جانے لگی تھی، اہل کلیسا نے آیات انجیل سے تاریخ وجغرافیہ کے ایسے ایسے خیالی نکات کا استخراج کیا جنھوں نے حقیقی علم کی راہیں مسدود کردی تھیں، اور انسانیت کی ترقیات کئی صدیوں کے لیے رک گئی تھیں، کلیسا نے اپنے ان انکشافات وتحقیقات کو "Christian Topography" (جغرافیہ مسیحی) نام دیا۔

(1,2) The Century of Revolution By Christopher Hill, P.76

(3) Social Record of Christianity, P.32

CamScanner

کلیسا کا دعویٰ تھا کہ خدا نے ''کتاب مقدس'' (Gospels) میں نہ صرف حق وصدق کا معیار بیان کیا ہے ، بلکہ جن باتوں کا جاننا ہمارے لیے ضروری تھا وہ ساری باتیں اس میں درج ہیں، لہٰذا ہر طرح کا علم اناجیل اور روایاتِ کلیسا میں محفوظ ہے، اس لیے کتاب مقدس انسانی معلومات کا ایسا مجموعہ ہے جس پر اضافہ ہونا غیر ممکن ہے۔

کلیسا کے اس فکری جمود و تعطل کا نتیجہ تھا کہ پورا مغربی معاشرہ مختلف توہمات وخرافات کے گرداب میں پھنس چکا تھا، پورے یورپ پر گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اس تاریکی میں کلیسا نے ہر علم وفن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں تھام رکھی تھی اس دعویٰ کے ساتھ کہ علوم ومعارف کا سرچشمہ وہی ہے، جبکہ پادریوں کی علمی سطح اور ان کی عام معلومات کا عالم یہ تھا کہ ریڈ (Reade) کے بقول:

"They dissected the godhead and expounded the miraculous conception, giving lectures on celestial impregnations and miraculous obstetrics. They not only said that 3 was 1, and that 1 was 3; they professed to explain how that curious arithmetical combination had been brought about."

(سارے بشپ جاہل اور توہم پرست تھے، مگر ایک جیسا سوچ نہیں سکتے تھے، اور اختلاف پیدا کرنے کے لیے وہ اس کی وضاحت کرتے جس کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا اور اگر وجود تھا تو اس کی کبھی وضاحت نہیں ہو سکی، وہ جنت کی منظر کشی کرتے، پیچیدہ اور گہرے مذہبی مسائل پر بے تکان بولتے، انجم وافلاک کے اسرار کی وضاحت کرتے، خدائی معجزوں کے تجزیے پوری جاہلیت سے کرنا ان کا معمول تھا، وہ صرف ایک کو تین اور تین کو ایک نہیں کہتے تھے بلکہ یہ بھی بیان کرتے تھے کہ ان کا حساب صحیح ہے)

کلیسا کی توہمات پرستی اور اس کے معیارِ علم ومعلومات کا کچھ اندازہ ذیل میں درج چند مثالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

☆ دنیا کے سارے علوم فضول ہیں اور بے وقوفی ہیں۔

"All worldly sciences to be absurdities and fooleries"

☆ علم نجوم کا پڑھنا حماقت ہے اور بری بات ہے۔

".....studying astronomy as bad and senseless."

☆ علم ارضیات یہ ایک ناجائز تحقیق ہے، ایک سیاہ وتاریک فن ہے، خطرناک ومہلک سائنس ہے، تباہ کن ہتھیار ہے، اور آسمانی کتابوں کے خلاف ایک بغاوت ہے۔

"They declared geology not a subject of lawful inquiry, denouncing it as a dark art, as dangerous and disreputable, as a forbidden province, as infernal artillery, and as an awful evasion of the testimony of revelation."

☆ زمین ایک حقیر ترین دنیا ہے جو بہت جلد تباہ ہونے والی ہے، تو پھر ایسی دنیا کے بارے میں پڑھائی

کیوں جائے اور اس کے سلسلہ میں سوچا ہی کیوں جائے؟!

"The earth was a fallen world, and was soon to be destroyed. Why, then, should it be studied? Why, indeed, give a thought to it?"

☆ کسی خاص علاقہ میں بارش یا طوفان وغیرہ کا آنا شیطان کے اثر سے ہوتا ہے۔

"Rains and winds, and whatsoever occurs by local impulse alone, can be caused by demons."

☆ یہ عفریت ہیں جو قحط، بنجر پن، ہوا کی کثافت اور وبائی بیماریاں پیدا کرتے ہیں، وہ مجلی فضا کے بادلوں میں چھپے رہتے ہیں اور جب کفار ان کو دیوتا مان کر خون اور خوشبو پیش کرتے ہیں تو وہ کشش محسوس کرتے ہیں۔

"Origin said: "It is demons which produce famine, unfruitfulness, corruptions of the air, pestilences; they hover concealed in clouds in the lower atmosphere, and are attracted by the blood and incense which the heathen offer to them as gods."

☆ مسیحیوں کو جو بیماریاں ہوتی ہیں اس کا ذمہ دار عفریتوں کو قرار دینا چاہیے وہ خصوصاً مسیحیت میں نئے نئے داخل ہونے والوں کو اذیت پہنچاتے ہیں، حتی کہ معصوم نوزائدہ بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔

"St. Augustine said: "All diseases of Christians are to be ascribed to these demons; chiefly do they torment fresh-baptized Christians, yea, even the guiltless, newborn infants."

☆ شیاطین اور بدروحیں بیماری کا سبب ہوتی ہیں، جس میں دوائیں فائدہ مند نہیں ہوتیں، اس لیے دست مقدس کے ذریعہ آسیب اتار کر علاج کرنا چاہیے۔

"Gregory of Nazianzus declared that bodily pains are provoked by demons, and that medicines are useless, but that they are often cured by the laying on of consecrated hands."

☆ چیچک کی بیماری خدا کی طرف سے نازل ہونے والا قہر ہے، اس لیے اس کا علاج خدا کو مزید ناراض کرنے کے مترادف ہے۔

"The smallpox is a judgment of God on the sins of the people, and that to avert it is but to provoke him more".

☆ شہاب ثاقب آگ کے گولے ہوتے ہیں جو ناراض خدا بدکردار دنیا کی طرف پھینکتا ہے۔

"...as fire-balls flung by an angry God for the purpose of scaring a wicked

CamScanner

world."

☆ طوفان کو برپا کرنے کا کام شیطان اور اس کے چیلوں کا ہے، جسے ٹالنے کے لیے کلیسا کی گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں۔

"Storms were caused by Satan and his legions,..... .....ring the bell against the storm."

☆ آسمان سے بجلی کے گرنے اور اولہ باری کی درج ذیل پانچ وجوہات تھیں:

(۱) گناہوں سے توبہ نہ کرنا (۲) مذہب پر یقین نہ کرنا (۳) کلیسا کی حرمت میں لاپروائی برتنا (۴) پادری کو عشر دینے میں فریب دہی کرنا (۵) ماتحتوں پر ظلم کرنا۔

"....impenitence, incredulity, neglect of the repair of churches, fraud in the payment of tithes to the clergy and oppression of subordinates."

☆ شام کے وقت سورج جہنم میں جھانکتا ہے اسی لیے وہ سرخ دکھائی دیتا ہے۔

"Why is the sun so red in the evening?" "Because he looketh down upon hell."

☆ ایک موقع پر سویڈن (Sweden) میں ایک جگہ پانی سرخ ہو گیا تو پادریوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ یہ خدائی قہر (Wrath of God) کی علامت ہے۔ ایک نامور سائنسداں لنائیس (Linnaeus) نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ پانی میں چھوٹے چھوٹے سرخ جراثیم کے ملنے کی وجہ سے وہ سرخ دکھائی دے رہا تھا، یہ خبر جب بشپ کو ہوئی تو اس نے سخت الفاظ میں اسے "شیطانی غار" (Abyssum Satanae) کہہ کر اس کی مذمت کی، اور لنائیس نے گھبرا کر اپنی تحقیق واپس لے لی۔

☆ کلیسا کی نظر میں آندھی طوفان اور سیلاب کے ذریعہ تباہی کی ذمہ دار عورتیں تھیں چنانچہ 7/دسمبر 1484ء کو پوپ انوسینٹ ہشتم (Innocent VIII) نے یہ فرمان جاری کیا کہ ان جادو گرنیوں (Witchcrafts) کا سراغ لگاؤ جو موسم کو خراب کر کے انگور کے کھیتوں، باغوں، چراگاہوں اور فصلوں کو تباہ کرتی ہیں۔

".....especially those who by evil weather destroy vineyards, gardens, meadows, and growing crops."

اس فرمان کے نتیجہ میں ہزاروں عورتیں قید کی گئیں، انھیں سخت ترین اذیتیں دی گئیں، حتی کہ ان کے قریبی بھی ان سے خوف کھانے لگے اور یہ دعا کرنے لگے کہ موت کے ذریعہ سے ہی ان کو اس اذیت سے نجات مل جائے۔

"There was no limit to torture for persons accused of heresy or

witchcraft."

(لاتعداد مردوں اور عورتوں کو بدعت اور جادوگری کے نام پر سخت ترین اذیتیں دی گئیں)(1)

مذکورہ چند مثالوں کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کلیسا چاہتا تو اس کے ایک اشارہ پر پورا براعظم ایسی ترقی کرتا کہ دنیا دنگ رہ جاتی، لیکن مسیحیت اور مسیحی اقوام کی یہ بدقسمتی ہے کہ ارباب کلیسا نے اپنی زبردست طاقت کا ناجائز استعمال کیا، اس سے اپنے شخصی اقتدار کو مضبوط کیا ، اور یورپ کئی صدیوں تک بدستور جہالت وخرافات کی تاریکیوں میں ڈوبا رہا۔

مظلوم دانشور

مسیحیت کے عروج کا دور وہی ہے جسے خود مسیحی مؤرخین نے بالاتفاق تاریک دور (Dark Ages) سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ یہ دور علم ودانش اور تہذیب وتمدن کا نہیں بلکہ علم وعرفان کی مخالفت اور جہالت وتوہم پرستی کا دور تھا، یہ علماء ومحققین کی سرپرستی اور ان کی ہمت افزائی کا نہیں بلکہ ان کی تذلیل اور ان کے اعلیٰ افکار ونظریات پر جاہل پادریوں کے تسلط وتغلب کا دور تھا، یہ وہ دور تھا جب عوام کو سختی کے ساتھ تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا، اور علمی وفکری میدان میں مکمل تقلید پر مجبور کیا جاتا تھا، بائبل اور ارسطو وبطلیموس جیسے قدیم فلسفیوں کے افکار ونظریات کو تمام علوم کا سرچشمہ قرار دیا جاتا تھا، آزادانہ تحقیق وجستجو اور غور وفکر کی قطعی اجازت نہ تھی۔

لیکن دیگر اقوام خاص کر مسلمانوں سے اختلاط اور صلیبی جنگوں کے بعد جب یورپ میں علمی احیاء اور عقلیت کا دور دورہ ہوا تو اصحاب علم ودانش اور ارباب کلیسا کے درمیان ایک کشمکش کا آغاز بھی ہوا، جس میں کلیسا نے نہایت سفاکی ودرندگی کا مظاہرہ کیا، ہزاروں اہل فکر ودانش پر ارتداد کا فتوی لگا کر نہایت سخت سزائیں دیں، ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، کسی کو دھمکایا تو کسی مروایا، کوئی پابند سلاسل ہوا تو کوئی مصلوب، کسی کو مقدموں میں گھسیٹا گیا تو کسی کو نذر آتش کیا گیا۔

"بدنصیب روجر بیکن: ایک بے مثال سائنسداں کو اس لیے جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے اپنی تصنیف میں کوئی نئی بات کہی تھی، کوئی نیا خیال پیش کیا تھا، کیونکہ چرچ کا ایمان تھا کہ سائنس اور فلسفہ پر ارسطو حرف آخر تھا۔"

"The unfortunate Roger Bacon, a scientist of remarkable originality, was condemned to prison for daring to introduce 'certain novelties' (i.e. new ideas) into his work. The Church believed that Aristotle was the last word in scientific and philosophical knowledge."(2)

---

(1) مذکورہ بھی مثالوں کے حوالے اور اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

"A History Of The Warfare Of Science With Theology In Christendom by Andrew Dickson White."

(2)A Criminal History of Mankind, p.163 By Colin Wilson

مسیحیت کی تاریخ میں سب سے زیادہ نامبارک دن وہ ہے جب اس نے اپنے آپ کو سائنس سے علیحدہ کرلیا، 231ء میں آریجن (Origen) جو کلیسا کی طرف سے سائنس کا بہت بڑا وکیل اور سرپرست تھا اس کو مجبور کیا گیا کہ وہ کلیسائے اسکندریہ (Alexandria) چھوڑ کر قیصریہ (Caesarea) چلا جائے، اس کے بعد ارباب کلیسا صدہا سال تک اس کوشش میں مصروف رہے کہ سائنسی حقائق کو نظر انداز کر کے حقیقتِ اشیاء کی تاویل انجیل کی روشنی میں کریں، لیکن اس کوشش میں جو ناکامیاں انھیں نصیب ہوئیں ان کی پردہ دری تیسری صدی سے لے کر سولہویں صدی تک کی جاتی رہی۔ (1)

بلاشبہ کلیسائی افکار و نظریات کے غلبہ اور اشاعت کے سلسلہ میں احتسابی عدالتوں (Inquisition) نے جو بے تحاشا غیر انسانی مظالم ڈھائے ہیں ان کا شکار عظیم مفکر و سائنسداں بھی ہوئے ہیں۔ کلیسا سے اختلاف رائے کی بنیاد پر عظیم فلسفی سرویٹس کو جنوا میں زندہ جلا دیا گیا، اس کا جرم فقط یہ نظریہ تھا کہ حقیقی مسیحیت نیقیہ کی کونسل سے پہلے ہی مٹ چکی تھی:

"...the genuine doctrines of Christianity had been losteven before the time of the Council of Nicea."(2)

مظلوم اصحاب علم و دانش میں وہ ہستیاں بھی ہیں جن کے تحقیقی و سائنسی انکشافات پر آج یورپ کو ناز ہے، اور جنھیں جدید سائنس کی بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے، ان میں کوپرنیکس (Copernicus)، برونو (Giordano Bruno) اور گلیلیو (Galileo) جیسے نام سب سے نمایاں ہیں۔

کوپرنیکس (Copernicus)

کلیسا کا یہ ماننا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگاتا ہے، اگر کوئی فرد اس نظریہ کے خلاف جاتا تو اسے کافر اور مرتد قرار دیا جاتا، اس سختی کے باوجود ایک سائنسداں کوپرنیکس (Copernicus) نے کلیسا کے تصورات کو چیلنج کیا، اس نے ثابت کیا کہ سورج کائنات کا مرکز ہے اور زمین سال میں ایک مرتبہ اس کے گرد چکر لگاتی ہے، اس طرح اس نے کائنات سے متعلق جدید نظریات و تصورات کی بنیاد رکھی، اس موضوع پر "Revolutions of the Heavenly Bodies" (گردش اجرام فلکی) کے نام سے اس نے ایک کتاب بھی لکھی، تاہم اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کلیسائی افکار کی مخالفت کے نتیجہ میں اسے مورد عتاب بننا پڑے گا، اس لیے چھتیس سال تک اس نے کتاب کی اشاعت نہیں کی، آخر کار اس کے ایک دوست کے اصرار پر 1543ء یہ کتاب

(1-2) History Of Conflict Between Religion & Science, P.215-216

شائع ہوئی، لیکن اس کا نسخہ جب چھپ کر اس کے پاس پہنچا تو وہ بستر مرگ (Death Bed) پر پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا، پھر کتاب کا وہی حشر ہوا جس کا اسے ڈر تھا، انکویزیشن نے اسے ملحد قرار دیا اور اس "حکم امتناعی" نے جس کی رو سے اس کتاب کا پڑھنا جرم قرار دیا گیا تھا پرنیکس پر یہ حکم لگایا گیا:

"False Pythagorean doctrine utterly contrary to the Holy Scriptures."(1)

(باطل فیثا غورثی مذہب جو کتب مقدس کی ضد ہے)

کوپرنیکس 1473ء سے 1543ء تک زندہ رہا، چونکہ وہ کلیسا کا ایک ممبر بھی تھا اور اس کے چچا ایک بشپ تھے اس لیے خوش قسمتی سے وہ اپنے انقلابی اور ملحدانہ خیالات کے باجود کلیسا کے غضب سے محفوظ رہا۔ لیکن اس کے بعد ایسے خیالات رکھنے والے لوگ زیادہ خوش نصیب ثابت نہیں ہوئے۔

برونو (Bruno)

کوپرنیکس (Copernicus) کی وفات کے تقریباً سات سال بعد 1548ء کو ماہر فلسفیات جیورڈانو برونو (Giordano Bruno) پیدا ہوا، وہ اٹلی کا باشندہ، کوپرنیکس کے نظریات کا حامی اور فلسفہ و علم کلام میں ماہر تھا، ابتداء میں اس نے اپنی زندگی کلیسا کے لیے وقف کر رکھی تھی لیکن اسے کلیسا کے بعض عقائد سے اختلاف تھا جن میں عشائے ربانی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا انکار بھی شامل تھا، نیز وہ اس بات کا بھی قائل تھا:

"The Scriptures were never intended to teach science, but morals only."(2)

(کتب مقدس کا مقصد سائنس کی تعلیم ہرگز نہیں ہے بلکہ اس سے محض اخلاق کی ہدایت مقصود ہے)

فلکیات وطبیعیات کے سلسلہ میں وہ کلیسا کے نظریات کی سختی سے تردید کرتا تھا، اس کا کہنا تھا کہ کلیسا کا یہ نظریہ بالکل غلط اور ناقابل قبول ہے کہ زمین ایک سطح مستوی (Flat Surface) ہے جو ستونوں (Pillars) پر قائم ہے، اور آسمان ایک گنبد (Firmament) ہے جو فردوس کا صحن (Floor of Heaven) ہے۔

برونو کا کہنا تھا:

"We must believe that the universe is infinite, and that it is filled with self-lumnious and opaque worlds, many of them inhabited; that there is nothing above and around us but space and stars."(3)

(ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کائنات غیر محدود لامتناہی ہے، جو منیر و کثیف دنیاؤں سے معمور ہے، ان میں سے بہت سی

---

(1) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.168
(2) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.168
(3) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.169

آباد ہیں، اور ہمارے گردوپیش میں خلا اور تاروں کے سوا کچھ نہیں ہے)

برونو نے اپنے خیالات پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس لیے اسے بہت جلد پیشوایان کلیسا کا مورد عتاب ہونا پڑا، اور ان کے پنجۂ عقوبت سے بچنے کے لیے وہ تقریباً سترہ سال تک مختلف شہروں میں روپوش رہا:

"Discarding the garb of religion, he wandered through Italy, France, England and Germany."(1)

(مذہب کو ترک کرنے کے بعد وہ اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی میں بھٹکتا رہا)

اس پوری مدت میں وہ اپنے نظریات کی اشاعت کرتا رہا، وہ ارسطو کے نظریات کی مخالفت کرتا اور کوپرنیکس کی نظریات کی حمایت وتائید کرتا:

"Bruno became a fierce opponent of Aristotlian doctrines and a warm admirer of N.Copernicus."(2)

(برونو ارسطو نظریات کا سخت مخالف اور کوپرنیکس کا سرگرم حامی ہوگیا)

برونو مسلسل انکویزیشن کے کارندوں سے چھپتا رہا لیکن اس کے خونخوار کتے جن کی قوت شامہ بلا کی تیز تھی برابر اس کے پیچھے لگے رہے، آخر کار جب وہ اٹلی آیا تو انھوں نے اسے کھوج نکالا اور وینس (Venice) میں گرفتار کرلیا:

"Returning to Italy (1592), he was arrested by the Inquisition at Venice."(3)

(1592ء میں اٹلی واپس آتے ہوئے مقام وینس میں وہ انکویزیشن کے کارندوں کے ذریعہ گرفتار کیا گیا)

برونو کو گرفتار کرنے کے بعد جیل میں بند کردیا گیا جہاں وہ چھ سال تک اس سختی کے ساتھ قید رکھا گیا کہ نہ اسے لکھنے کے لیے کاغذ قلم دیا جاتا، نہ پڑھنے کے لیے کوئی کتاب دی جاتی اور نہ کسی دوست کو اس قید تنہائی میں گھڑی دو گھڑی کے لیے ملنے اور غم غلط کرنے کی اجازت تھی۔

پیشوایان مسیحیت کے مطالبہ پر برونو کو وینس سے روما منتقل کردیا گیا، اور اس الزام کی پاداش میں کہ وہ ملحد ہی نہیں بلکہ "ملحدوں کا سردار" (Heresiarch) ہے انکویزیشن کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا، دو سال سخت سزائیں کاٹنے کے بعد اسے محکمۂ احتساب کی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس نے اپنے نظریات وعقائد کا اعتراف کیا، اور پھر عدالت نے اس کے خلاف موت کی سزا سنادی۔

---

(1) History of Philosophy By William Turner P.429

(2) The Oxford dictionary of The Christian Church, P.203

(3) History of Philosophy By William Turner P.429

برونو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے دشمن گرچہ اس کے جسم کو فنا کر سکتے ہیں لیکن اس کے خیالات کو پھیلنے سے روک نہیں سکتے، چنانچہ اس نے احتساب کے ججوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"With more fear, perchance, do you pass sentence on me than I receive it."(1)

(یہ فیصلہ صادر کرتے وقت مجھ سے کہیں زیادہ تمہارے دلوں میں خوف طاری ہوا ہوگا)

16/فروری 1600ء کو عدالت کے ظالمانہ فیصلہ کی تعمیل ہوئی اور برونو کو سر عام کھمبے سے باندھ کر زندہ جلا دیا گیا۔

گلیلیو (Galileo)

1609ء میں فلارنس (Florence) کے ایک باشندہ نے یہ دریافت کیا کہ اگر بلور کے دو ٹکڑوں کو ایک خاص طریقہ پر باہم ملا کر ان میں دیکھا جائے تو دور کی چیزیں بڑی ہو کر صاف نظر آنے لگتی ہیں، اسی ایجاد کا نام "دوربین" (Telescope) ہے، اور وہ باشندہ گلیلیو گیلیلی (Galileo Galilei) تھا جو ریاضیات وطبعیات میں بھی شہرت رکھتا تھا، رفتہ رفتہ اس نے اپنی اس ایجاد کو ترقی دی یہاں تک کہ سب سے آخر میں اس نے جو دوربین بنائی اس میں چیزیں تیس گنا بڑی ہو کر نظر آتی تھیں، اپنی دوربین کے ذریعہ اس نے چاند کو اور قریب سے دیکھا، وہ ستارے بھی دیکھے جو مجرد آنکھوں کو نظر نہیں آسکتے تھے، پھر اس نے ایک خط مستقیم میں مشتری (Jupiter) اور اس کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے کئی ستارے دیکھے، جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کوپرنیکس (Copernicus) نے جو نظریہ پیش کیا تھا وہ بالکل درست ہے۔

1616ء میں کوپرنیکس کے نظریات کو قانونی طور پر بدعت والحاد قرار دے کر اس پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی، لیکن گلیلیو شروع سے ہی اس نظریہ کا حامی ومؤید تھا، پھر اس کی دلفریب دوربینی اکتشافات ودیگر تحقیقات نے باہم مل کر کوپرنیکس کے نظام کی صحت کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا، جس سے کلیسا کی تشویش واضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی اور کلیسائی نظام میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ بعض پادریوں نے کہا کہ دوربین کا تعلق اجسام ارضی سے ہے، اجرام سماوی میں دوربین کا کوئی اعتبار نہیں اور دوربین کے ذریعہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ محض نظر کا فریب ہے۔

گلیلیو نے دلائل کی بنیاد پر کھلے عام کوپرنیکس کے نظریات کی تائید وتوثیق کی، جس کی پاداش میں خود اس پر الحاد وبدعت کے الزامات عائد کیے گئے، جس کا دفاع کرتے ہوئے اس نے پادری کیس ٹیلی (Abbe Castelli) کے نام یہ خط تحریر کیا:

---

(1) A Short History of Free Thought, By J.M. Robertson, V. 2, P. 69

"The Scriptures were never intended to be a scientific authority, but only a moral guide."(1)

(کتب مقدسہ کے نزول کا مقصد علمی مسائل میں ان سے استناد نہیں ہے بلکہ انسان کی اخلاقی رہنمائی ہے)

مخالفت کی جو آگ پہلے سے بھڑک رہی تھی اس پر اس خط نے اور تیل ڈال دیا، محکمۂ احتساب نے گلیلیو کے خلاف وارنٹ جاری کر کے اسے پکڑ بلوایا، اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم اس اصول کی تعلیم دیتے ہو کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے جو کہ کتاب مقدس کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اپنے اس ملحدانہ عقیدہ سے توبہ کرے، کوپرنیکس کے اصول کی تردید کرے اور عوام کے سامنے اپنے گھٹنوں پر بیٹھ کر اپنی تحقیقات کو غلط قرار دے:

"The Holy Inquisition forced Galileo to recant his findings in physics and astronomical relationship."(2)

(مقدس انکویزیشن نے گلیلیو کو مجبور کیا کہ وہ طبیعیات اور اجرام فلکی سے متعلق اپنی تحقیقات کی تردید کرے)

گلیلیو انکویزیشن کی سزاؤں اور اپنی قوت تحمل سے اچھی طرح واقف تھا، چنانچہ اس نے انکویزیشن کے جابرانہ احکام کی تعمیل کا اقرار کر لیا اور وعدہ کیا کہ جو کچھ اس کو ہدایت کی گئی ہے اس پر عمل کرے گا، ساتھ ہی زیر لب اس نے بڑبڑاتے ہوئے یہ بھی کہا:

"He muttered under his breath 'It moves all the same' (meaning the earth)."(3)

(زیر لب وہ بڑبڑایا کہ یہ یعنی زمین گھومتی تو ہے ہی)

1623ء میں گلیلیو کا ایک دیرینہ دوست پوپ بن گیا تو اس نے 1616ء کے کوپرنیکس سے متعلق حکم کو منسوخ کرانے کی پوری کوشش کی، مگر اس میں وہ ناکام رہا، البتہ اسے ایک کتاب لکھنے کی اجازت مل گئی جس میں وہ ارسطو اور کوپرنیکس کے نظریات پر تقابلی بحث کر سکتا تھا لیکن اس میں بھی یہ دو شرطیں نافذ تھیں:

"He would not take sides and would come to the conclusion that man could in any case not determine how the world worked."(4)

(وہ کسی کی حمایت نہ کرے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کسی بھی طرح یہ تعین نہیں کر سکتا کہ دنیا کیسے کام کرتی ہے)

آخرش سولہ سال کی سخت کڑھن و برداشت کے بعد 1632ء میں اس کی کتاب مکمل ہوئی اور Dialogue Concerning the Two Chief World Systems (دو اہم عالمی نظاموں کے متعلق مکالمہ) نام سے شائع ہوئی۔

---

(1) History Of The Conflict Between Religion & Science. P.171
(2) The Church of Satan by Michael A. Aquino, P.515
(3) A Criminal History Of Mankind, P.234
(4) A Brief History of Time By Stephen Hawking, P.96

CamScanner

اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ انکویزیشن کے پیادے پھر حرکت میں آ گئے اور اس الزام میں کہ گلیلیو نے پھر سے آفتاب کے گرد زمین کی گردش کا دعوی کیا ہے اسے احتساب کی عدالت میں پیش کیا گیا، جہاں یہ فیصلہ سنایا گیا کہ گلیلیو کو کتاب لکھنے کی اجازت ضرور حاصل تھی لیکن اس کتاب میں اس نے 1616ء کے حکم کے خلاف ورزی کی ہے جو کہ کھلا ہوا بدعت (Heresy) ہے، لہٰذا بدعت کے نتیجہ میں گلیلیو کو ان تعزیرات کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے جو اس جرم کے ساتھ وابستہ ہیں، چنانچہ تحقیر آمیز سلوک کے بعد گلیلیو کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جہاں اس نے اپنی زندگی کے باقی دس سال طرح طرح کی عقوبتوں اور سختیوں میں گذار دیے اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کی لاش کو مسیحی قبرستان سے باہر دفنایا گیا۔

"He was denied burial in consecrated ground"(1)

(اسے مقدس قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا گیا)

کائنات میں کرۂ ارض کو جو حیثیت حاصل ہے اس کا اعتراف ایک طویل کشمکش کے بغیر نہ ہو سکا، کلیسا نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، اور اپنے نظریات کو برقرار رکھنے کی کوشش میں لوگوں کو سزائے موت تک دی، لیکن اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور کوپرنیکس کے نظریات کی تائید میں ناممکن التردید شہادتوں کے انبار لگ گئے، حتی کہ برونو کو اس کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا۔

گلیلیو کی آواز کو کلیسا نے اپنے زور سے دبا تو دیا لیکن اس کے انقلابی نظریات کو لمبے عرصے تک دبائے رکھنا ممکن نہ ہوا، اور تقریباً نصف ہزاریہ گذرنے کے بعد گلیلیو کے نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے نیوٹن (Isaac Newton) نے "کشش ثقل" (Gravitation) کے قوانین دریافت کیے، اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں عظیم سائنسداں آئن سٹائن نے (Albert Einstein) اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے "نظریۂ اضافت" (Theory of Relativity) سے دنیا کو متعارف کرایا۔

کتب خانوں کی تباہی

کلیسا نے اپنے نظریات کی حفاظت و اشاعت کے لیے جس تشدد کا استعمال کیا اس کا شکار وہ کتابیں بھی ہوئیں جن میں کلیسا کو بغاوت کی سیاہی نظر آئی، چنانچہ ایسی لاکھوں کتابیں اور بے شمار کتب خانے بے دردی کے ساتھ تباہ کر دیے گئے جن کو کلیسا کی جانب سے تائید حاصل نہیں تھی۔

کتابوں کی تباہی کا سلسلہ 325ء میں نیقیہ کی پہلی "شریعت ساز کونسل" کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا، کونسل نے آریوس (Arius) کے عقائد و نظریات کو باطل قرار دیا جس کے بعد اس کے بہتیرے حامیوں کو تشدد کا

---

(1) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.172

نشانہ بنایا گیا اور اس کے نظریات پر مبنی بے شمار کتابیں بھی نذر آتش کر دی گئیں۔

"Book burning was, of course, a traditional device used by Christians against their enemies. The Emperor Constantine used it against Arian works."(1)

(بلاشبہ دشمن کی کتابوں کو نذر آتش کرنا مسیحیت کا روایتی طریقہ رہا ہے، شہنشاہ قسطنطین نے آریوسی کے کاموں کے خلاف اس کا استعمال کیا تھا)

587ء کا اسپینی بادشاہ کلیسائے کیتھولک کے نظریات کا سختی سے پابند تھا، اس نے یہ حکم جاری کیا کہ آریوسی فکر کی تمام کتابیں جلا کر نذر آتش کر دی جائیں۔

"All Arian books should be collected and burned."(2)

قرون وسطی میں کتابیں چرمی جھلیوں پر لکھی جاتی تھیں، کلیسائی نمائندے انھیں کھرچ کر ان پر کلیسائی دعائیں اور اپنے بزرگوں کی داستانیں لکھ دیا کرتے تھے، اور جہاں ممکن نہ ہوتا وہاں کتابوں کو جلا کر تلف کر دیا کرتے تھے۔

کلیسا نے اپنے دور اقتدار میں کتابوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تعصب و دشمنی کا مظاہرہ کیا، اس نے ہر اس کتاب کو نذر آتش کر دیا جو مسیحی افکار و نظریات کے موافق نہ تھیں، چنانچہ قرون وسطی کا انکویزیشن اسی روش پر قائم رہا اور خاص کر سولہویں صدی کے اٹلی میں کتابوں کو نذر آتش کرنا ایک عام سی بات ہو گئی:

"The medieval Inquisition followed suit, and in the sixteenth century it was a common practice in Italy."(3)

محکمۂ احتساب کے قیام کے بعد بدعتیوں اور ان کی کتابوں کو جلانا ایک عام چلن تھا، اور یہ عقیدہ بھی تھا کہ جلانے کے بعد کلیسا مخالف افکار و نظریات ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے، اور معاشرہ کی فضا بھی اس سے پاک ہو جائے گی:

"In mid-century the Spaniards probably resorted to burning because it seemed the simplest way to get rid of offending material."(4)

(قرون وسطی میں اسپین نے عمومی طور پر آتش زنی کے طریقہ کو اختیار کر رکھا تھا، کیونکہ مخالف مواد سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہی ایک آسان سا راستہ سمجھا جاتا تھا)

---

(1) The Spanish Inquisition-A Historical Revision By Henry Kamen, P.104
(2) The History of the Decline and Fall of Roman Empire, P. 1776
(3) The Spanish Inquisition-A Historical Revision, P.1035-1036
(4) The Spanish Inquisition by Henry Kamen, P.1035-1036

CamScanner

اسی نظریہ کی بنیاد پر کتابوں کو عوامی جگہوں پر جلایا جاتا تھا تا کہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسے ہر طرح کے نظریات سے خود کو محفوظ رکھیں:

(1522ء میں انکویزیشن نے حکم دیا کہ ملحدانہ کتابوں کو عوامی جگہوں پر جلایا جائے)

"From March 1552 the Inquisition ordered that heretical books be burnt publicly."(1)

کتابوں کو جلانے میں کلیسا نے نہایت سختی کا مظاہرہ کیا، اس نے ہر اس کتاب کو آگ میں جلوادیا جو اس کی نظر میں "ملحدانہ" تھی، پھر اس کے لکھنے والے کا تعلق خواہ یہودیت و مسیحیت سے رہا ہو یا مذہب اسلام سے چنانچہ:

"In 1248 the clergy in Paris burned fourteen cartloads of Jewish books."(2)

(1248ء میں پیرس کے کلیسا نے یہودیوں کی چودہ بگھی کتابیں نذر آتش کر دیں)

"France (thousands of Protestant books were thrown to the flames in the city of Lyon in 1565) and England."(3)

(1565ء میں فرانس کے شہر لیون اور انگلینڈ میں کلیسا مخالفین (پروٹسٹنٹ) کی ہزاروں کتابیں آگ میں جھونک دی گئیں)

"A royal decree of October 1501 ordered Arabic books to be burnt in Granada."(4)

(1501ء میں شاہی فرمان نافذ ہوا کہ غرناطہ میں عربی کی ساری کتابیں جلادی جائیں)

قرون وسطیٰ میں چھاپہ خانوں کی ایجاد (Invention of Printing) نے کلیسا کے لیے سخت خطرات پیدا کر دیے، جن کے سامنے انکویزیشن کے مظالم بھی کچھ کارگر نہ تھے، چنانچہ 1559ء میں پوپ پال چہارم (Pope Paul IV) کے حکم سے انکویزیشن کی ماتحتی میں "کیتھولک کلیسائی قانون" (Catholic Canon Law) کے مطابق ایک شعبہ کتابوں کی نگرانی (Censor) کے لیے قائم ہوا، یہ شعبہ کتابوں اور قابل اشاعت مواد کی جانچ پڑتال کر کے یہ فیصلہ کرتا تھا کہ عوام کو ان کے مطالعہ کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

"Its duty is to examine books and manuscripts intended for publication, and to decide whether the people may be permitted to read them...."(5)

کلیسا کے مطابق حکم "Index Libriorum Prohibitorum" کے نام سے ممنوعہ کتابوں کی فہرست (List of Prohibited Books) جاری ہوتی تھی، اس فہرست میں اول اول ان کتابوں کے نام درج تھے جن

(1-3)The Spanish Inquisition by Henry Kamen, P.1035-1036

(4)The Spanish Inquisition by Henry Kamen, P.1035-1036

(5) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.216

CamScanner

کا مطالعہ ناجائز تھا مثلاً گلیلیو (Galileo)، برونو (Bruno) کیپلر (Kepler) نیوٹن (Newton) کینٹ (Kent) وغیرہ، لیکن جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ہر اس کتاب کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا گیا جس کو کلیسا کی طرف صریح اجازت نامہ (License) حاصل نہ ہو۔

چنانچہ کلیسائی اقتدار میں کسی بھی کتاب کو شائع ہونے سے قبل مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا تھا، سب سے پہلے انکوزیشن کا محکمہ کتاب کی پڑتال کرتا اور اطمینان ہونے کے بعد اس پر "Nihil Obstat" (Nothing Forbids) (ناقابل اعتراض) کی مہر لگاتا تھا، اس کے بعد علاقائی انتظامیہ (Local Ordinary) کی جانب سے "Imprimatur" (Let it be Printed) (اجازت اشاعت) کی مہر لگائی جاتی تھی، پھر اخیر میں "Religious Institutes" (مذہبی ادارے) کی طرف سے "Imprimi Potest" (It Can be Printed) (قابل اشاعت) کی مہر لگتی تھی اور کتاب چھپنے کے لیے پریس (Press) جاتی تھی۔ (1)

اس تنگ نظر و متعصبانہ حکم کا مقصد یہ تھا کہ جن علوم کو کلیسا کی سرپرستی حاصل ہے ان کے سوا کوئی بھی معلومات عوام تک پہنچنے نہ پائے، اس سلسلہ میں کیتھولک اور آرتھوڈکس دونوں کلیسا یکساں تھے، البتہ کیتھولک کلیسا کو شاہی اقتدار بھی حاصل تھا جس کی بنیاد پر اس نے اپنے علاقوں میں جبر اور سختی کے ساتھ اس حکم پر عمل درآمد کرایا۔

کتب خانہ اسکندریہ

(پانچویں صدی تک کے یونانی-رومی شہروں کے وہ کتب خانے جو سرمایہ نوع انسان تھے، جن میں سائنس، فلسفہ، اور تاریخ کے موضوعات پر ایک لاکھ سے لے کر سات لاکھ تک کی کتابیں تھیں، ان کتب خانوں کو مسیحیوں نے تباہ کر دیا، ان میں سب سے بڑا کتب خانہ اسکندریہ کا تھا)

"Libraries from 100,000 to 700,000 books existed in the Greco-Roman cities until the fifth century preserving all that the race had won in science, philosphy, and history. They were all destroyed by the Christian. The largest of them all, that of Alexandria.(2)

سکندر اعظم کے بعد بطلیموس سوطر (Ptolemy Soter) مصر کا حکمراں ہوا، وہ ذاتی طور پر ایک علم دوست انسان تھا، اس کے حکم سے اسکندریہ میں ایک کتب خانہ (Library of Alexandria) کی بنیاد ڈالی گئی جس میں یونانی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کے تراجم کا بھی ذخیرہ تھا جو اسکندر کے حملۂ فارس کے وقت یونانیوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں، 285 ق م میں اس کی موت کے بعد اس کا جانشین بطلیموس فیلاڈلفس (Ptolemy

---

(1) The Code of Canon Law, p.122(Canon 827/3 & Canon 830/3)

(2) Social Record of Christianity, P.32

Philadelphus) ہوا جس نے اس کتب خانہ کا حد سے زیادہ اہتمام کیا، اس کے بعد دیگر شاہان بطلیموس بھی اس میں برابر اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ لائبریری دنیا کی سب سے بڑی لائبریری بن گئی جس میں کتابوں کی تعداد ''انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا'' کے مطابق سات لاکھ تھی:

".....became at last the finest library in the world containing no fewer than 700,000 volumes."(1)

(آخر کار وہ دنیا کی سب سے شاندار لائبریری بن گئی، جس میں سات لاکھ جلدوں سے کم کتابیں نہیں تھیں)

دراصل اسکندریہ کا کتب خانہ ایک عظیم عجائب گھر (Meseum) کا حصہ تھا، ابتداءً اس کتب خانہ میں چار لاکھ (400,000) کتابیں تھیں، جب کتابوں کی تعداد بڑھتی گئی تو اس سے متصل ایک اور حصہ لائبریری کے لیے مختص کر دیا گیا جسے کتب خانہ کی ''بہن'' (Daughter) کہا جاتا تھا، جس میں تین لاکھ (300,000) کتابیں تھیں، اس طرح یہ کتب خانہ تقریباً سات لاکھ (700,000) کتابوں پر مشتمل تھا۔ (2)

کم وبیش سات صدیوں تک قائم رہنے والے اس کتب خانہ کا انجام نہایت ہی افسوس ناک ہوا، اس کی پہلی مرتبہ تباہی 47 ق م میں جولیس سیزر (Julius Caesar) کے ہاتھ سے ہوئی جب اس نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا اور غلبہ کے حصول کے لیے وہاں آگ لگا دی جس میں اس کتب خانہ کا مرکزی حصہ جل کر راکھ ہو گیا، جس میں تقریباً چار لاکھ کتابیں تھیں، اس کے بعد بطلیموسی خاندان کی آخری شہزادی کلیوپیٹرا (Cleopatra) نے دو لاکھ (200,000) کتابیں اس کتب خانہ میں شامل کرادیں جو مارک اینٹونی (Mark Antony) نے ہدیۃً دی تھیں، جس سے کتب خانہ اسکندریہ دوبارہ آباد ہو گیا۔ (۳)

اسکندریہ کے اُس دور میں اکثر کتب خانوں کے ساتھ مندر بھی ہوا کرتے تھے، چنانچہ اس عظیم کتب خانہ کے ساتھ بھی ایک مندر تھا، تیسری صدی میں جب مسیحیت کو غلبہ حاصل ہوا تو 391ء میں شہنشاہ تھیوڈسیس (Theodosius) کے حکم سے مملکت کے سبھی مندروں کو مسمار کر دیا گیا جس میں وہ کتب خانہ کو بھی تباہ ہو گیا۔

"In 391 CE however, the Roman Emperor Theodosius I made Christianity the official state religion of the Roman Empire and ordered the closure of all pagan temples."(4)

(391ء میں رومی شہنشاہ تھیوڈسیس اول نے مسیحیت کو رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا اور مشرکوں کے سبھی

(1-2) Encyclopaedia of Britannica, V.1, P.593

(3) Encyclopaedia of Britannica, V.1, p.593

(4) Ancient Alexandria, By Carole Escoffey, P.21

مندروں کو ختم کرنے کا حکم دیا)

چنانچہ شاہی حکم کے بموجب اسکندریہ کا ایک متعصب وسخت گیر بشپ تھیافلیس (Theophilus) نے اس عمارت کے ساتھ کتاب خانہ بھی برباد کر دیا:

"....led on by the Archbishop Theophilus stormed and destroyed the temple, together." (1)

(بشپ تھیافلیس کی قیادت میں مندر کو پوری طرح تباہ و برباد کر دیا گیا)

(اس طرح وہ عظیم الشان کتب خانہ جو تاجداران سلسلۂ بطلیموسیہ نے جمع کیا تھا، اور جو سیزر کی آتش زنی سے بچ رہا تھا، اس جاہل و متعصب (پادری) کے ہاتھوں برباد ہو گیا)

"....the great library, which had been collected by the Ptolemies, and had escaped the fire of Julius Caesar, was by that fanatic dispersed." (2)

پادریوں کے ہاتھوں اس عظیم الشان کتب خانہ کی تباہی مسیحیت کے دامن پہ ایک ایسا سیاہ داغ ہے جو صدیوں تک یورپ کے دور ظلمات میں نگاہوں سے پوشیدہ رہا، لیکن جب "جدید روشنی" میں وہ داغ نمایاں ہوا تو مغربی مفکرین نے اس کو دھونے کی کوشش کی اور اپنے دامن کی سیاہی کو مسلمانوں کی روشن تاریخ پر ملنے کی ناکام سازش رچی، جس کا نتیجہ ہے کہ "انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا" کا مقالہ نگار یہ رقم کرتا ہے:

"Towards the middle of sixth century, Amrou Ebn al Aas, Omar's general, took it by strom, after a siege of 14 months, and with loss of 23,000 men "(3)

(چھٹی صدی کے دوران حضرت عمرؓ کے سپہ سالار عمرو ابن العاصؓ نے چودہ دن کے محاصرہ اور تیئیس ہزار افراد کی ہلاکت کے بعد اسے تاراج کر دیا)

وہ مزید یہ بھی لکھتا ہے:

" they were distributed among the public baths, where for the space of six months, they served to supply the fires of those places, of which there was an incredible number in Alexandria " (4)

(ان کتابوں کو عوامی حماموں میں تقسیم کر دیا گیا جو اسکندریہ میں بہت کثرت سے تھے، ان کتابوں کی چھ مہینے تک یہ خدمت تھی کہ وہ آگ کے لیے رسد تیار رکھیں)

حالانکہ یہی مقالہ نگار ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

---

(1) Chambers's Encyclopaedia, P.151 (Alexandria)

(2) History Of The Conflict Between Religion & Science. P.54

(3) Encyclopaedia of Britannica, V.1, P.594

(4) Encyclopaedia of Britannica, V.1, P 594

"These institutions survived until; the main museum and library were destroy.ed during the civil war of 3rd century AD; a subsidiary library was burned by Christians in AD 391."(1)

(یہ ادارے قائم رہے حتی کہ اس کا مرکزی عجائب گھر اور اس کا کتب خانہ بھی تیسری صدی کی طوائف الملوکی میں تباہ ہوگیا، 391ء میں اضافی کتب خانہ بھی مسیحیوں کے ہاتھوں جل کر راکھ ہوگیا)

انسائیکلو پیڈیا کی یہ تضاد بیانی خود اس بات کی گواہ ہے کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور یہ منجملہ ان الزامات میں سے ہے جو یورپ نے مسلمانوں پر لگائے ہیں، اور اس الزام تراشی کا اعتراف خود مغربی مفکرین نے بھی کیا ہے، چنانچہ مشہور مؤرخ مسٹر فلپ کے ہٹی رقم طراز ہے:

"At the time of the Arab conquest, therefore, no library of importance existed in Alexandria and no contemporary writer ever brought the charge against 'Amr or 'Umar."(2)

(عربوں کی فتوحات کے وقت کوئی بھی قابل ذکر کتب خانہ اسکندریہ میں موجود نہیں تھا، اور کوئی بھی معاصر قلم کار عمرؓ و یا عمرؓ پر الزام نہیں رکھ سکتا)

دوسری شہادت ملاحظہ ہو:

"For the story that this library was burned three centuries later by the Arabs is a very late and now discredited fiction."(3)

(رہی بات اس کہانی کی کہ لائبریری کو تین صدی بعد عربوں نے نذر آتش کر دیا تھا تو یہ بہت بعد کی داستان ہے جو کہ مسترد کی جا چکی ہے)

چیمبرس انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار عربوں پر اس الزام کو "ایک قدیم بیہودہ کہانی" (A ridiculous although ancient story) سے تعبیر کرتا ہے، پھر اس کے بعد کہتا ہے:

"The historian Orosius, who visited the place after the destruction of the temple by the Christians relates that he then saw only the empty shelves of the library."(4)

(مؤرخ اوروسیس جس نے مسیحیوں کے ذریعہ مندر کی تباہی کے بعد اس جگہ کا معاینہ کیا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے وہاں پر فقط کتب خانہ کے خالی خانوں کو دیکھا)

"تاریخ انحطاط وزوال سلطنت روما" کا مشہور مصنف مسٹر گبن لکھتا ہے:

---

(1) Encyclopaedia of Britannica, V.1, P.594

(2) History of the Arabs by Philip K. Hitti, P.166

(3) Social Record of Christianity, P.32

(4) Chamber's Encyclopaedia, P.131 (Alexandria)

"The valuable library of Alexandria was pillaged or destroyed; and near twenty years afterwards, the appearance of the empty shelves excited the regret and indignation of every spectator, whose mind was not totally darkened by religious prejudice."(1)

(اسکندریہ کا بیش قیمت کتب خانہ تباہ و برباد کر دیا گیا، اور تقریباً بیس سال بعد اس کے خالی خانے اپنے ان زائرین کو تاسف و شرمندگی کا احساس دلاتے تھے جن کے ذہن مذہبی تعصب کی بنا پر پوری طرح تاریک نہیں ہوئے تھے)

ڈاکٹر گستاؤلی بان (مصنف تمدن عرب) لکھتا ہے:

''کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمرؓ پر لگایا جاتا ہے، اس کی نسبت میں یہی کہوں گا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع و اطوار کے اس قدر خلاف تھا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہمل کہانی رائج رہے اور قبول کی جائے، ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہوگئی ہے کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت ہی صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے کہ عربوں سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتب خانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کر دیا تھا جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے ان کی مورتیاں توڑ ڈالی تھیں، اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہیں تھیں جو جلائی جاتیں۔''(۲)

اسلام کی نظر میں سب سے گندی چیز شرک ہے پھر بھی وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مفتوحہ قوم کے بت خانوں کو مسمار کیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے متبعین اس عظیم تاریخی و قومی سرمایہ کو برباد کر دیں جو خود ان کے لیے بھی قیمتی سوغات تھا؟!

اس موضوع پر علامہ شبلی نعمانیؒ مستند مؤرخ ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''جب یہ مسلّم ہے کہ اسکندریہ والے ذمی قرار دیے گئے، اور ذمیوں کے ساتھ جو کچھ حضرت عمرؓ کا طرز عمل تھا وہ تفصیلاً معلوم ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اسکندریہ والوں کی ایک بڑی یادگار (کتب خانہ) کو اس بے رحمی سے برباد کیا جاتا؟ کیا یہ کتب خانہ مسلمانوں کو گرجاؤں اور آتشکدوں سے زیادہ ناگوار ہوسکتا تھا؟ تمام ممالک مفتوحہ میں جب سیکڑوں ہزاروں گرجے اور آتشکدے قائم رکھے گئے اور ان کی حفاظت کے لیے تمام فرامین میں یہ خاص الفاظ لکھے گئے: "لایهدم لهم بیعة ولا کنیسة، داخل المدینة ولا خارجها" (یعنی کوئی گرجا اور عبادت گاہ ڈھایا نہ جائے گا، نہ شہر کے اندر اور نہ باہر) تو کتب خانہ کی نسبت ایسا ظالمانہ برتاؤ کیونکر قیاس میں آسکتا ہے۔''(۳)

ردِ عمل

کلیسا کے عمومی مظالم نے مغربی معاشرہ کے ہر طبقہ کو بے چین کر دیا، دلوں میں بغض و عداوت کے ساتھ

---

(1) The Decline and Fall of The Roman Empire, V.3, P.60

(۲) اسلام اور مستشرقین: جلد پنجم۔ صفحہ: ۱۰/ علامہ سید سلیمان ندویؒ

(۳) کتب خانۂ اسکندریہ از علامہ شبلی نعمانیؒ/ ۳۹-۴۰

ساتھ مزاج میں بغاوت کا عنصر بھی پنپنے لگا، جو بالآخر ایک عظیم انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا جسے ''یورپ کی نشاۃ ثانیہ'' (Renaissance) کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ اہل علم وارباب دانش اور مذہب بیزاروں نے مسیحیت کو کلیتاً مسترد کر دیا، اور ہر اس دعوی کی تکذیب کر دی جس کی مجربہ مشاہدہ کے ذریعہ تصدیق نہ کی جاسکتی ہو، یوں مادی مظاہر کے سوا ہر وجود کو رد کر دیا گیا، اور یہیں سے مذہب وسیاست کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

تعلیم وحکمت سے بے نیازی، توہم پرستی، علماء کی ناقدری، عیش پسندی اور سنگین مظالم نے مل جل کر ایسے حالات پیدا کیے کہ کلیسا کے انتہائی عروج کے طویل دور میں بھی مسیحیت' نہ یونانی وروی تہذیب کی حفاظت کر سکی اور نہ دنیا کو تمدن کی نئی راہیں دکھلا سکی، بلکہ آج جدید دنیا یورپ کے پاس تہذیب وتمدن اور علم ودانش کے نام پر جو کچھ بھی ہے وہ مسیحیت کا نتیجہ اور اس کا فیضان نہیں ہے بلکہ وہ مسیحیت سے فرار اور کلیسا کے خلاف بغاوت کی پیداوار ہے!

CamScanner

یورپ کی نشأۃ ثانیہ
(Renaissance)

چودھویں صدی مسیحی سے سولھویں صدی مسیحی تک کا زمانہ یورپ کی "نشاۃ ثانیہ" (Renaissance) کی تحریک کا زمانہ ہے، یہ تحریک کلیسا میں رائج بعض بدعات، مذہبی مناصب کا بے جا استعمال، اور ارباب کلیسا کی عام اخلاقی تنزلی کے خلاف تھی، انقلابی نوعیت کی اتنی بڑی تحریک اور اس کی کامیابی کی وجوہات کا کوئی ایک سبب نہیں پیش کیا جاسکتا، البتہ انصاف پسند محققین کے نزدیک یہ تحریک بڑی حد تک مسلمان اور اسلامی تعلیمات کی مرہون منت ہے، یورپ نے اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی ثقافت سے بھرپور استفادہ کیا، اس کے بعد ہی "نشاۃ ثانیہ" کے نوک پلک درست کیے جاسکے، اسی بنیاد پر اسے "تحریک احیائے علوم" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

یورپ پر اسلام کے اثرات

قرون وسطی میں جب یورپ جہالت وتاریکی کے دور سے گذر رہا تھا اسلامی ریاستیں تہذیب وتمدن کی اعلیٰ مثالیں قائم کررہی تھیں، زندگی کے ہر شعبہ پر اسلام کے گہرے اثرات مرتب ہورہے تھے، ایک طرف علوم وفنون کی نئی نئی راہیں کھل رہی تھیں تو دوسری طرف ایمانیات واخلاقیات کے نئے نئے مظاہر بھی سامنے آرہے تھے، لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں میں انقلاب پیدا ہونے لگا، اور انسانی معاشرہ پر مادیت کے پڑے ہوئے دبیز پردے چاک ہونے لگے، مغربی اقوام کا واسطہ جب مسلمانوں سے پڑا تو اس نے اسلام کے وسیع اثرات اور اس کے احسانات کو کھلے دل سے قبول کیا اور اسی کی رہنمائی میں اپنی زندگی کا زاویہ درست کیا۔

چنانچہ انگریز مؤرخ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:

".....there is not a single aspect of European growth in which the decisive of Islamic culture is not tracable."(1)

(یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں جنھوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا)

---

(1) The Making of Humanity, P.190

معروف انگریز مؤرخ جارج سارٹن (George Sarton) لکھتا ہے:

"The essential task of those days was almost entirely accomplished by muslims. Just think of these men; Ibn Yunus Ibn Al-Hathim, Al-Karkhi, Al-Bairuni, Ibn Isa, Ibn Hazm. They were the real leaders, and all were muslims. The greatest writer of the age, and one of the greatest of all ages, one of the chief interpreters of humanity was a persian, Firdausi. The most prominent scintists and philosphers next to these were Jews; Ibn Gabirol and Ibn Janah, this is not surprizing, for the Jews were steeped an Arabic and were influenced by Muslim culture in every respect, except religion"(1)

(اس زمانہ میں (پندرھویں صدی عیسوی) علوم فنون کا تقریباً سارا بنیادی کام مسلمانوں نے انجام دیا ہے، آپ ان ناموں پر غور کریں؛ ابن یونس، ابن الہیثم، الکرخی، البیرونی، ابن سینا، عمار موصلی، علی ابن عیسیٰ، ابن حزم دنیا میں یہی لوگ حقیقی مشعل بردار تھے اور سب کے سب مسلمان تھے، اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر فردوسی تھے، جو تاریخ عالم کے عظیم ترین شاعروں اور انسانیت کے ممتاز ترجمانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد سب سے ممتاز سائنسداں اور فلسفی ابن جبرئیل اور ابن جنہ یہودی تھے لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، یہ لوگ عربی زبان میں ماہر تھے، اور مذہب کے سوا ہر چیز میں مسلم تہذیب کے زیر اثر تھے۔)

ڈریپر مسلمانوں کی فکر سلیم اور دماغی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Sometimes, not without surprise, we meet with ideas which we flatter ourselves have originated in our owntimes. thus our modern doctrines of evoulution and development were taught in their schools. In fact they carried them much farther than we are desposed to do, extending them even to in organicor mineral things."(2)

(بعض اوقات ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ہمارا سابقہ ایسے افکار سے پڑتا ہے جنھیں ہم اپنے زمانے کا انکشاف سمجھ کر خوش ہوتے ہیں، جیسے ارتقاء اور ترقی کے اصول کو لیجیے، انہیں ہم جدید انکشاف سمجھتے ہیں، یہ نظریے مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے، حقیقت میں انھوں (مسلمانوں) نے اصولوں کا دائرہ غیر عضویاتی چیزوں یا معدنیات تک وسیع کر کے اسے بہت آگے بڑھایا جس معنی میں اسے ہم لیتے ہیں۔)

شہنشاہ انگلینڈ جارج دوم کا یہ خط اسلامی تہذیب وتمدن کے عروج اور اس کے وسیع وعمیق اثرات کی کھلی ہوئی مثال ہے، ملاحظہ ہو:

---

(1) Introduction of the History of Science, V.I, P.701

(2) History of the confilict between Religion and Science P.116

إلىٰ صاحب العظمة –خليفة المسلمين– هشام الثالث الجليل المقام!

من جورج الثانی ملك انجلترا و السويد والنرويج إلى الخليفة ملك المسلمين فی مملكة الأندلس صاحب العظمة هشام الثالث الجليل المقام۔

بعد التعظيم و التوقير نفيدكم أننا سمعنا عن الرُّقی العظيم الذی تتمتع بفيضه الصافی معاهد العلم و الصناعات فی بلادكم العامرة فأردنا لأبنائنا اقتباس نماذج من هذه الفضائل لتكون بداية حسنة فی اقتفاء أثركم لنشر أنوار العلم فی بلادنا التی يحيط بها الجهل من أركانها الأربعة ۔۔

الإمضاء:

من خادمكم المطيع /جورج الثانی (۱)

(خلیفۃ المسلمین فرماں روائے اندلس ہشام سوم کے نام

جارج دوم شاہ انگلینڈ، سویڈن و ناروے کی جانب سے مسلم حکمراں شہنشاہ اندلس عظیم المرتبت جلیل القدر ہشام سوم کی خدمت میں۔

آداب وتسلیمات کے بعد عالی جناب کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم نے آپ کی عظیم ترقیات کے بارے میں سنا جس کے چشمۂ صافی نے آپ کے شاداب ملک کے علمی اداروں اور کارخانوں کو سیراب کر رکھا ہے۔ ہماری بھی تمنا ہے کہ ہماری مملکت کے لوگ آپ کے ان فضائل وکمالات سے کچھ اخذ کر سکیں، تاکہ آپ ہی کے نقش قدم پر چل کر ہمارا بہتر آغاز ہو، اور ہمارے ملک میں جس کو جہالت کی تاریکی نے ہر چہار جانب سے گھیر رکھا ہے علم کی کچھ روشنی پھیل کے.....)

دستخط

آپ کا فرماں بردار خادم/ جارج دوم

تحریک اصلاح مذہب (Reformation)

صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کی اقوام کو پہلی مرتبہ اسلامی ممالک میں ایک متمدن تہذیب کا سامنا پڑا، اسپین کے یہودی اور عیسائی دانشوروں کے ذریعہ مسلمان فلسفیوں کے لاطینی تراجم نے یورپ کی خانقاہوں اور اسکولوں کو یونانی علم وحکمت سے روشناس کرایا، رومی تہذیب وثقافت، علم وحکمت، عقلیت ودانشوری کے جس سرمایہ کو پانچویں صدی میں وحشی قبائل نے غارت کر دیا تھا اسی تمدنی وفکری سرمایہ کو عرب اور اسلامی واسطہ سے پاکر یورپ کی ذہنی وروحانی قحط سالی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، مغربی عوام وخواص میں اعلیٰ تہذیبی وثقافتی ذوق پیدا ہوا، مسیحی علماء یونانی

---

(۱) کتاب الاستذکار لابن عبدالبر، المجلد الأول۔ ص ۱۳

وعربی علوم کے شیدائی بن گئے جس کے نتیجہ میں ذہنی وفکری تشنج شروع ہوا، اور روایتی مذہب اور عقلیت کے درمیان ایک طویل کشمکش کا آغاز ہوا۔

چنانچہ کلیسا کی مذہبی اجارہ داری اور سیاسی حکمرانی کے نتیجہ میں جب پاپائیت کی بدعنوانیاں عروج پر پہنچ گئیں، اور مغربی معاشرہ ارباب کلیسا سے ناراض، اس کے سلوک سے نالاں اور اس کی تعلیمات سے گریزاں ہونے لگا تو بہت سے حقیقت پسند مصلحین اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی اپنی بساط بھر کلیسا اور مسیحیت کی اصلاح (Reformation) کی کوششیں کیں، بالآخران کی اصلاحی کوششوں نے یورپ میں عمومی بیداری کا ایک عام رجحان پیدا کر دیا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس بیداری نے یورپ کو کلیسائی کی غلامی سے آزاد کرا کر نفس کی غلامی میں قید کر دیا، مذہب کی بندشیں اگرچہ ختم ہوئیں لیکن مادیت کے رسوں نے ہر چہار جانب سے جکڑ لیا اور مغربی معاشرہ حقیقی آزدی سے محروم ہی رہا۔ تحریک بیداری کے ابتدائی رہنماؤں و نامور مصلحین میں جان وکلف (John Wycliff) پھر جان ہس (John Huss) اور پھر جیروم (Jerome) کے نام خاصے مشہور ہیں۔

جان وکلف

آکسفورڈ یونیورسٹی اُن دنوں برطانیہ کا ذہنی اور روحانی مرکز تھا، اس سے ایسے مفکر و دانشور نکلے جنھوں نے کلیسا کی ناانصافیوں کو دین مسیح کے خلاف قرار دیا، اور پادریوں کے من مانی فرامین کو مسیحی معاشرہ پر کھلا ہوا ظلم قرار دیا، ان دانشوروں میں سب سے ممتاز جان وکلف (1324-1384ء) تھا، جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض پر مامور تھا، وہ نیک اور پرہیزگار پاپاؤں کے انتخاب کا داعی تھا، اسی نے سب سے پہلے بائبل کو انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، حالانکہ اس سے قبل بائبل کا کسی زبان میں ترجمہ کرنا ایک سنگین جرم سمجھا جاتا تھا، اس نے ارباب کلیسا پر کھل کر تنقید کی، خاص کر اعتراف گناہ اور کفارہ کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا:

> *"He fearlessly and successfully exposed the wicked and unchristian pretensions of the popes and prelates, and the extreme corruption of the Romish church."(1)*
>
> (اس نے جرأت اور کامیابی کے ساتھ پاپاؤں اور پادریوں کے باطل وغیر مسیحی نظریات اور رومی کلیسا کی لامتناہی بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا)

جان وکلف کو اس "کافرانہ گستاخی" کی پاداش میں کئی بار نظر بند کیا گیا، برادری سے خارج کر کے تعلیمی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش کیا گیا، اور پھر اس کی موت کے تیرہ سال بعد یہ فیصلہ صادر ہوا کہ اس کی قبر کو کھود کر اس کی لاش نذر آتش کر دی جائے:

---

(1) A History of The Church by Henry C. Wickersham, P. 179

"Wycliffe was safely dead, but the council ordered his bones dug up and burnt."(1)

(وکلف سلامتی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا لیکن کونسل نے حکم دیا کہ اس کی ہڈیوں کو نکالا جائے اور نذر آتش کر دیا جائے)

"....the writings and bones of Wycliffe were ordered to be burned."(2)

(وکلف کی تحریروں اور اس کی ہڈیوں کو سپرد آگ کرنے کا حکم دیا گیا)

جان وکلف کے نظریات اور اس کی تحریک سے ایک بڑی تعداد متاثر اور اس کی ہمنوا تھی جنھیں "وکلفی" (Wycliffism) کہا جاتا تھا، اس کے ان ہمنواؤں میں جان ہس (John Hus) اور جیروم (Jerome) کے نام اس طور پر نمایاں ہیں کہ انھیں کلیسا کی جانب سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر وہ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

پاپائی نفاق کا خاتمہ

یہ وہ دور تھا جب کلیسا اور حکومت کے تعلقات ناگفتہ بہ تھے، رومن کلیسا لمبے عرصہ سے "پاپائی نفاق" (Papal Schism) کا شکار تھا، یعنی بیک وقت دو پوپ منتخب ہوتے تھے، ایک پوپ حکومت کی طرف سے نامزد کیا جاتا تو دوسرا پوپ کلیسا کی طرف سے متعین ہوتا، بالآخر وکلف اور جان ہس کی اصلاحی کوششوں کے نتیجہ میں کلیسا میں جاری اس اختلاف کو ختم کرنے کی فکر پیدا ہوئی اور 1409ء کو کونسل آف پیسا (Council of Pisa) منعقد کی گئی جس میں تقریباً 80 بشپ شریک ہوئے، کونسل نے دونوں پاپاؤں کو معزول قرار دے کر الیگزینڈر پنجم (Alexander V) کو پوپ منتخب کر لیا، لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور بہت جلد ہی وہ مر گیا، اس کے بعد کارڈینل کوسا (Cossa) کو پوپ منتخب کیا گیا جو جان بست دسوم (John XXIII) کے نام سے مشہور ہوا:

"They declared both Popes deposed and elected a new one, who died almost immediately. Then they elected another one Cardinal Cossa who took the name of John XXIII."(3)

مگر وہ اپنے معاصر پاپاؤں کو زیر کرنے میں ناکام رہا، نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسا میں دو کے بجائے تین پوپ ہو گئے، اور کلیسا کے افتراق میں مزید شدت پیدا ہو گئی:

---

(1) A History Of Western Philosophy Bertrand Russell, P.483

(2) History of The Church, P.182

(3) A Short History of Our Religion by D.C Somervell, P.201

"So there were now three Popes instead of two, and one of them was "Barabbas" (1)

اگرچہ کونسل آف پیسا "پاپائی نفاق" کو ختم کرنے میں ناکام رہی لیکن اتحاد کی کوششیں جاری رہیں چنانچہ نومبر 1414ء کو کانسٹنس (Constance) کے مقام پر ایک اور کونسل بلائی گئی، یہ کونسل اس اعتبار سے کامیاب رہی کہ اس نے "پاپائی نفاق" کا خاتمہ کر دیا، لیکن اسی کونسل میں جان ہس اور اس کے شاگرد جیروم کو حاضر ہونے کا حکم دیا گیا، ان کے خلاف مقدمہ قائم ہوا اور ان کی تعلیمات کو بالاتفاق "بدعت" (Herecy) قرار دے دیا گیا، محکمۂ احتساب (Inquisition) نے اپنی کارروائی کی اور جان ہس اور اس کے شاگرد جیروم کو زندہ جلا دیا گیا:

"By the council both these eminent men were condemned; the former of whom was accordingly burned in 1415,and the latter in the following year"(2)

(کونسل کے ذریعہ ان دونوں بزرگوں کو قصوروار ٹھہرایا گیا، ان میں سے پہلے شخص کو 1415ء میں اور دوسرے شخص کو اس کے بعد والے سال میں جلا یا دیا گیا)

اس طرح پاپائیت کی اخلاقی اور مذہبی بدعنوانیاں بدستور برقرار رہیں، جان ہس کو اگرچہ جلا دیا گیا لیکن اس کی تحریک زندہ و قائم رہی اور رفتہ رفتہ اس کے اثرات پھیلتے رہے، اس کی تعلیمات سے متاثر ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور مصلحین کا تسلسل قائم رہا جس کے نتیجہ میں کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور مغربی معاشرہ میں کلیسا کے اختیارات چہار دیواری میں ہی سمٹ کر رہ گئے۔

مارٹن لوتھر

سولہویں صدی میں پاپائیت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں میں جس شخص نے انقلابی روح پھونکی اس کا نام مارٹن لوتھر (Martin Luther) تھا، 10/نومبر 1483ء کو جرمنی کے شہر "ایس لی بن" (Eisleben) میں پیدا ہونے والے اس شخص کا بنیادی موضوع قانون (Law) تھا لیکن طبعی طور پر اس کا میلان علوم الٰہیات کی جانب تھا، چنانچہ اس نے رہبانیت اختیار کی اور پھر پادری کے منصب پر فائز ہوا، نیز یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا تھا، اپنے مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کے اس نے روم جا کر پوپ کی برکتوں سے مستفید ہونے کا ارادہ بھی کیا، لیکن وہاں پہنچ کر جب اس نے کلیسا کی بدعنوانیاں، پوپ کی بد اخلاقیوں اور خاص کر مغفرت ناموں (Indulgences) کی خرید و فروخت اور اس کے نتیجہ میں گناہوں پر جرأت و دلیری کا مشاہدہ کیا تو اس کے مذہبی احساسات کو سخت دھچکا لگا، چنانچہ اس نے واپس آ کر اصلاح کلیسا و اصلاح مذہب کی تحریک شروع کر دی:

---

(1) A Short History of Our Religion by D.C Somervell P.201

(2) History of The Church By Henry C. Wickersham . P.182

"He became indignant against the different sins and abominations that were practiced and urged upon the people, and his bold steps against these things were all that was necessary to awaken a wide-spread excitement."(1)

(وہ مختلف گناہوں، مروجہ خرافات اور عوام پر تھوپے گئے بے جا مراسم کے خلاف سخت غضبناک ہوگیا۔ ان برائیوں کے خلاف ایک عمومی تحریک کے لیے اس کا جرأت مندانہ اقدام نہایت ضروری تھا)

1516ء میں پوپ لیو دہم (Leo X) نے کلیسائے پطرس (Peter) کی تجدید کا ارادہ کیا، اس سلسلہ میں مالی فراہمی کے لیے اس نے مغفرت ناموں کی تجارت کو فروغ دیا، اس کے نمائندے مختلف شہروں میں پہنچے، بڑے پیمانہ پر مغفرت ناموں کی خرید وفروخت ہوئی، لیکن یہ کلیسائی نمائندے جب جرمنی پہنچے تو مارٹن لوتھر نے سخت نوٹس لیا، پر زور طریقہ پر اس کی مخالفت کی اور مغفرت ناموں کو رد کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا:

"No sinner can escape his punishment, unless he be sorry for his sins."(2)

(کوئی بھی گنہگار اپنی سزا سے اس وقت تک بچ نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے گناہوں پر نادم نہ ہو)

لوتھر نے اس مذمت کے ساتھ ہی کلیسا کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا، چنانچہ 21/اکتوبر 1517ء کو مغفرت ناموں کی فروخت اور ارباب کلیسا کے اختیارات اور ان کی بدعنوانیوں کے خلاف پچانوے (95) نکات (Ninety-Five Thesis) پر مشتمل ایک تحریر اس نے جرمنی کے شہر وٹن برگ (Wittenberg) کے کلیسا کے دروازے پر آویزاں کر دی جس سے رائے عامہ میں ایک ہلچل اور اضطراب پیدا ہوگیا، جرمن کے لوگ پوپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، بے شمار لوگ لوتھر کے نظریات کے حامی ہوگئے جن میں بعض شہزادے بھی شامل تھے۔

"Luther stormed in Germany by the corrupt sale of offices and indulgences."(3)

(لوتھر نے جرمنی میں معافی ناموں اور عہدوں کی ظالمانہ تجارت کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا)

لوتھر کا یہ اقدام کلیسا کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت تھی جسے کلیسا کی جانب سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ محکمہ تفتیش (Inquisition) نے حرکت دکھائی، تحقیقات ہوئیں اور 1520ء میں اسے حاضر ہونے کا حکم دیا گیا، لیکن لوتھر اپنے بعض خیر خواہوں کے کہنے پر عدالت میں حاضر نہ ہوا، جس کے بعد عدالت نے اسے تدریسی عہدہ سے معزول کر کے اس کے "مذہبی بائیکاٹ" (Excommunication) کا حکم صادر کر دیا۔

لوتھر نے کلیسا کی مخالفت میں اپنی ساری توانائیاں صرف دیں، مغفرت ناموں کے بعد اس نے بپتسمہ اور

---

(1) History of The Church By Henry C. Wickersham, P.191

(2) Table Talk by Martin Luther, P.84

(3) The Popes And Their Church By Joseph McCabe, P.79

عشائے ربانی کے سوا ان تمام رسوم کو من گھڑت قرار دیا جو کلیسا نے ایجاد کر رکھی تھیں۔ نتیجہ اپنے خلاف کلیسائی فیصلہ کو ادنی سی بھی اہمیت نہ دیتے ہوئے عدالتی فرمان کو سر عام جلا ڈالا اور اس طرح اس نے پاپائیت کے تابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دی:

"... in defiance burnt the bull of excommunication and the volumes of the canon law."(1)

(سرکشی میں اس نے بائیکاٹ کے سرکاری فرمان اور قانونی کتاب کی جلدوں کو آگ میں جلا ڈالا)

پروٹسٹ فرقہ کا آغاز

لوتھر کی یہ اصلاحی تحریک پاپائیت کے خلاف ایک احتجاج تھی جسے انگریزی زبان میں پروٹسٹ (Protest) کہا جاتا ہے، لوتھر نے سر عام کلیسا اور پوپ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے "پروٹسٹ" (Protest) شروعات کی، اس لیے جو لوگ اس تحریک کے حامی ہوئے انھیں پروٹسٹنٹ (Protestant) کہا جانے لگا۔

لوتھر کے باغیانہ تیور نے پورے یورپ میں ایک سیاسی بھونچال پیدا کر دیا، حامی و مخالف سب کھل کر سامنے آگئے، آخر کار شہنشاہ چارلس پنجم (Charles V) نے خود اس مسئلہ میں دلچسپی لی اور 1521ء میں ایک نشست منعقد کی، لیکن اس میں بھی کوئی نتیجہ نہ نکل سکا کیوں کہ خود شہزادوں نے اس کی مخالفت کی اور لوتھر کا ساتھ دیا، اس کے علاوہ کسی سرکاری نمائندہ کی یہ تحریر بھی بادشاہ کو پہنچی:

"A hundred thousand Germans are ready to lay down their lives for Luther."(2)

(سیکڑوں ہزار جرمن باشندے لوتھر کی خاطر اپنی جان دینے کو تیار ہیں)

بادشاہ وقت کلیسا کا حامی اور اس کا وفادار تھا، وہ کسی بھی صورت میں لوتھر کے بڑھتے اثرات پر قدغن لگانا چاہتا تھا لیکن ایک طرف وہ فرانس کے ساتھ جنگی مہم میں مصروف تھا اور دوسری طرف لوتھر کے حامیوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوتا جا رہا تھا حتی کہ خود بادشاہ کے برادر کو لکھنا پڑا:

"No one man in thousand is free from the taint of Lutherism."(3)

(ہزاروں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو لوتھر کے نظریات سے متاثر نہ ہو)

فروری/1546ء میں مارٹن لوتھر اس دنیا سے رخصت ہوا لیکن وہ پاپائی بدعنوانیوں کی مخالفت اور مذہبی بیداری

---

(1) History Of The Conflict Between Religion & Science, P.213

(2,3) A Short History of Our Religion, P.214

کی ایسی روح پھونک کر گیا کہ مغربی عوام رومن کلیسا سے بیزار ہو ہو کر اس سے الگ ہونے لگے، حتی کہ 1555ء میں چارلس پنجم اور شہزادوں کے مابین شدید اختلافات رونما ہوئے، آخر کار یہ طے ہوا کہ ہر شہزادہ کو اختیار ہے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کر لے، اس طرح مذہبی باغیوں (Protestants) کی تعداد بڑھتی چلی گئی اور پورا یورپ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا:

"Martin Luther, as we have seen, initiated the Protest- ant Reformation, which divided Europe and broke the monopoly of the Catholic Church "(1)

(مارٹن لوتھر نے - جیسا کہ ہم نے دیکھا - پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک کی شروعات کی، جس نے یورپ کو تقسیم کر دیا اور کیتھولک کلیسا کی اجارہ داری پر قدغن لگا دی)

لوتھر نے جرمنی میں اصلاح کلیسا کی تحریک شروع کی، اسی دوران سوئٹزرلینڈ (Switzerland) میں زونگلی (Zwingli) نے بھی یہی آواز بلند کی، بلکہ بعض اعتبار سے زونگلی کی صدائے احتجاج میں لوتھر سے کہیں زیادہ شدت تھی:

"It is remarkable that Zuinglius was much more rational than Luther on this subject "(2)

(یہ بات قابل ذکر ہے کہ زونگلی اپنے موضوع میں لوتھر سے زیادہ شدت پسند تھا)

لوتھر کی تحریک جرمنی میں اور زونگلی کی تحریک سوئزرلینڈ میں تھی، لیکن ان دونوں میں کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا، بلکہ یہ اصلاح کلیسا کا احساس تھا جو دونوں میں مشترک تھا۔

لوتھر کے بعد اصلاح کلیسا کی تحریک پوری شدت کے ساتھ جاری رہی، مختلف علاقوں میں اصلاح کلیسا کے نام سے متعدد تحریکیں اٹھیں اور اپنے اپنے حلقہ میں مؤثر ثابت ہوئیں، سولہویں صدی کی ابتداء میں فرانسیسی مفکر جان کالون (John Calvin) (1509-1564) لوتھر کی تعلیمات سے متاثر ہوا، اس نے لوتھر کی تحریک میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا، اس وقت فرانس میں پروٹسٹ فرقہ کے حامیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اس لیے وہ فرانس چھوڑ کر جنیوا (Jeneva) منتقل ہو گیا اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ پروٹسٹ تحریک کو تقویت پہنچائی، اس کی تحریریں پروٹسٹ کلیسا کی بنیادی لٹریچر میں شمار ہوتی ہیں، مسیحی مبادیات کے موضوع پر اس نے لاطینی زبان میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کلیسا کے بہت سے بنیادی عقائد و رسوم کو تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے، کتاب کا نام ہے:

"Institutes of The Christian Religion" (۳)

---

(1) A History Of Western Art By L. Schneider Adams, P.319

(2) A History Of The Corruptions Of Christianity, P.162

(3) For Details: Institutes of The Christian Religion (Transleted)

غرض لوتھر کی صدائے احتجاج یورپ کے ہر خطہ سے اٹھنی شروع ہوگئی، فرانس، اٹلی، جرمنی بلکہ یورپ کے ہر خطہ میں اس کی گونج سنائی دینے لگی، بالآخر انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم (Henry XIII) اور ایڈورڈ چہارم (Edward IV) بھی اس تحریک سے متاثر اور معاون بن گئے کہ وہ بھی کلیسا کی غلامی سے نجات چاہتے تھے، اس طرح لوتھر کا پروٹسٹنٹ فرقہ کیتھولک کلیسا کا مضبوط مدمقابل بن گیا۔ اس کی اشاعت یورپ کے اکثر ممالک میں ہوئی اور اب یورپ وامریکہ کے بیشتر ممالک میں اس کے متبعین موجود ہیں۔

معکوس تحریکِ اصلاح

اصلاحی تحریک کا بنیادی اثر یہ ظاہر ہوا کہ لوگ کلیسا سے دور ہونے لگے، ان کی ذاتی زندگیوں سے کلیسائی احکام دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے، ارباب کلیسا کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ اگر لوگ اسی طرح کلیسا سے کنارہ کش ہوتے جائیں گے تو جس کلیسا کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے وہ ویران ہوجائے گا، چنانچہ مخلص پادریوں نے کلیسا میں اصلاح کی کوششیں کیں، پادریوں کی زندگیوں کو پاکیزہ بنانے کے اصول مرتب کیے اور دعوت کے ذریعہ لوگوں کو کلیسا سے قریب کرنے کی جدوجہد کی، کلیسا کی اس اصلاحی کوشش کو تاریخ میں "Counter-Reformation" (معکوس تحریک اصلاح) کہا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کلیسا نے خود سے دور ہوتے مسیحیوں کو دوبارہ کلیسا میں لانے اور اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے میں دعوت واصلاح کے ساتھ جبر وتشدد سے بھی کام لیا، چنانچہ اگر ایک طرف کلیسا میں بعض اخلاقی اصلاحات ہوئیں تو دوسری جانب مذہب کے نام پر خونریزی کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا، کلیسا نے اپنے مخالفین کو سزا دینے کے لیے محکمۂ احتساب (Inquisition) کو سرگرم ومتحرک کیا، جس نے چند سال کے عرصہ میں نہ صرف مذہبی اصلاح اور علمی وتمدنی ترقی کی راہوں کو بڑی حد تک مسدود کردیا بلکہ ہر دو قسم کے ملزموں کی جانیں نہایت وحشیت اور درندگی کے ساتھ لی، انھیں برادری سے خارج کیا، زندہ آگ میں جلایا، بے دردی سے قتل کیا، غرض ہر قسم کی عبرتناک اور وحشت ناک سزائیں دیں جن کا تصور بھی لرزہ طاری کردے۔ (1)

مذہبی جنگ

مذہب کے نام پر جس تشدد کا آغاز کیتھولک کلیسا نے کیا تھا، پروٹسٹ فرقہ نے اس تشدد کو اپنے اقتدار میں بھی باقی رکھا اور کیتھولک فرقہ پر مظالم کے کسی بھی موقع کو ضائع ہونے نہ دیا، پس جہاں جس فرقہ کو قوت وغلبہ حاصل ہوا اس نے مقابل فریق کو تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی، فرانس میں کیتھولک اکثریت میں تھے اور انگلستان میں

(1) A Short History of Our Religion, P.217

پروٹسٹ غالب تھے چنانچہ دونوں ملکوں میں اقلیت کو سخت ترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا جس کی نتیجہ میں دونوں جگہ کی اقلیتوں کو بڑی تعداد میں ہجرت کرنی پڑی، اس طرح مذہب کی اس منافرت نے پورے یورپ کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا، اور دونوں فرقے اپنی حقانیت و اپنی اکثریت کو ثابت کرنے میں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے اور پورا یورپ مذہبی جنگ (Wars of Religion) کی بھٹی میں دہک اٹھا۔

کیتھولک اور پروٹسٹ کے مابین ہونے والی یہ مذہبی جنگ 1618ء سے 1648ء تک جاری رہی اس جنگ کو مؤرخین "تیس سالہ جنگ" (Thirty Years War) کے عنوان سے بیان کرتے ہیں اس جنگ کو تاریخ یورپ میں ایک "المیہ" (Tragedy) کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ اس جنگ نے یورپ کی نہ صرف تاریخ بدلی بلکہ اس نے یورپ کے سیاسی جغرافیہ کو بھی تبدیل کر دیا:

" the Thirty Years War that claimed eight million lives and transformed the political and religious map of Europe."(1)

(تیس سالہ جنگ میں اسی لاکھ زندگیاں ضائع ہوئیں، اور اس نے یورپ کے سیاسی و مذہبی نقشہ کو بدل کر رکھ دیا)

اس مذہبی جنگ میں لاکھوں زندگیاں تباہ ہوئیں، بھوک مری اور وبائی امراض کی کثرت ہوئی اور حالات کی خرابی نے اس قدر سنگین مسائل پیدا کیے کہ جنگ بندی کے بعد بھی ان کے حل میں طویل عرصہ لگ گیا۔ بہر حال تیس سالوں تک مسلسل چلنے والی یہ جنگ "فالین معاہدۂ امن" (Peace of Westphalia) کے بعد ختم ہوئی۔ (۲)

اس معاہدہ کے بعد ریاستوں کو آزادانہ طور پر اپنا مذہب اختیار کرنے کا اختیار دیا گیا جبکہ اس سے قبل طاقتور بادشاہ اپنے دائرۂ اقتدار میں کسی دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا، تجارتی پابندیاں ہٹالی گئیں اور دریائے رائن میں ایک حد تک جہازوں کو آنے جانے کی عام اجازت دی گئی، چونکہ اس معاہدہ میں یورپ کے اکثر ممالک بھی شریک تھے اس لیے اسے "یورپی اتحاد" (Europian Union) کی جانب پہلا قدم بھی قرار دیا جاتا ہے۔

کلیسائے انگلستان کا قیام

اصلاحی تحریکات نے جو حالات پیدا کیے اس کے نتیجہ میں کلیسا نے تشدد کی راہ اختیار کی، عوام پر سخت مظالم کے ساتھ شاہوں سے اقتدار کی کشمکش کا آغاز بھی ہوا، انگلستان کا بادشاہ ہنری ہشتم (Henry VIII) پروٹسٹ فرقہ کا حامی تھا، وہ اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا لیکن پوپ نے اس کی اجازت نہ دی، کیونکہ اس کی مرضی کے بغیر طلاق کا حق کسی کو نہ تھا، بادشاہ کے اصرار پر پوپ نے اس کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور اس کی زجر و توبیخ کی، جس کے

---

(1) Europe's Tragedy-A History of the Thirty Years War, By P. H.Wilson,P.20
(2) Europe's Tragedy-A History of the Thirty Years War,,P.20

بعد حالات سنگین ہوتے گئے۔

"……his breach with Rome began when an inflexible pope rebuked his "lust" by refusing a divorce is nonsense."(1)

(روم کے ساتھ اس کی مخالفت اسی وقت شروع ہوگئی تھی جب ایک سخت گیر پوپ نے اس کی "ہوس" پر قدغن لگاتے ہوئے اس کی غیر معقول طلاق کو مسترد کر دیا تھا)

پوپ کی ترش کلامی کے بعد بادشاہ نے بھی سخت موقف اختیار کر کیا اور رومن کلیسا سے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر لیا، اور ایک نئے کلیسا کی بنیاد رکھی جسے "کلیسائے انگلستان" (Church of England) کہا جاتا ہے:

"The Church of England dates its origin from the time of the Reformation, when Henry VIII shook off the pope's authority and took upon himself the title of "Head of the Church."(2)

(کلیسائے انگلستان کا آغاز "اصلاح" کے وقت سے ہی ہوگیا تھا، جب ہنری ہشتم نے پوپ کے اختیارات کو ختم کر کے کلیسا کی سربراہی کا خطاب اپنے نام کر لیا تھا)

کلیسائے انگلستان کا سربراہ خود بادشاہ تھا، اس نے وہ سارے اختیارات حاصل کر لیے جو کلیسائے روم میں پوپ کو حاصل تھے، لیکن انگریزی اور رومی کلیسا میں صرف اتنا فرق تھا کہ یہاں دعائیں انگریزی زبان میں پڑھی جاتی تھیں اور وہاں پر لاطینی زبان میں، باقی تمام مذہبی رسوم وہی تھے جنھیں پاپائے روم کی سند حاصل تھی:

"He only transfered it from the Pope to himself, claiming the title of soul and supreme head of the Church of England."(3)

(اس نے کلیسائے انگلستان کے سربراہ اعظم اور روحانی پیشوا کے دعوائے خطاب کے ساتھ محض اختیارات کو پوپ کی طرف سے خود کی جانب منتقل کیا تھا)

تحریک اصلاح کے نتائج

☆ پاپائے روم کی قیادت سے الگ کلیسا قائم ہوئے، جنھیں پروٹسٹنٹ اصطلاح میں "انجیلی کلیسا" کہا جاتا ہے۔

☆ پوپ صرف ایک مذہبی شخص ہے، وہ حضرت مسیح کا خلیفہ نہیں۔

☆ انجیلی کلیسا کے سربراہ کے اقوال کو کتاب مقدس کا تقدس حاصل نہیں ہے۔

☆ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی صورت میں دینی شخصیت کو معزول کیا جا سکتا ہے۔

☆ رجال کلیسا کی جانب رجوع کیے بغیر ہر مسیحی کو انجیل سمجھنے کا حق ہے۔

---

(1) Rationalist Encyclopaedia, P.285

(2) A History of The Church by H. C. Wickersham, PP.243-244

(3) A History Of The Corruptions Of Christianity, P.267

CamScanner

☆ کلیسا کی قیادت وعظ وارشاد اور ہدایت ونصیحت تک محدود ہے۔

☆ رہبانیت جائز نہیں، اس لیے کہ اس سے معصیت پیدا ہو سکتی ہے۔

☆ عشائے ربانی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

☆ کلیسا میں تصویریں اور ان کی عبادت ممنوع ہے۔ (۱)

تحریک اصلاح کے نقائص

پروٹسٹ فرقہ کی بنیاد ''پاپائے کلیسا'' کی مخالفت پر تھی اس لیے اس فرقہ نے ان علمائے مسیحیت کے افکار وخیالات کو من وعن قبول کر لیا جنھیں کلیسائی کونسلوں نے ملعون ومردود قرار دے دیا تھا، لیکن.....

لیکن اصلاح کی ان تحریکات نے اس سلسلہ میں سخت ٹھوکریں کھائیں، کیونکہ علمائے قدیم کے اقوال کو قبول کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ سابقہ کونسلوں کے تمام فیصلوں پر نظر ثانی کی جاتی اس کے بعد کوئی نیا موقف اختیار کیا جاتا۔

اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ کتاب مقدس اور اس کی تاریخی حیثیت کو واضح کیا جاتا، اس میں تحریفات وتفریعات کی تحقیق کی جاتی اور پھر اسے قبول یا رد کیا جاتا۔

یہ بھی ضروری تھا کہ ان عوامل واسباب کا پتہ لگایا جاتا جن کی وجہ سے ارباب کلیسا حضرت مسیح کی غیبوبت کے بعد عقیدۂ گناہ وکفارہ میں ایجادات کرتے رہے۔

اور سب سے بڑھ کر مجسموں اور تصویروں کی عبادت کو ممنوع کرنے سے پہلے کتاب مقدس کی روشنی میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم (علیہما السلام) کی عبدیت کو سمجھا جاتا اور حقیقی توحید تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی، لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکے، کیونکہ ان تمام تحقیقات کی انتہا اور اصلاح عقیدہ کا مکمل بدل صرف اسلام تھا، اور انھوں نے اپنی تحریکات وتحقیقات میں اسلام کو شروع سے ہی خارج رکھا تھا چنانچہ ان کی اصلاح نہایت محدود تھی اور اس کا بیشتر حصہ ''پوپ'' کے خلاف صدائے احتجاج پر مبنی تھا اور ردعمل کے طور پر مذہب کی چند خرابیوں کو دور کرنے میں ہی اس کا اثر ظاہر ہوا، مثلاً پوپ کی غلامی کا جوا اتار پھینکا گیا، اور کلیساؤں سے حضرت عیسیٰ ومریم علیہما السلام کے بت نکال دیے گئے، اور اسی قسم کے بعض ان مراسم کی اصلاح ہوئی جو مذہب کے نام پر رائج تھیں اور ان کا تمدنی واجتماعی زندگی میں کوئی مثبت کردار نہیں تھا۔

---

(۱) مسیحیت۔علمی وتاریخی حقائق کی روشنی میں۔صفحہ: ۱۵۹، ۱۶۱

تحریک اصلاح کے منفی اثرات

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریکِ اصلاح نے ایک طرف پاپائیت کے مظالم اور مذہب کے نام پر جبری نفاذ سے آزادی دلائی تو دوسری طرف اس نے مذہب بیزاری کی عمومی راہ بھی ہموار کی۔

یہ تحریک نہ اصولِ فطرت کے مطابق تھی اور نہ اسے اصولِ فطرت کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اصلاح کی تمام تحریکات اور تمام تحقیقات مذہب اور انسانیت کی حقیقی خدمت سے محروم رہیں اور اصلاحِ زندگی کے ان تاروں کو چھیڑنے میں ناکام رہیں جو عقل کو جذبات پر فتح مند بناتے ہیں۔

ایمان و وجدان کی وہ کیفیت کو پیدا کرنے میں بھی ناکام رہی جو غیر شعوری طور پر حقیقت کا احساس کرا کر اس تک پہنچاتی ہے۔

اجتماعی اور تمدنی مسائل کے مثبت پہلو سے اس نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

تحریک اصلاح میں نہ عقل و قلب کا آمیزہ مُتیارِ ہوا تھا کہ اس کی رہنمائی میں زندگی کے مسائل حل کیے جا سکیں اور نہ دین و دنیا میں صحیح توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

تحریک اصلاح کے ذریعہ گرچہ مذکورہ نتائج برآمد ہوئے لیکن یہ تحریک کلیسا اور پاپائیت کی جس اصلاح کی خاطر برپا کی گئی تھی اس میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی واقع نہ آئی، چنانچہ پاپائیت اپنی سابقہ حالت پر قائم رہی، کلیسا میں رشوت ستانی اور قتل سوزی کے واقعات رونما ہوتے رہے، اخلاق سوزیاں بدستور قائم رہیں، حصول سیم و زر اور جاہ و منصب کی مقابلہ آرائی جاری رہی، حتی کہ خود تحریک اصلاح کے بنیادی علمبردار لوتھر پر بھی اس اس کے مخالفین نے شدید نوعیت کے الزامات لگائے، تاہم اگر ہم انہیں مستقل و آزادانہ ثبوت نہ ہونے کی بنا پر نظر انداز بھی کر دیں تو اس کے مطبوعہ خطوط اور گفتگو کا مجموعہ "Table Talk" کا فحش پن (Coarseness) اس کے کردار کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتا:

> *"Luther's "Table Talk" and "Letters" show that he habitually used speech of the very coarsest description. .....Luther's word for women, when they sought relief from their disabilities, is vile. Such a man could not, and did not, insist on chastity."(1)*
>
> (لوتھر کی کتاب "ٹیبل ٹاک" اور اس کے "خطوط" یہ واضح کرتے ہیں وہ نہایت ہی غیر معیاری زبان کے استعمال کا عادی تھا..... لوتھر کے الفاظ ان عورتوں سے متعلق جنھیں اپنی پریشانیوں سے نجات ملی تھی بہت ہی گھٹیا ہیں، ایسا شخص نہ پاکیزگی پر قائم رہتا ہے اور نہ قائم رہ سکتا ہے)

---

(1) Social Record of Christianity, PP.87-88

عقلیت کا دور (Age of Rationalism)

شہنشاہ قسطین کی مسیحیت کے بعد سے ہی مسیحی مذہب جمود و تعطل کا شکار ہو چکا تھا، غور و فکر کے دروازے بند ہو گئے تھے، علم و تدبر کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں، اور مسیحیت کے نام پر پیش کیا گیا ہر فکرہ واجب القبول ہو گیا تھا:

".....Constantine the Great adopted Christianity. This momentous decision inaugurated a millennium in which reason enchained, thought was enslaved, and knowledge made no progress."(1)

(قسطنطین اعظم نے مسیحیت کو قبول کی، اس یادگار فیصلہ نے اس ہزارہ کا آغاز کیا جس میں عقل پابہ زنجیر تھی، فکر و تدبر پر بندشیں تھیں اور علم میں کوئی ترقی نہ تھی)

لیکن زندگی کے اس جمود کے نیچے ہمیشہ سے ایک تلاطم موجود تھا، سترہویں صدی میں اس تلاطم نے وہ کیفیت اختیار کی کہ ساری بندشیں ٹوٹ گئیں، سارے پردے چاک ہو گئے، اور صدیوں سے قید بامشقت میں رہنے والی انسانی عقل نے آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی دین و دنیا کے ہر حکم کو اپنے مزاج میں ڈھالنے کی سعی پیہم کی، چنانچہ تحریک اصلاح کی کامیابی کے ساتھ ہی یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا وہ دور شروع ہوا جسے "عقلیت کا دور" (Age of Rationalism) کہا جاتا ہے۔

مارٹن لوتھر نے پہلی بار کلیسا کے خلاف جنگ لڑنے اور بائبل کی تشریح و تعبیر میں اپنے اسلاف سے اختلاف کی جرأت کی تھی، مگر جب یہ دروازہ ایک بار کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا، لوتھر نے صرف بائبل کی تشریح و تعبیر کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا تھا مگر خود بائبل پر نکتہ چینی کی ہمت اسے بھی نہ تھی، لیکن جب اس کی صدائے احتجاج علماء و مفکرین کی مجلسوں میں گونجی تو کلیسا کی تقلید اور اس کی بندشوں کی زنجیریں یکلخت ٹوٹتی چلی گئیں، اور انھوں نے اُن بے بنیاد نظریات کی پرزور تردید کی جو جغرافیہ، تاریخ اور طبیعیات سے متعلق مذہبی کتابوں میں موجود تھیں اور بڑی آزادی اور بے باکی کے ساتھ ان کی علمی تنقید کی اور عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ان پر ایمان لانے سے صاف انکار کر دیا، انھوں نے اپنی تنقید میں بائبل کو بھی نہ بخشا اور مسیحیت کے ایک ایک عقیدہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ علماء و مفکرین کے اس طبقہ نے اپنا تعارف "عقلیت پسند" (Rationalist) کے نام سے کرایا اور انھوں نے اپنے عقلانی دور کو "دور عقلیت" (Age of Rationalism) سے تعبیر کیا، جس نے آگے چل کر مزید وسعت اختیار کی اور پھر "روشن خیالی" (Enlightenment) کی اصطلاح استعمال کی جانے لگی۔

چنانچہ عقلیت پسندی (Rationalism) کی تعریف یوں کی گئی ہے:

---

(1) A History Freedom of Thought By J.B. Bury. PP.51-52

The principle that all questions relating to religion or religious creeds must be settled by reason or by the individual critical examination of arguments or evidences, not by revelation, authority, tradition, emotion, instinct or intuition."(1)

(یہ اصول کہ مذہب اور مذہبی عقائد سے متعلق تمام سوالات علت کی بنیاد پر یا ذاتی بحث وتحقیق کے تنقیدی نتائج کی بنیاد پر حل ہونے چاہیے نہ کہ وحی، سند، روایت، جذبات، احساس یا خیال کی بنیاد پر)

روشن خیال عقلیتی طبقہ میں ولیم شلنگ ورتھ (William Chillingworth) (1602-1644ء) کا نام سب سے نمایاں تھا، پھر لارڈ ہربرٹ (Lord Herbert) (1583-1648) اور تھامس ہوبیس (Thomes Hobbes) (1588-1671) وغیرہ اس گروہ کے امام سمجھے گئے۔

ولیم شلنگ نے سب سے پہلے عقلیت کا نعرہ دیا، وہ کہتا تھا:

"I am certain that God hath given us our reason to discern between truth and falsehood, and he that makes not this use of it believes things he knows not why; I say, it is by chance that he believes the truth and not by choice, that I cannot but fear, that God will not accept this sacrifice of fools."(2)

(مجھے یقین ہے کہ خدا نے ہمیں سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق کرنے کی علت دی ہے، اور جو اس کا استعمال نہیں کرتا وہ اپنے عقیدہ کی علت سے ناواقف ہے، میرا کہنا ہے کہ ایسا شخص اتفاقی طور پر حق کو تسلیم کرتا ہے نہ کہ اختیاری طور پر، اور خدشہ ہے کہ خدا ایسے بے وقوفوں سے ان کی قربانی کو قبول نہیں کرے گا)

عقلیت پسندوں کا کہنا تھا کہ مذہب کے ایک ایک مزعومہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اور ہر اس بات کو رد کر دیا جائے گا جو عقل کے معیار پر نہ اترتی ہو، چاہے اس کے لیے کتنے ہی عقائد ونظریات کو خیر باد کہنا پڑے:

"..... all religious truths are derived from human reason alone; that human reason is the sole medium by which man can arrive at any truth."(3)

(تمام مذہبی سچائیاں تنہا عقل انسانی سے ہی ماخوذ ہیں، کیونکہ انسانی عقل ہی وہ مضبوط واسطہ ہے جس کے ذریعہ انسان کسی بھی صداقت تک پہنچ سکتا ہے)

الغرض ازمنہ وسطی کے اواخر میں مذہب کا کلچر ایک گلیشئر (Glacier) کی طرح پگھلنے لگا، مذہبیت کے ٹھوس اجسام پر جہاں بھی دلائل کی تیز روشنی پڑی جگہ جگہ سے دراڑیں پڑنے لگیں، کچھ دراڑیں تو اتنی کشادہ تھیں کہ تازہ فکر کی

---

(1) Rationalist Encyclopaedia (Rationalism)

(2) A Short History of the Church by Clarke, P.395

(3) The New Catholic Dictionary (Rationalism)

CamScanner

ایک پتلی دھار اس کے اندر سے بہنے لگی، وقت گذرنے کے ساتھ پانی کا وہی چشمہ طوفانی لہروں میں بدل گیا جس نے عقائد کے پشتوں کو توڑ ڈالا، چنانچہ عقلیت کا یہ نشہ جب سر چڑھنا شروع ہوا تو مذہب کا کوئی بھی عقیدہ اس کی دست برد سے سلامت نہ رہ سکا، یہاں تک کہ وولٹائر (Voltaire)(1694-1788ء) جیسا فلسفی بھی پیدا ہوا جس نے خدا کے وجود میں ہی شک وارتیاب کا بیج بو دیا، جو برگ وبار لایا اور ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے سرے سے خدا کے وجود کا ہی انکار کر دیا۔

مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل اس طبقہ کا اہم نمائندہ سمجھا جاتا ہے، اس کا کہنا تھا:

"The whole conception of God is a conception derived from the ancient Oriental despotisms. It is a conception quite unworthy of free men. When you hear people in church debasing themselves and saying that they are miserable sinners, and all the rest of it, it seems contemptible and not worthy of self-respecting human beings."(1)

(خدا سے متعلق تمام تصورات قدیم مشرقی استبدادی تصور سے ماخوذ ہیں، یہ تصور ایک آزاد انسان کے بالکل موافق نہیں ہے، جب تم کلیسا میں لوگوں کو اپنی تحقیر کرتے اور یہ کہتے ہوئے سنتے ہو کہ وہ بہت بڑے گنہگار ہیں وغیرہ وغیرہ تو اس سے نوع انساں کی تحقیر اور عزت نفس کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہے)

عقلیت پسندی کا ردعمل

مذہب کے ماننے والوں پر عقلیت پسند تحریک کا ردعمل دو شکلوں میں ظاہر ہوا، ایک طبقہ اس تحریک سے متاثر ہوا اور انسانی عقل کو معیار تسلیم کر کے مذہب کی ہر چیز کو جانچنے لگا، اس کا ماننا تھا کہ مذہب بنیادی طور پر درست ہے لیکن اس کی تعبیر وتشریح میں غلط طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں، جبکہ بائبل میں اتنی لچک موجود ہے کہ اسے ہر دور کے مطابق بنایا جا سکے، اور اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اس کے ناقابل فہم اور غیر اہم حصوں کو بھی چھوڑا جا سکے۔ اس رد عمل کو "جدیدیت" (Modernism) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مشہور فلسفی "روسو" (Jean-Jacques Rousseau) اس طبقہ کا سربراہ تھا، اس طبقہ کے نتیجہ میں مغربی معاشرہ کی جڑوں تک میں مادیت اثر انداز ہوتی چلی گئی۔

دوسرا طبقہ تجدد پسند طبقہ (Modernist) کے بالکل خلاف تھا، اس کا کہنا تھا کہ مسیحیت وہی ہے جو ہمارے اسلاف نے سمجھی تھی اور جس کا ذکر نسلوں سے چلا آ رہا ہے، اس لیے اسی مسیحیت کی ضرورت ہے، کلیسا کو پھر سب سے بڑا اقتدار ہونا چاہیے، کیتھولک عقائد میں کسی بھی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے کیتھولک عقائد واقدار کے احیاء کی کوششیں شروع کر دیں، جس کے نتیجہ میں دونوں طبقوں میں زبردست تصادم رونما ہوا، اور "تحریک احیاء"

---

(1) Why I Am Not A Christian by Bertrand Russell, P.11

(Catholic Revival Movement) کے نام سے ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا۔

اس تحریک کو انیسویں صدی عیسوی میں اس وقت مقبولیت حاصل ہوئی جب مغربی معاشرہ مادیت کا پورا پورا تجربہ کرنے کے بعد اپنے دامن پہ سیکڑوں گھاؤ لے کر لوٹ رہا تھا، مادی تہذیب نے مغربی زندگی میں جو زبردست بے چینی پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے ایک بار پھر روح کی طرف متوجہ ہونے کا شعور بیدار ہوا، چنانچہ قدیم مسیحیت کے احیاء کی تحریک شروع ہوئی، اور ایک مرتبہ پھر مسیحیت ان قدیم اقدار و نظریات کی گود میں جا گری جنھوں نے مسیحی دنیا کو تیرہویں اور چودہویں صدی میں ہلاکت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہی تحریکیں (تحریک عقلیت، تحریک تجدد، تحریک احیاء) اور ان کی نئی نئی شکلیں مغربی دنیا میں قبول عام کے منصب پر فائز رہیں، اور زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کرتے ہوئے انھوں نے مذہب کو زندگی کے ہر میدان سے خارج کر دیا، اور کلیسا کو اسی کی عمارت میں مقید کر دیا جہاں سے اس کی رہائی کی اب تک کوئی مؤثر صورت عمل میں نہیں آسکی۔

دین و سیاست کی تفریق

واضح رہے کہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک نہ تو مذہب کے احیاء کے لیے تھی اور نہ مذہب کی تجدید کے لیے تھی، بلکہ اس کا مقصد مسیحی معاشرہ کو مذہب و سیاست کی کلیسائی بندشوں سے آزاد کرانا تھا، چنانچہ جہاں ایک طرف مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے جرمنی میں مذہب کے مردہ جسم میں نئے سرے سے جان ڈالنے کی کوشش کی وہیں دوسری جانب اطالیہ کے لامذہبی ماحول میں "نیکولو میکاولی" (Nicolo Machiavelli) نے مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا۔

اطالیہ میں میکاولی اور جرمنی میں لوتھر کی شخصیتیں ایسی تھیں جن کے خیالات میں ان کے زمانے کی ذہنی فضا کا عکس بہت صاف اور واضح نظر آتا ہے، دونوں باغی تھے، ایک قرون وسطی کی سیاسی ذہنیت سے اور دوسرا مذہبی رجحانات سے، اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر ایک نئی سیاسی اور مذہبی زندگی کا پیغام سنایا۔

نظریہ قومیت

پندرہویں صدی میں اطالیہ کی سیاسی حالت نہایت ابتر تھی، وسط میں کلیسا کا سیاسی اقتدار تھا، شمال میں شہنشاہ کا، جنوب میں اسپانیہ کا، وینس اور فلورینس میں شہری ریاستیں تھیں، ان کے علاوہ جا بجا چھوٹی بڑی حکومتیں بھی تھیں جنھیں اپنی خود مختاری بہت عزیز تھی۔ ان حالات میں میکاولی نے "قومیت" کا نظریہ پیش کیا، یہ خالص رومی نظریہ تھا لیکن چونکہ "اصلاحات" کے دور میں میکاولی نے اس نظریہ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا تھا اس لیے اسے ہی اس

کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ قومیت کے اس نظریہ نے مذہب کو ایک ذاتی معاملہ قرار دیا جس کے نتیجہ میں پورا مغرب مذہب و سیاست کے دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو گیا۔

میکاولی 1469ء میں اطالیہ کے شہر "فلارنس" (Florence) میں پیدا ہوا، اور 1527ء تک زندہ رہا، عنفوان شباب ہی سے وہ حکومت سے وابستہ ہوا اور ایک سیاسی خادم کی حیثیت سے بادشاہوں کے پاس بطور سفیر جانے لگا، جس سے دنیا کے تجربات و حالات معلوم کرنے کے مواقع فراہم ہوئے، جس دور میں یہ شخص سیاسی خدمت پر مامور تھا اطالیہ کی سیاسی کسمپرسی کے حال میں تھی، اس کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور پورا معاشرہ مختلف اخلاقی و معاشرتی برائیوں کا شکار تھا، جس سے اس کی زندگی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، بلکہ یہی حالات اس کی ذہنی ارتقاء کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔

1512ء میں اطالیہ انقلاب کی لپیٹ میں آیا، اور فلورنس کی آزاد حکومت کو میڈیچی (Medici) نے تہہ و بالا کر دیا، جس کے بعد میکاولی کو سیاسی خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا اور مجبوراً اسے خلوت کی زندگی اختیار کرنی پڑی، اسی زمانہ (1513ء) میں اس نے اپنی مشہور ترین کتاب "The Prince" لکھی جو اس کی دائمی شہرت کا باعث بنی۔

دی پرنس کا موضوع حکومت و مذہب میں علیحدگی اور اخلاقی اصولوں سے سیاست کی مکمل آزادی کا اعلان ہے، نیز تاریخی حوالوں اور اپنے عہد کے واقعات کے ذریعہ یہ دریافت کرنا ہے کہ حکومتیں کس طرح حاصل کی جا سکتی ہیں، کس طرح انھیں زیر اطاعت رکھا جا سکتا ہے اور کس طرح وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہیں؟! اس کے اس نظریہ کو یورپ میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ آج اسے "جدید سیاست کا بانی" (Father of Modern Political Science) کہا جاتا ہے۔ (1)

میکاولی کے نزدیک قومی مملکت ہی کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی اور انسان کی اصل غرض و غایت ہے، وہ نفس قوت کی خاطر ترقی قوت کا پرستار ہے، اسی لیے اس کے نزدیک حکومت کا اختیار اسی کو ہے جس کے اندر اپنی طاقت و قوت کے ذریعہ حکومت چھیننے کی مہارت ہو، چنانچہ وہ کہتا ہے:

"Power is for those who have the skill to seize it in a free competition "(2)

(اقتدار پر صرف ان کا حق ہے جو آزاد مسابقت میں اسے چھین لینے کی مہارت رکھتے ہیں)

میکاولی مذہب و سیاست کی تفریق کا قائل تھا، اس کے نزدیک مذہب کی اگر ضرورت ہے تو وہ ایک ذاتی (Private) معاملہ ہے جس کو امور سیاست میں دخل نہیں دینا چاہیے، اسی لیے وہ سیاست کے کسی بھی اصول کے

---

(1) Politics and Philosophy By Mikko Lahtinen, P.92

(2) A History Of Western Philosophy By B. Russell, P.509

لیے مذہب کو بنیاد نہیں بناتا:

"It is to be noted that Machiavelli never bases any political argument on Christian or biblical grounds."(1)

(یہ بات قابل غور ہے کہ میکاویلی کبھی بھی کسی سیاسی دلیل کے لیے مسیحیت یا بائبل کو بنیاد نہیں بناتا)

میکاولی کی نظر میں سلطنت نہ اخلاقی ہے اور نہ قانونی بلکہ وہ محض ایک سیاسی ہے اور اسی معیار سے سلطنت کا بندوبست کرنا چاہیے، چنانچہ بادشاہوں اور حکام کے لیے ضروری ہے کہ وہ لومڑیوں کی صفات اختیار کریں اور اگر حکومت کا فائدہ ہوتا ہو تو عہد شکنی، دروغ گوئی، فریب دہی، خیانت اور نفاق میں پس وپیش نہیں کرنا چاہیے، اپنی مشہور کتاب "دی پرنس" میں اس سلسلہ کی متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے:

".....he who has known best how to employ the fox has succeeded best. But it is necessary to know well how to disguise this characteristic, and to be a great pretender and dissembler; and men are so simple, and so subject to present necessities, that he who seeks to deceive will always find someone who will allow himself to be deceived."(2)

(.....سب سے زیادہ کامیاب شخص وہ ہے جس نے لومڑی کی صفات کو سب سے زیادہ اختیار کیا ہو۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اس کردار پر اچھے طریقہ سے پردہ ڈال سکتا ہو، اور اسے یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ مکار اور دھوکہ باز کیسے بنا جائے، اس لیے کہ ایک فریب کار کو حالات سے مجبور ہو کر سادہ لوح اور دھوکہ کھانے والے ہمیشہ ملتے رہتے ہیں)

میکاولی وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلی بار غیر مذہبی، خود مختار، علاقائی حکومت کا نقشہ پیش کیا، اور روحانی دنیا کے معاملات سے الگ ہو کر مادی زندگی کو اختیار کرنے کی دعوت دی، چنانچہ اس کے خلاف عقل وخلاف قانون نظریہ کو اطالیہ کے باغیانہ ماحول میں زبردست پذیرائی اور فروغ حاصل ہوا، سیاست کو مذہب سے پوری طرح آزادی حاصل ہوئی، زندگی میں سیاست کی لہر دوڑ گئی اور ہر چیز سیاست کی عینک سے دیکھی جانے لگی، اس طرح یورپ کی سیاست ایک "دیوبے زنجیر" بن گئی جس کے لیے مذہب واخلاق کی کوئی بندش نہیں تھی۔

مذکورہ وضاحت کے بعد میکاولی کے نظریات کو مختصراً تین نکات میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے: (۱) اخلاقی اصولوں کی نفی (Amoralization) (۲) قومیت پرستی (Nationalization) (۳) لادینیت (Secularization)۔

---

(1) A History Of Western Philosophy By B. Russell, P.509

(2) The Prince By Machiavelli, P.43

CamScanner

الغرض نظریۂ قومیت کے فروغ کے بعد اہل سیاست کی مستقل جماعت تیار ہوگئی جو قومی وملکی فلاح و بہبود و مذہبی خیالات پر ترجیح دینے لگی، پھر اس جماعت نے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقہ کے ''روشن خیال'' لوگوں کو بھی شامل کرلیا اور مغربی معاشرہ کو ایک ایسی تہذیب سے روشناس کرایا جسے صحیح لفظوں میں ''مادی تہذیب'' کہا جاسکتا ہے۔

یورپ کا مادی دور

میکاولی کے سیاسی و مذہبی نظریات نے بہت جلد فروغ حاصل کیا، خاص کر اہل قلم اور اہل دماغ نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور خطابت وشاعری کے ذریعہ قدیم اخلاق اور مذہبی نظامات کے خلاف ایک بغاوت پیدا کردی، اگرچہ لوتھر کی پروٹسٹ اصلاحی تحریک اس کی تیز رفتاری پر اثر انداز ضرور ہوئی لیکن ''روشن خیالوں'' کی تائید و دلچسپی کی بنا پر یہ روک عارضی ثابت ہوئی، اور مغربی معاشرہ رفتہ رفتہ مادیت کی طرف گامزن ہوگیا۔

اس بات سے انکار نہیں کہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد بہتیرے علماء و مفکرین مدتِ دراز تک مادی نقطۂ نگاہ، مادی زندگی اور مسیحی اعمال و رسوم کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، وہ مذہبی تقلید سے پوری طرح آزاد نہ تھے، مذہبی ماحول باقی تھا، اخلاقی قدریں زندہ تھیں، لوگوں میں خوف خدا کا عنصر متحرک واثر آفریں تھا، اجتماعی انتشار اور اخلاقی ابتری سے حفاظت کے لیے مذہب کی ضرورت مسلم تھی لیکن مادیت کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ مذہب اور اس کے رسوم اس کا ساتھ نہ دے سکے، بالآخر مادیت اور روحانیت کی اس کشمکش میں فتح مادیت کی ہی ہوئی جس کے بعد مغربی معاشرہ نے صاف طریقہ ''پرلادینیت'' اور ''مادہ پرستی'' کو اختیار کرلیا۔ اس طرح یورپ کی تہذیب وثقافت پر مادیت پوری طرح غالب آگئی، افکار و خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں کی بنیاد میں مادیت سرایت کرگئی!

مغرب میں ایسے مصنف و ادیب، معلم اجتماعی، علمائے فلسفہ و علوم طبیعیات و سیاسیات پیدا ہوئے جنھوں نے کائنات میں اس طرز پر غور اور بحث شروع کی کہ گویا نہ اس کا کوئی خالق ہے اور نہ کوئی منتظم و حاکم، وہ عالم طبیعی اور اس کے ظواہر و آثار کی تشریح و تنقیح خالص میکانیکی طریقہ پر کرنے لگے، اور پھر اسی کو علم و تحقیق کا معیار قرار دیا، انھوں نے مذہب کے ہر اس طریق کا مذاق اڑایا جو عقل کی کسوٹی پر نہ اترتا ہو یا جس کی منزل خدا کی معرفت ہو، اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کا وجود اور مابعد الطبیعیات سارے حقائق ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا علم و عقل سے کوئی تائید نہیں ہوتی، اس طرح انھوں نے مادیت کا صور پھونک دیا اور لوگوں کے دل و دماغ میں مادہ پرستی کے بیج بو دیے، انھوں نے معصیت کو خوشنما بنا کر پیش کیا، طبیعتوں کو ہر قید و بندش سے اور فرد کو ہر طرح ذمہ داری و جواب دہی سے آزاد ہونے

کی تبلیغ کی، نفس کے مطالبات کی تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی، اور زندگی کے ہر میدان میں غلو مبالغہ سے کام لیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ کی مغربی زندگی یونان و روما کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی، یونان و روما کے جن نقوش کو صدیوں قبل کی مسیحیت نے مدہم کر دیا تھا انیسویں صدی کے نقاشوں نے انھیں پھر سے ابھار دیا، یورپ کی موجودہ زندگی روحانیت اور باطنی کیفیت سے اسی طرح خالی ہے جیسے یونانیوں کی مذہبیت تھی، اسی طرح مذہبی شک و تذبذب، دینی نظام کی توہین اور مذہبی فرائض و رسوم کی بے وقعتی میں یورپ کسی بھی طرح روما سے پیچھے نہیں ہے، اسی لیے یورپ کی موجودہ مادی تہذیب کو یونان و روما کا "جدید ایڈیشن" بھی کہہ سکتے ہیں جس کے آثار نمایاں ہوئے اور انیسویں صدی میں بنے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی بظاہر روحوں اور دلوں پر حکومت ہے وہ مسیحیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے جس پر رنگ و روغن مل کر خوشنما بنا دیا گیا ہے، نیز روشن خیالی، آزادی فکر و آزادی رائے اور ترقی و مساوات کے دلفریب نعروں کے ذریعہ اسے پرکشش بنایا گیا ہے جبکہ زندگی کے قدم قدم پر اس کا کریہہ المنظر چہرہ اور اس کے حقیقی خدوخال کو بخوبی نمایاں ہوتے ہیں۔

پروفیسر جوڈ (Prof. Joad) جو لندن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ و علم النفس کے صدر رہے، مغربی تہذیب کی مادیت پرستی کے متعلق لکھتے ہیں:

> *"For centuries England has been dominated by the gospel of acquisition. "Money talks," and the desire for it, has for two hundred years past been a greater spur to effort than all other incentives added together. For money buys possessions, and by the number and grandeur of his possessions a man's merit is chiefly estimated." (1)*
>
> (صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے، حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر جملہ محرکات عمل سے زیادہ کام کرتی رہی ہے، کیونکہ دولت 'حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور شان و عظمت ہی سے انسان کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے، سیاسیات، ادب، سنیما، ریڈیو اور کبھی کبھی کلیساؤں کے منبروں سے سال بسال اپنے پڑھنے سننے والوں کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں جذبۂ حصول انتہائی طور پر ترقی کر چکا ہو)

مشہور نومسلم مفکر محمد اسدؒ سابق "لیوپولڈ ویس" (Leopold Wesis) مغربی تہذیب کے عمومی و منفی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(1) *Philosphly for Our Times. PP.338-339*

"The average Occidental - be he a Democrat or a Fascist, a Capitalist or a Communist, a manual worker or an intellectual - knows only one positive "religion" and that is the worship of material progress, the belief that there is no other goal in life than to make that very life continually easier or, as the current expression goes, "independent of Nature". (1)

(یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوری ہو یا فاشسٹ، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب جانتا ہے اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان و پر راحت، اور آزاد و بے قید بنائے)

یورپ کی موجودہ تہذیب کی بنیاد جسم وقلب کے حقیقی سکون، روح کی بالیدگی اور انسانیت کی خدمت تھی لیکن اس سلسلہ میں اسے جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس پر "نوبل انعام" یافتہ مغربی فاضل الکسس کیرل (Alexis Carrel) کے تبصرے ملاحظہ ہوں:

"In truth, modern life has set them free. It incites them to acquire wealth by any and every possible means, provided that these means do not lead them to jail. It opens to them all the countries of the earth. It allows them the frequent excitation and the easy satisfaction of their sexual appetites. It does away with constraint, discipline, effort, everything that is inconvenient and laborious." (2)

(اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زندگی انسان کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ دولت کو ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کرے لیکن یہ ذرائع انسان کی دولت کے مقصد تک نہیں پہنچاتے، یہ انسان میں ایک دائمی ہیجان اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک سطحی جذبہ پیدا کرتے ہیں، ان کے اثر سے انسان صبر وضبط سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر ایسے کام سے گریز کرنے لگتا ہے جو ذرا دشوار اور صبر آزما ہو)

"Modern civilization seems to be incapable of producing people endowed with imagination, intelligence and courage. In practically every country there is a decrease in the intellectual and moral caliber of those who carry the responsibility of public affairs." (3)

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب جدید ایسے انسان پیدا ہی نہیں کر سکتی جن میں فنی تخلیق، ذکاوت اور جرأت ہو، ہر ملک کے صاحب اقتدار طبقہ میں جس کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے ذہنی اور اخلاقی قابلیت کا نمایاں انحطاط نظر آتا ہے)

"We realize that, despite the immense hopes which humanity has placed

---

(1) Islam At The Crossroads By Muhammad Asad, P 44

(2) Man - The Unknown, By Alexis Carrel, P 16

(3) Man - The Unknown, By Alexis Carrel, PP.17-18

(ترجمانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر ۲۲۳)

in modern civilization, such a civilization has failed in developing men of sufficient intelligence and audacity to guide it along the dangerous road on which it is stumbling."(1)

(ہم محسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب جدید نے ان بڑی بڑی امیدوں کو پورا نہیں کیا جو انسانیت نے اس سے وابستہ کی تھیں، اور وہ ان لوگوں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی جو ذہانت اور جرأت کے مالک ہوں اور تہذیب کو اس دشوار گذار راستہ پر سلامتی کے ساتھ لے جاسکیں جس پر آج وہ ٹھوکریں کھا رہی ہے)

بلاشبہ اس وقت دنیا کے کسی بھی خطہ میں کوئی قوم یا جماعت ایسی نہیں ہے جو مغربی اقوام یا مغرب زدہ ممالک کے عقائد ونظریات کی مخالفت کر سکے، سب اسی جاہلی فلسفہ اور مادہ پرستانہ نظام حیات کے قائل ومعتقد ہیں، رہی وہ کشمکش جو نظریاتی اختلاف یا سیاسی جنگوں کی صورت میں جابجا نظر آرہی ہے وہ محض اس بات کی کشمکش ہے کہ مادہ پرستی کے اس نظامِ حیات میں منصبِ قیادت کس کے ہاتھ میں رہے گا؟ کسی قوم کی غیرتِ قومی اس کی روادار نہیں ہے کہ دوسری قوم مدتِ دراز تک دنیا کی قیادت پر فائز، اور زندگی کے وسائل وفوائد سے لطف اندوز ہوتی رہے اور دنیا کے بازاروں، منڈیوں اور نوآبادیوں پر اسی کا قبضہ قائم رہے، صدیوں سے یہی کشمکش قائم ہے اور اسی منصب کے حصول کے لیے دو عالمی جنگیں لڑی جاچکی ہیں اور لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاچکا ہے۔

---

(1) Man - The Unknown. By Alexis Carrel, PP.17-18
(ترجمانی: حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۳۲۳)

حرف آخر

کاش کوئی ان روشن خیالوں، عقل پرستوں اور تہذیب جدید کے متوالوں کو باور کراتا کہ تم نے عقل وخرد کے سارے گھوڑے دوڑا لیے، نفس پرستی اور پوپ پرستی سے لے کر انکار خدا تک ہر ہر مرحلہ کو آزما لیا، تم نے مذہب کی حمایت اور اس کی مخالفت میں لاکھوں زندگیاں کو قربان کر دیں، ہر تحریک کے رد میں تم نے ایک نئی تحریک برپا کی اور ہر بار اپنا امن وسکون غارتک کیا، مگر تمہاری ہر کوشش اور ہر تحریک نے سلگتے ہوئے داغوں کے سوا کچھ نہ دیا، سکون قلب کی تلاش میں تم جنگلوں میں جا بسے اور عیش وطرب کی محفلوں میں بھی خوب اچھلے کودے، تم نے چاند ستاروں پر کمندیں بھی ڈالیں اور سمندر کی تہوں کو بھی اتھل پتھل کر ڈالا، تم نے پرندوں کی طرح آسمان میں اڑ کر بھی دیکھا اور جانوروں کی طرح کھیتوں میں چر کر بھی آزمایا، لیکن ہر تجربہ نے تمہاری بے چینی میں صرف اضافہ ہی کیا ہے، اگر واقعی تمہیں سچے سکون اور حقیقی راحت کی تلاش وجستجو ہے تو ایک بار اس ''نسخۂ کیمیا'' کو بھی آزما کر دیکھو جو آج سے چودہ سو سال پہلے ''فاران'' کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہونے والے ''فارقلیط'' (ﷺ) نے تمہیں دیا تھا، افراط وتفریط کے جس دلدل میں تم گرفتار ہو اس سے نجات کا راستہ عرب کے خشک زاروں کے سوا کہیں اور نہیں، تاریخی شہادتیں تمہارے پاس موجود ہیں کہ یہ نسخہ کبھی ناکام نہیں ہوا، زندگی کے بھٹکے ہوئے قافلوں نے ہمیشہ اپنی منزل کا نشان یہیں سے حاصل کیا ہے، اور تمہارے دل کے کسی نہ کسی گوشہ میں یہ حقیقت بھی پنہاں ہے کہ ضمیر کا سکون، روح کی مسرت اور دل کا قرار اسی نسخہ میں موجود ہے!

CamScanner

کتابیات

(Bibilography)

عربی حوالہ جات

۱- الاستشراق والمستشرقون للدکتور مصطفی السباعی (بیروت)

۲- الاستذکار لأبی عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر (بیروت)

۳- حجۃ اللہ البالغۃ للشیخ ولی اللہ الدھلویؒ (دیوبند)

۴- الغزو الفکري-التحدی والمواجھۃ للدکتور اسمعیل علی محمد (مصر)

۵- الموسوعۃ المیسرۃ في الادیان والمذاھب والاحزاب المعاصرۃ للدکتور مانع بن حماد الجھني (الریاض)

اردو حوالہ جات

۱- انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۸۱ء-لکھنؤ)

۲- اردو انسائیکلوپیڈیا از قومی کونسل برائے فروغ اردو (۱۹۹۷ء-دہلی)

۳- اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (۱۹۸۵ء-لاہور)

۴- انسانی تہذیب کے پانچ دور (مترجم) از ولیم میگ گاگی

۵- اسلام اور مستشرقین از ڈاکٹر حافظ محمد زبیر (۲۰۱۴ء-لاہور)

۶- اسلام اور مستشرقین از علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۹۸۵ء-اعظم گڑھ)

۷- اسلام، پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر از ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی (۲۰۰۵ء-لاہور)

۸- بائبل سے قرآن تک از مفتی محمد تقی عثمانی (۱۹۹۷ء-دیوبند)

۹- پردہ از مولانا مودودیؒ (۲۰۰۳ء-دہلی)

۱۰- تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۸۶ء-لکھنؤ)

۱۱- تاریخ اندلس از مولانا ریاست علی ندویؒ (۲۰۰۳ء-لاہور)

۱۲- تاریخ دعوت وعزیمت از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۲۰۱۰ء-لکھنؤ)

۱۳- ترغیبات جنسی از نیاز فتح پوری (۱۹۴۱ء-لاہور)

۱۴- تاریخ فسلفۂ سیاسیات از محمد مجیب (۱۹۹۹ء-قومی کونسل، دہلی)

CamScanner

۱۵-مکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (۲۰۰۲ء-لاہور)
۱۶-تاریخ اخلاق یورپ از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (لکھنؤ)
۱۷-تاریخ ارض مقدس از مولانا عبدالحلیم شرر (۱۹۲۵ء-لکھنؤ)
۱۸-تاریخ صحف سماوی از سید نواب علیؒ (۱۹۱۹ء-لکھنؤ)
۱۹-تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام (مترجم) از ڈاکٹر فواد سیزگین (۱۹۹۴ء-اسلام آباد)
۲۰-دنیا کے بڑے مذاہب از عماد الحسن فاروقی (۱۹۹۶ء-دہلی)
۲۱-عیسائیت کیا ہے؟ از مفتی محمد تقی عثمانی (۱۹۹۵ء-دیوبند)
۲۲-عیسائیت-تجزیہ و مطالعہ از پروفیسر ساجد میر (لاہور)
۲۳-فارقلیط اسمہ احمد (بجواب فارقلیط از پادری وکلف اے سنگھ) از حکیم عرفان ثاقب (لاہور)
۲۴-کتب خانۂ اسکندریہ از علامہ شبلی نعمانی (۱۸۹۳ء-لاہور)
۲۵-کتاب مقدس از انٹرنیشنل بائبل سوسائٹی (۲۰۰۵ء-امریکہ)
۲۶-قاموس الکتاب از ایف ایس خیر اللہ (۱۹۹۳ء-لاہور)
۲۷-معرکہ مذہب و سائنس (مترجم) مولانا ظفر علی خاںؒ (۲۰۰۴ء-لاہور)
۲۸-مولانا ابوالحسن علی ندویؒ-دعوت و فکر کے اہم پہلو از بلال عبدالحی حسنی ندوی (۱۳ء رائے بریلی)
۲۹-مختصر تاریخ تمدن (مترجم) از سید مبارز الدین رفعت (۱۹۶۶ء-دہلی)
۳۰-مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۲۰۰۰ء-لکھنؤ)
۳۱-مسیحیت-علمی و تاریخی حقائق کی روشنی میں (مترجم) از متولی یوسف چلپی (۱۹۷۶ء-لکھنؤ)
۳۲-مکالمہ بین المذاہب از مولانا ولی خاں المظفر (۲۰۰۷ء-کراچی)
۳۳-یہودیت، عیسائیت اور اسلام از شیخ احمد دیداتؒ (۲۰۱۰ء-لاہور)
۳۴-تاریخ ایران از حسن پیرنیا (بزبان فارسی) (۱۳۸۹ھ-تہران)

انگریزی حوالہ جات

1. A Brief History Of Time By Stephen Hawking, (2001)
2. A Criminal History Of Mankind By Colin Wilson (London, 1984)
3. A Critical Introduction Of The New Testament By R. H. Fuller (Longwood, 1979)
4. A Historical Sketch Of Sacerdotal Celibacy In The Christan Church By Henry C. Lea (Philadelphia, 1867)
5. A History Of Europe By Henry Pirenne (Translated By Bernard Miall) (New York, 1955)
6. A History Of The Christian Church By Williston Walker (New York, 1921)

CamScanner

7. A History Of The Church By Henry K. Wickersham (Moundsville, Usa, 1900)
8. A History Of The Corruptions Of Christianity By John Priestley (London, 1871)
9. A History Of The Freedom Of Thought By J. B. Bury London)
10. A History Of The Inquisition Of The Middle Ages By Henry Charles Lea (New York, 1958)
11. A History Of The Warfare Of Science With Theology In Christendom By Andrew Dickson White (Cornell University, 1896)
12. A History Of Western Art By Laurie Schneider Adams
13. A Rationalist Encyclopedia By Joseph McCabe (London, 1948)
14. A Short History Of Freethought - Ancient And Modern By John M. Robertson (New York, 1906)
15. A Short History Of Our Religion By D. C. Somerwell (London, 1923)
16. A Short History Of Russia By Mary Platt Parmele (2104)
17. A Short History Of The Catholic Church By Hermann Wedewer & Joseph Mesorley (London, 1918)
18. A Study Of History By Arnold J. Toynbee (London, 1949)
19. Abul Qasim Al-Zahrawi (The Renaissance And The Scientific Legacy Of Islam) By A. R. Momin
20. After Nine Hundred Years By Yves Congar O. P. (New York, 1959)
21. American Peoples Encyclopaedia (1955)
22. An Account Of Inquisition At Goa By M. Dellon (Pittsburg, 1819)
23. An Historian's Approach To Religio By Arnold Toynbee (Oxford, 1956)
24. An Introduction To The Gospels By Mitchell G. Reddish (Abingdon Press, 1997)
25. An Introduction To The New Testament By D. A. Carson, Douglas J. Moo & Leon Morris (Michigan)
26. Ancient Alexandria By Carole Escoffey (Dar El-Kuttub, Egypt, 2012)
27. Arches Quarterly Magazine (Vol.4, Edition:8, Year: 2011) (The Cordoba Foundation, London)
28. Between Rome And Jerusalem: 300 Years Of Roman- Judaean Relations By Martin Sicker (2001)
29. Blood And Faith - The Purging Of Muslim Spain By Mathew Carr (Hurst

CamScanner

Publisher, 2017)
30. Built Upon The Rock: A Study Of The Doctrine Of The Church By W. Gary Crampton, Th.D.(Texas, 2000)
31. Byzantium - An Introduction To East Roman Civilization By Norman N. H.Baynes (Baynes Press 2007)
32. Cambridge History Of Judaism By Finkelstein(2017)
33. Cambridge Modern History By A.W.Ward (U.K, 1979)
34. Chamber's Encyclopaedia (Philadelphia, 1871)
35. Change And Habit - The Challenge Of Our Time By Arnold J. Toynbee (Oxford, 1966)
36. Christianity And History By Adolf Harnak (2010)
37. Christianity On Trial By Collin Champan (Tyndale H. 1975)
38. Civilization In The West By Crane Brinton (1973)
39. Collier's New Encyclopedia (New York, 1921)
40. Dictionary Of Church Terms By Fr. Tadros Yacoub Malaty (Egypt, 1992)
41. Economic & Social History Of Middle Ages By J. W. Thompson (Prentic-Hall, 1973)
42. Encyclopaedia Of Britannica (London, 1823)
43. Encyclopaedia Of Religion And Ethics By James Hastings (New York, 1908)
44. Encyclopaedia Of The Historical Jesus By Craig A. Evan (New Yark, 2008)
45. Europe's Tragedy: A Thirty Years War By Peter H. Wilson (Penguin, 2009)
46. Fields Of Blood By Karen Armstrong (Toronto, 2014)
47. From Text To Tradition: A History Of Second Temple & Rabbinic Judaism By Lawrence H. Schiffman (1991)
48. Great Religions By Which Men Live By Floyed H.Ross And Tynette Hills (1986)
49. Historians' History Of The World By Henry Smith Williams (New York: 1909)
50. History Of Conflict Between Religion And Science By John William Draper (New York, 1875)
51. History Of European Morals By William Edward Hartpole Lecky, M.A. (New York: 1895)
52. History Of European Political Philosophy By D.R. Bhandari (Bangalore, 1959)
53. History Of Latin Christianity By Henry Hart Milman (New York, 1908)
54. History Of Philosophy By Alfred Weber (London, 1896)

CamScanner

55. History Of Sacerdotal Celibracy In The Christian Church By Henry C. Lea (London, 1907)
56. History Of The Arabs By Phillips K. Hitti (Macmilliam, 1989)
57. History Of The Bible By Bratton(B. Hill Press, 1959)
58. History Of The Philosophy By William Turner (Gin& Company, 1903)
59. Holy Warriors - A Modern History Of The Crusades By Jonathan Phillips (Internet Edition)
60. I Am Not A Christian By Bertrand Russell (1957)
61. Inspiration And Interpretation By J. W. Burgan (2015)
62. Institutes Of The Christian Religion By John Calvin (Translated By John Allen) (Philadelphia, 1909)
63. Introduction To The New Testament By Louis Berkhof (Eerdmans, 1915)
64. Islam And Christian Theology By J. W. Sweetman (Aligarh, 1942)
65. Islam And The West By Philip K. Hitti (Van Nostrand, 1962)
66. Islam At The Cross Roads By Mohammad Asad (Dar Al-Andalus, Gibraltar)
67. Jesus In His Times By Daniel Rops (London, 1945)
68. Jesus Or Paul? By Dr. Arnold Meyer (London, 1909)
69. Life In The Middle Ages By G. G. Coulton (2012)
70. Life Of Jesus By Dainel Rops (2011)
71. Man, The Unknown By Alexis Carrel (1939)
72. Paganism And Christianity By J. A. Farrer (London, 1891)
73. Papal Bull Dum Diversas (Online)
74. Philosophy Of Our Times By C. E. M. Joad (London, 1941)
75. Politics And Philosophy By Mikko Lahtinen (Boston,2009)
76. Popery - Its Character And Its Crimes By William Elfe Tayler (London, 1851)
77. Raymond Lull - The Illuminated Doctor By W. T. A. Barbar (London, 1903)
78. Raymund Lull - First Missionary To The Moslems By Sameul M. Zwemer (Funk & Wagnalls Company, 1902)
79. Rome And Carthage - The Punic Wars By R. Bosworth Smith (New York, 1889)
80. Rome And The Popes By Dr. Karl Brandes (Translated By Rev. W. J. Wiseman) (New York, 1868)
81. Saladin And The Fall Of The Kingdom Of Jeruselum By Stanley Lane Poole (New York, 1898)

CamScanner

82. Short History Of The Christian Church By C. P. S. Clarke (Longman, 1949)
83. Short History Of The World By H. G. Wells (Pelican, 1937)
84. Spanish Islam: A History Of Moslems In Spain By Reinhart Dozy (Translated By Francis Griffin Strokes) (London, 1913)
85. Syria: A Short History By Philip K. Hitti (Macmillian, New York, 1959)
86. Table Talk By Martin Luther (Translated By William Hazlitt) (Philadelphia, 2003)
87. The Age Of Faith By Amory H. Bradford (Cambridge: 1900)
88. The Arabs And The Mediaeval Europe By Norman Daniel (London 1979)
89. The Barbarian Invasions Of Italy By Pasquale Villari (Translated By Linda Villari) (London: 1901)
90. The Bible Unearthed By Israel Finkelstein
91. The Byzantine Empire By C. W. C. Oman (New York, 1892)
92. The Catholic Encyclopedia (New York, 1910)
93. The Century Of Revolution By Christopher Hill (New York, 1966)
94. The Church Of Satan By Michael A. Aquino (San Fransisco, 2002)
95. The City Of God (The Works Of Aurilius Augustine) (Translated By Rev. Marcus Dods) (Edinburgh,1871)
96. The Code Of Canon Law 1983
97. The Concise History Of Crusades By Thomas F. Madden (Maryland, 2014)
98. The Crusades: The War For The Holy Land By Thomas Asbridge (London, 2012)
99. The Decisive Battles Of The Western World And Their Influence Upon History By J. F. C. Fuller (London, 1954)
100. The Empires Of The Old World To The Fall Of Rome By M. Bramston (London, 1911)
101. The First Advance (Church History) By John Foster (1977)
102. The Four Gospels By Burnett Hillman Streeter (Macmillian, London, 1930)
103. The Golden Bough: A Study Of Magic And Religion By Sir James George Frazer (Temple Of Earth Publishing, 1922)
104. The Greek And Eastern Churches By Walter F. Adeney (New York, 1908)
105. The History Of Jews By Henry Hart Milman (London, 1866)
106. The History Of The Crusades By Steven Runciman (Cambridge, 1954)
107. The History Of The Decline And Fall Of The Roman Empire By Edward

CamScanner

Gibbon (London: 1820)
108. The History Of The Inquisition Of Spain By Henry Charles Lea (New York, 1906)
109. The History Of The Jews By Paul Johnson (New York, 1987)
110. The History Of The Papacy By M. Creighton (London, 1882)
111. The History Of The Popes By Dr. Ludwig Pastor (London, 1900)
112. The History Of The Reign Of Ferdinand And Isabella, The Catholic By William H. Prescott (Boston, 1856)
113. The History Of Western Philosophy By Bertrand Russell (New York, 1945)
114. The Holy Roman Empire By James Bryce (Macmillian, 1915)
115. The Inquisition By E. Vacandard (Longmans, 1908)
116. The International Standard Bible Encyclopaedia (Chicago, 1915)
117. The Journal Of His First Voyage To America By Christopher Columbus (London)
118. The Koran By George Sale (London, 1877)
119. The Lamad New Testament By Rev'd Andrew R. Hardy (Internet Edition)
120. The Legacy Of Islam By Sir Thomas Arnold & Alfred Guillaume (Oxford, 1931)
121. The Making Of Humanity By Robert Briffault (London, 1998)
122. The Middle Ages By Robert R. Strayer & Lana Charleton Munro (New York, 1942)
123. The Moors In Spain By Stanley Lane Poole (London, 8th Edition)
124. The Moriscoss : A Lesson From History By Mathew Carr (Arches Quarterly London, 2011)
125. The New Catholic Dictionary (New York, 1929)
126. The Oxford Dictionary Of The Christian Church By F. L. Cross (Oxford, 1961)
127. The Popes And Their Church By Joseph Mccabe (London, 1947)
128. The Prince By Niccolò Machiavelli (Translated By Peter Bondanella) (Oxford, 2005)
129. The Shorter Cambridge - Medieval History By C.W. Previte Orton (New York)
130. The Social Record Of Christianity By Joseph Mccabe (London, 1937)
131. The Spanish Inquisition - A Historical Revision By Henry Kamen (London, 1965)
132. The Story Of Civilization By Will Durant (New York, 1942)

CamScanner

133. The Truth: A Companion To The Bible By Charles A. Guiteau (Boston, 1879)
134. The Uses Of The Past: The Profiles Of Societies By Herbert J. Muller (Oxford, New York, 1953)
135. Theological Dictionary By Charles Buck(Philadelphia, 1807)
136. Treatise On Right And Wrong By H.L. Mencken (London, 1934)
137. Treatise On Right Or Wrong By H.L Mencken (1977)
138. 138.Webster's New Collegiate Dictionary (London, 1949)
139. Western Views Of Islam In Medieval And Modern Europe By David R. Blanks & Michael Frassetto (New York, 1999)
140. What History Tells Us? By Mubarak Ali Lahore,2012)

CamScanner